حیدرآباد ادبی کانفرنس نمبر



دفتر: فنکار، لکڑ کوٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

حیدرآباد ادبی کانفرنس نمبر

تعمیری اور فلاحی ادب کا نقیب

ماہنامہ

فن کار حیدرآباد

دسمبر ۱۹۸۵ء، جنوری تا فروری ۱۹۸۶ء

جلد ۳، ۴ ، شمارہ (۱۲، ۱، ۲)

مجلس ادارت اعزازی

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر احمد سجاد

مدیر

مسعود جاوید ہاشمی

مجلس مشاورت

ابوالمجاہد زاہد
عزیز بگھروی
ابوالفہیم وحید
عرشی نعمانی

رابطہ

۱۔ دفتر فنکار، لکڑ کوٹ، حیدرآباد
۲۔ ڈاکٹر احمد سجاد، طارق منزل
بریاتو ہاؤزنگ کالونی
رانچی ۔ بہار

فی شمارہ ۲-۵۰ دو روپے پچاس پیسے
سالانہ ۲۵ پچیس روپے
معاونین سے ۱۰۰ سو روپے
دیگر ممالک سے ۸۰ اسی روپے

اس شمارے کی قیمت ۔ ۳/۵۰ پیسے

مسعود جاوید ہاشمی نے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر فنکار لکڑ کوٹ حیدرآباد سے شائع کیا

نقوش حیدرآباد ادبی کانفرنس

نقشِ اوّل

ڈاکٹر احمد سجاد

سرزمین دکن ہندوستان میں سیاسی اور تاریخی حیثیت کے علاوہ ادبی و تحریری اعتبار سے بھی خاص اہمیت کی حامل رہی ہے۔ یہاں حیدرآباد ادبی کانفرنس میں ریاست آندھرا پردیش کے گوشے گوشے سے ادباء شعرا اور مقررین و ناقدین شریک ہوئے اور ادب اسلامی سے اپنے تعلق کا ثبوت پیش کیا۔

اس ادبی کانفرنس میں جو تخلیقات پیش کی گئیں ان میں مقررین و ناقدین نے خاص طور پر دو باتوں کی طرف اشارے کئے۔ ایک تو یہ کہ اس وقت ادب کا اصل مسئلہ کیا ہے دوسرے یہ کہ اس کا حل کیا ہے میں اس کے علاوہ چند اہم نکات کی طرف مختصر اشارے کرنا چاہتا ہوں۔

ہر تہذیب کی اپنی کچھ قدریں ہوتی ہیں جن کا پاس و لحاظ بڑا ضروری ہوتا ہے۔ ان کو اپنائے بغیر کوئی اعلیٰ ادب پیش نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کا کوئی ادب ایسا نہیں ہے جس نے تہذیبی قدروں سے صرف نظر کر کے کوئی مقام حاصل کیا ہو۔

اسی طرح ادب کے سلسلہ میں تین بنیادی باتوں کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ ہر ادب کے حاملین کو انہیں پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ پہلی چیز ہے موضوع کی اہمیت۔ موضوع انسانیت ہو۔ انسانیت کی فلاح و کامرانی اور اس کے لئے راہ عمل اور لائحہ عمل ہو۔ انسانیت کو موجودہ سطح سے اونچا اٹھانے والا جتنا عظیم موضوع ہوگا اتنا ہی عظیم ادب پیش کیا جا سکے گا دوسری چیز ہے ہیئت کی عمدہ ترکیب۔ انداز میں ندرت اور اچھوتا پن۔ دلوں کو چھو لینے والا طریق۔ متاثر کن پیشکش۔ آپ چاہے اونچے سے اونچا موضوع منتخب کر لیں۔ اگر عمدہ ترکیب سے پیش نہ کریں تو کوئی تاثر قائم نہ ہوگا۔

تیسری چیز اسلوب اور ابلاغ کا حسین انداز ہے۔ حسین اور جمالیاتی انداز۔ دلکش اور دل نشین پیرایۂ اظہار۔ روزمرہ محاورے اور استعارہ و تشبیہ خوبصورت الفاظ اس طرح کہ وہ قابل

توجہ بن جائے ۔

قدرت نے انسان میں حسن خیر اور صداقت کی حس رکھدی ہے ۔ یہ وہ بنیادی اوصاف ہیں جن کی قدر کرنے پر انسان مجبور ہے ہزار انحراف کے باوجود انسان میں ان اوصاف کی طرف ایک فطری لپک موجود ہے۔ کوئی شخص چاہے کتنا ہی بگڑا ہوا ہو اگر اس کے سامنے حسن خیر اور صداقت کو بہ انداز جمال پیش جائے تو وہ اس سے ضرور متاثر ہوگا

اس وقت اسلامی اور تعمیری ادب کے فنکاروں کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ ادب کو ادب کی شرطوں کے ساتھ کس طرح پیش کرتے ہیں ۔

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ دنیا کو مختلف ازموں نے کڑوے کسیلے پھلوں کے سوا کچھ نہیں دیا ہے بلکہ اسے تباہی کے غار کے کنارے لا کھڑا کیا ہے یہ بات آج خود مغربی مفکرین اور دانشور تسلیم کر رہے ہیں ۔ انہیں آج لاینحل مسائل کے حل کی تلاش ہے ۔ انہوں نے ہر طرف نظریں دوڑا کر دیکھ لیا ہے دور دور تک مایوسی کے اندھیرے کے سوا انہیں کچھ نظر نہیں آرہا ہے ۔ اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ انسانیت کے سارے مسائل کا حل صرف اور صرف آپ کے پاس موجود ہے ۔ یہ حل قیامت تک کے لیے آخری حل ہے بلکہ نسخۂ کیمیا ہے اور اب اس حل کے لئے دنیا کی نظریں آپ کی طرف اٹھ رہی ہیں ۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس حل کو دنیا کے سامنے کس عمدہ طریقے سے پیش کیا جائے ۔ اکثر تعمیری و اسلامی ادب کے علمبردار اس حل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ مگر اسے پیش کرتے ہوئے بھول پن اختیار کرتے ہیں ۔ اس بہترین حل کے ہوتے ہوئے مسئلہ نہ ہمارا حل ہو رہا ہے نہ دنیا کا۔ سوال یہ ہے کہ آخر پانی مرکہاں رہا ہے ؟

میں چاہتا ہوں کہ آپ اس طرف توجہ کریں ۔ اس وقت تعمیری فکر کے حاملین سے عالمی پیمانے پر جا بجا چوک ہو رہی ہے ایک یہ کہ جس فکر کے وہ حامل ہیں اسے انہوں نے اپنے قلب و روح میں پوری طرح اتارا نہیں ہے ۔

مجھے اس وقت نکلسن کا وہ مقالہ یاد آرہا ہے کہ " منافق آدمی کبھی مکمل تمثالی نہیں پیش کرسکتا " یعنی ایک بڑا ادبی کارنامہ ایک بڑا ادبی شہکار منافق آدمی تخلیق

نہیں کر سکتا۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو اپنے نقطہ نظر پر مکمل ایمان رکھتا ہو۔ اور پھر اسے اپنے قلب و روح میں اپنی عملی زندگی میں اتار چکا ہو۔ پھر اسے الفاظ کا بہترین جامہ پہنا کر صفحۂ قرطاس پر لے آئے۔ پھر اس کا فن پارہ بہترین ادب اور آفاقی قدروں کا حامل ادب ہو سکتا ہے۔

علمی و فکری کارنامے یقیناً اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن اگر آپ اسے تخلیقی سطح پر حسین بنا کر پیش کر کے روحوں میں پیوست کر سکیں تو اس کی دوہری حیثیت ہو جاتی ہے۔ ایک احساس جمال کی وجہ سے اس کے اندر ایک فطری کشش پیدا ہو جاتی ہے دوسرے یہ کہ آپ کے پاس دنیا کا بہترین موضوع ہے۔ موضوع کی عظمت سے گویا سونے پر سہاگے کا کام ہو جاتا ہے۔ دراصل آپ جس حسن خیر اور صداقت کے علمبردار ہیں اس کو پرکشش بنانے کا اصل وسیلہ اس وقت ادب ہے، تخلیق ہے، آرٹ اور فن کا ہے، اگر آپ سے اختیار نہیں کرتے تو آپ کی کوششیں مکمل طور پر بار آور نہیں ہو سکیں۔

آپ کے بہت سارے مسئلوں میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جب ہم ادب کے بارے میں سوچتے ہیں تو لگے بندھے انداز میں سوچتے ہیں۔ تحقیقی مقالات اور کتابوں کی بھر مار ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ ان تین امور کی طرف توجہ کریں۔ جو اوپر بیان کی گئی ہے۔

موجودہ نظریات نے انسان کو جانور بلکہ نامیہ، اور خلیہ بنا دیا ہے۔ ڈارون نے تو انسان کو صرف جانور بنایا تھا۔ مگر آج سماج کو ایک organism اور فرد کو ایک خلیہ بتایا جاتا ہے۔ اور اس کو ایک خالص مادی وجود ثابت کیا جا رہا ہے۔ یہ اس دور کا سب سے بڑا بگاڑ ہے یہ سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس سے طرح طرح کے ازموں کا فساد پیدا ہوا ہے لاشعوریت اساطیریت اور وجودیت، اور مختلف قسم کی باتوں سے خلاء پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ آپ کے ہاں جو تعمیری نقطہ نظر ہے اس کے مطابق اِنّی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ انسان کو خدا نے اپنا خلیفہ بنایا اور زمین و آسمان اور پوری کائنات کو آپ کے لئے مسخر کیا۔

اور آپ کو احسن تقویم امت وسطا بنا دیا ۔ ایک طرف یہ اعزاز و اکرام ہے اور دوسری طرف وہ پستیاں ہیں جن میں انسان کو پہنچا دیا گیا ہے ۔ جس کی طرف ابھی اشارے کئے گئے ۔ اس صورت حال نے مغربی مفکرین، ادیب و ناقدین کو بیابان مرگ میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا ہے ۔ یہیں سے جو بے مقصدیت بے سمتی اور بے چہرگی اور خرافات گوئی شروع ہوئی ہے وہ آپ کے سامنے ہے ۔ اس پر محض تنقید کرنے اور طنز کرنے سے کام نہیں چل سکتا ۔ تعمیری ادب کے معماروں کا فریضہ ہے کہ بنیادی باتوں اور تقاضوں کو سامنے رکھیں اور اعلیٰ ادبی شاہکار پیش کرنے کی کوشش کریں ۔

اب تک اردو ادب میں جو مختلف تجربے کئے گئے ہیں اس میں جو سب سے مستحکم روایت ہے وہ تعمیری ادب ہی کی ہے ۔ آپ کو ولیؔ دکنی سے لے کر آج حفیظ میرٹھی اور کلیم عاجز تک وہی نقطہ نظر وہی اسلامی فکر نظر آئے گی ۔ اس کے برعکس جو نقطہ نظر ہے اس کا بہ مشکل ۵ پانچ فیصد سرمایہ ہوگا بشمول ترقی پسند ادب آپ دیکھ رہے ہیں اس نے اردو ادب کو کیا دیا اور اسلامی ادب نے کیا دیا ۔

اقبال کو لے لیجئے اس کا پورا فن اس کی پوری تخلیق اس کا پورا کلام آپکے سامنے ہے ۔ اس پورے عرصے میں کوئی پچاس سال گذر گئے اقبال کا کوئی بدل ہمیں نہیں مل سکا ۔ یہ لمحہ فکریہ بھی ہے ۔ لیکن یہ لمحہ اطمینان بھی ہے کیونکہ اقبال جیسا عظیم شاعر اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ کوئی شخص اپنے تہذیبی زمین میں کھڑا ہوا ہو اور اپنے قدم کو مضبوطی سے جمائے ہوئے ہو ۔ اس کے مقابلے میں بیچارے فیض احمد فیض ایک مخصوص بلندی تک جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کے شہپر کتر دیئے جاتے ہیں اور وہ بیچارے شل ہو کر رہ جاتے ہیں اور اوپر جا نہیں پاتے کیونکہ پیٹ کے بل پر بکواس کرنے کی صلاحیت ایک حد تک ہوتی ہے اس سے آگے نہیں ہوتی ۔ فیض ہمارا بھی بڑا محبوب شاعر ہے لیکن اس کے المیہ پر افسوس ہوتا ہے اس کے اندر جو جوہر پوشیدہ تھا وہ اقبال سے آگے نہیں جا سکا بلکہ اقبال سے اس کا موازنہ کرنا اقبال کی توہین ہوگی ۔

اقبال کا اصل کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے تہذیبی سچائیوں پر اپنی فکر پر اپنے تہذیبی رجحان پر اقدار اپنی شاندار روایات پر اپنے فکر و فن کی بنیاد رکھی اس کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں

کو Spirit of the age کو بھی اپنے سامنے رکھا اور اقبال سپیکا کو اپنے قلب و جگر میں سموکر اور اس کی کیمیائی تحلیل کر کے اور الفاظ کا جامہ پہنا کر آپ کے سامنے رکھا اور اتنے حسین انداز میں رکھا کہ نصف صدی سے زائد عرصے میں بھی اقبال ثانی ہمارے سامنے نہ آسکا۔ ٹھیک ہے نئے زمانے میں نئے انداز کا اقبال پیدا ہوگا لیکن وہ پیدا ہو تو۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ایک خلا ہے۔ یہ خلا اسی وقت پر ہو سکتا ہے جب اقبال کی طرح پہلے فکر و فن کو صحیح سمت دکھا جائے صحیح رخ دیا جائے۔ اس کے بغیر ہمارے مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتا۔

چلتے چلتے اقبال کی وہ بات یاد دلادیں جو ادب کی روح ہے کہ۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

عرشی نعمانی

غزل

کبھی آہ و فغاں کرتے کبھی ضبط فغاں کرتے
گزاری عمر ہم نے داستان غم بیاں کرتے

ہمیشہ سامنا دشواری منزل سے ہوتا تھا
تمہارا سامنا ہوتا تو حال دل بیاں کرتے

بہت روکا مگر آخر نکل ہی پڑے گئے آنسو
تمہیں ہم روبرو پاکر بھی ضبط غم کہاں کرتے

تمہارے ہی ستم سے جب نہ پائی ہم نے کچھ فرصت
بھلا کیا شکوۂ جور و جفائے آسماں کرتے

عبادت میں بھی ہے محو جمال حور جب زاہد
نہ جانے کیا گنہ ہوتا جو ہم ذکر بتاں کرتے

محسن انصاری

رسوائے زمانہ تصانیف

اس عنوان کے تحت میں کچھ لکھ کر خود رسوا نہیں ہونا چاہتا ۔ نہ مجھے یہ غلط فہمی پھیلانی ہے کہ میں فحش کتابوں سے خاص انس رکھتا ہوں تو ان سطور کے لکھنے کا یہ مقصد ہے کہ میں ناظرین کو ان کتابوں کے مطالعے کا شوق دلاؤں۔ بُری کتابیں اچھی کتابوں سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہیں مگر ان کی شہرت کچھ بھی دیرپا نہیں ہوتی ۔ رسوائے زمانہ ہونا انہیں بری کتابوں کو نصیب ہوتا ہے جنکے اندر ادبی اسلوب کی خوبی اور سچائی کا کوئی ناقابل انکار پہلو ہو ۔ وہ کتابیں جیسی ہیں ۔ جس چیز کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو اس کو کوئی خریدار دوکانوں پر پوچھتا نہیں پھرتا اور چیزیں سر راہ پڑی رہتی ہیں ان کو کوئی بیچنے کیلئے سجا کر اپنی دوکان میں نہیں رکھتا ادبی دنیا میں بہت سی ایسی تصانیف پائی جاتی ہیں جنکا کوئی درجہ نہیں مگر وسیع المطالعہ حضرات اور ماہر ادباء وشعراء ان سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ ان کے حوالے نہیں دیئے جاتے مگر بوقت ضرورت ان کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے ۔ علم بہت طریقوں سے حاصل ہوتا ہے ۔ حصول علم کی تلاش میں آدمی ملک ملک پھرتا ہے ۔ کتنے استادوں کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتا ہے ۔ کتابیں ڈھونڈتا ہے ۔ بہت سی ایسی باتیں سنتا ہے جو ذوق پر گراں گذرتی ہیں بہت سی ایسی کتابیں پڑھتا ہے جنکو ہاتھ لگانا گناہ ہوتا ہے ۔ تحصیل علم کے یہ مراحل ہیں جو ایک طالب علم ذوق شوق سے طے کرتا ہے ۔ دراصل جاننے اور نہ جاننے میں بڑا فرق ہے ۔ بھلا جاننا بھی اچھا ہے اور برا جاننا بھی اچھا ۔ جب تک کوئی برائی کو نہ جانے گا برائی سے بچنا بھی مشکل ہوگا ۔ برائی کے بہت سے روپ ہیں ۔ جن لوگوں کا کام اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ دوسروں تک حقائق پہنچانا اور ان کے جذبات و خیالات کو متاثر کرنا ہوتا ہے ان کیلئے اشد ضروری ہے کہ وہ برائی کے بہت سے روپ سے واقف ہوں ۔ زباندانی کی تکمیل کیلئے رطب و یابس کے تمام دفتر کو کھنگالنا پڑتا ہے ۔ بہت سے الفاظ کے متعلقات' انداز بیان اور معانی کی باریکیاں مبتذل اشعار سے معلوم ہوتی ہیں ۔ فحش کتابوں کی کہیں تعلیم نہیں دی جاتی ۔ ذکی الطبع لوگوں کی بات

نہیں ۔ اچھے لوگوں کو ان سے واقفیت یا لاعلمی میں ہو جاتی ہے یا محبت عزیز میں کبھی تعارف ہو جاتا ہے طالب حق کا یہ کمال ہے کہ وہ شر میں خیر ڈھونڈ نکالتا ہے۔ دنیا میں اجالا بھی ہے اندھیرا بھی' خوشبو بھی ہے بدبو بھی ۔ اندھیرے کی افادیت یہ ہے کہ آدمی گمراہی میں اپنی صلاحیتوں کو برباد نہ کرے ۔ اجالا ڈھونڈے اور سیدھے راستے پر چلے ۔ اندھیرا پسند کرنا پراگندگی حواس کی نشانی ہے ۔ بدبو اس لئے ہے کہ آدمی سڑی گلی اور نجس چیزوں سے دور رہے ۔ خوشبو میں انبساط روح ہے اور بدبو میں انقباض روح ۔ خوشبو کو پھیلانا پسندیدہ عمل ہے اور بدبو کا تدارک ضروری۔

کہتے ہیں علامہ اقبال کے پاس اسلامیہ کالج لاہور کے کچھ طلباء یہ شکایت لیکر پہنچے کہ ان کے نصاب میں عربی اشعار مبتذل اور مخرب اخلاق تھے۔ طلباء چاہتے تھے کہ علامہ اپنے اثر سے کام لے کر ان کو نصاب سے خارج کرا دیں۔ علامہ نے ان کی تمام گفتگو غور سے سننے کے بعد کہا کہ وہ اشعار عرب جاہلی دور کے اعلیٰ شعراء کے تھے ۔ اگر اس میں گالیاں تھیں تو طلباء کو اس کا بھی علم ہونا چاہیے کہ اس وقت شرفائے عرب کس طرح گالی دیا کرتے تھے۔ طلباء لاجواب ہو کر چلے گئے۔ دراصل یہ علم کا سوال ہے۔ یہ علم جہلاء کیلئے نہیں علماء کیلئے ہے ۔ برا علم جہلاء کی حالت کے مطابق ہوتا ہے اور علماء اس سے موعظت و حکمت سیکھتے ہیں ۔ اردو شاعری کا سرمایہ نثر سے زیادہ اور قدیم ہے۔ چونکہ شاعری زیادہ تر غزل پر مشتمل تھی اس لیے اس میں عشقیہ مضامین بیان کرتے وقت افراط ہو ہی جاتی ۔ تقلیداً اور روش عام سے گریز ظاہر کرنے کیلئے خمریہ شاعری کا رواج تھا ۔ جس میں شراب اور اس کے متعلقات کی مدح کی جاتی اور اپنی رندی پر فخر کیا جاتا ۔ حقیقت شعراء اور عوام بخوبی جانتے تھے ۔ اس لئے مخالفت یا نامقبولیت کا خوف نہیں تھا۔ اور جھوٹ بولنا روا تھا ۔ حالانکہ اخلاقی لحاظ سے یہ چیز قومی سیرت کو تباہ کرنے والی تھی ۔ سچ یہ ہے کہ وہ دور انحطاط و زوال ہی تھا۔ شعراء ہی میں ایک شاعر چرکین کا نام آتا ہے جس کا کسی تذکرہ میں ذکر نہیں ملتا۔ اردو اپنے پرانے مرکز دہلی اور لکھنؤ سے بہت ہٹ گئی ہے مگر وہ عالمی زبانوں میں اپنا مقام بنانے کی کوشش کر رہی ہے - اچھے زباندان جانتے ہونگے ورنہ دوسروں کو بتانا پڑے گا کہ چرکینا کسے کہتے ہیں اور وہ چرکین کیوں تھے ۔ ان کے اشعار

بول دیرانے سے بھرے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں روایت سے بغاوت کی یہ کون سی شکل تھی جبکی تجلی انہیں منظور ہوئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے ان کے کلام کو زیور طبع سے آراستہ کیا یا نہیں یا اس کا علم سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے۔

آدمی کی عجب حالت ہے۔ وہ کبھی مطمئن نہیں رہتا۔ اچھی باتوں سے بھی گھبرا جاتا ہے۔ سنجیدگی بھی اس پر شاق گذرنے لگتی ہے۔ ایسی حالت میں اعتدال اختیار کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ایسے موقعہ پر ضبط نفس کی تلقین کی جاتی ہے۔ میر۔ غالب۔ ذوق۔ مومن اور مصحفی کا دور گذر چکا تھا۔ جس طرح ظالم انسان نے عیاشی کے غیر فطری طریقے ایجاد کئے شاعری میں ریختی کا رواج ہوا۔ ریختہ (اردو کا پرانا نام) میں مرد کی طرف سے اظہار عشق ہوتا تھا اور ریختی میں عورت کی طرف سے۔ عورت کی طرف سے اظہار عشق ہندی شاعری کی خصوصیت ہے۔ شاعری میں یہ اظہار عورت کی جانب سے ہو یا مرد کی جانب سے یہ کسی قوم کی تہذیب اور معاشرت پر منحصر ہے۔ مگر ریختی صرف [illegible] ایک غیر فطری خواہش کا اظہار تھی۔ یہ شاعری عورتوں کی زبان میں تھی اور ان کے زیورات ملبوسات اور تمام متعلقات کے ذکر سے آراستہ و پیراستہ۔ رہا لطف کلام تو وہ لطف لینے ہی کیلئے وضع ہوئی تھی۔ کوئی ریختی کے شاعر دوپٹہ اوڑھ کر اپنا کلام سناتے تھے۔ غیر فطری بات زیادہ دنوں نہیں چلتی۔ ذوق سلیم آخر ابتذال و فحش پر غالب آتا ہے۔ ریختی کے دو چار اشعار سے اس کی خصوصیات کا اندازہ لگائیے۔

عشق کیا ہے یہ میسو اجانیں ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں
لو اگو ہر یہ کیا خدا کے لئے جان دے دو گی آشنا کے لئے
ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہار دو
مجھ سے موتی کھو گیا گوہر کا جو کل تھا جھوٹا آج سچا ہو گیا

اس صنف میں رنگین اور جان صاحب بہت مشہور ہوئے۔ یہ حضرات صاحب دیوان ہیں۔ کوئی شاعرہ اس صنف میں نظر نہیں آتی۔

جس طرح ریختی کا چرچا ہوا واسوخت کا بھی ایک زمانہ تھا۔ واسوخت اس صنف شاعری کا نام ہے

جس میں عاشق اپنے اگلے معشوق کو جلانے کیلئے دوسرے معشوق پر مائل ہوتا ہے۔ جیسے مومن کہتے ہیں :

دل اور سے اب لگائیں گے ہم ــــــ جو تجھ کا شمع تجھے جلائیں گے ہم

ایسی شاعری بے اعتدالی اور بے حیائی کے ماحول ہی میں پروان چڑھ سکتی ہے۔ لکھنؤ کے ماحول میں اس کا رواج بڑھا۔ واسوخت سے شہرت رکھنے والے شاعر سرفہرست امانت لکھنوی ہیں۔ کسی وقت ان کے واسوخت کی دھوم تھی۔ اس میں سب سے زیادہ زور سراپا پر دیا جاتا ہے۔ بال سے لے کر بدن کے ہر حصّہ کی تعریف کی جاتی ہے۔ اسی میں شاعری کا سارا زور صرف کیا جاتا ہے۔ امانت نے یہ کام بڑی عرق ریزی سے کیا ہے۔ اس کی واسوخت میں زبان کا لطف، ضلع جگت۔ صنائع و بدائع کا کمال کا اہتمام ہے اور وہ سب ایک فحش مقصد کی خدمت کرتے ہوئے۔ امانت کا "اعلیٰ فن" ظاہر کرنے والے اشعار نقل کرنے سے قاصر ہوں صرف ایک ادنیٰ مصرعہ جس کے خیاط کو چڑیا کا بنایا اس نے (چڑیا کا ایک ہلکی گالی ہے۔ چڑیا سلائی کی ایک اصطلاح بھی ہے)

مثنوی پر گوپی چند نارنگ کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ مثنوی میں بھی شعراء بہت کھیل کھیلے ہیں۔ مومن جیسے بار صنخ شاعر نے اپنی ایک مثنوی میں ایسے مبتذل اشعار شامل کئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہ حیرت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ معاشرتی زندگی میں پردہ داری کا کتنا لحاظ کرتے تھے۔ جہاں لکھنؤ میں امانت تھے مرزا شوق بھی تھے۔ انہوں نے کئی مثنویاں لکھی ہیں مگر مشہور اپنی مثنوی "زہرِ عشق" سے ہیں۔ مثنوی زہرِ عشق ایک زوال پذیر تہذیب کے نوجوان کی داستانِ معاشقہ ہے۔ کبھی یہ چند ورقوں کی کتاب بازار میں عام طور پر بکتی تھی۔ وہ لڑکوں کی نظر سے چھپائی جاتی تھی۔ اس مثنوی کے پلاٹ، ہیرو اور ہیروئن کے کیریکٹر، زبان اور دیگر خصوصیات پر کچھ ناقدین نے باقاعدہ بحث کی ہے۔ اس کی زبان بہت صاف اور شستہ ہے۔ اس کا ایک حصہ جس میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے بہت عمدہ ہے۔ اگر اسکو سیاق سے علیحدہ کرکے درسی کتاب میں بھی شامل کردیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے اکثر اشعار سہل ممتنع کی تعریف میں آتے ہیں۔ مثلاً

یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں ــــــ پان کل کیلئے بناتے جائیں

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں ــــــ بھیجتے ہیں تجھے بنارس میں۔

مثنویوں کے تعلق سے دو مثنویوں کی یاد اور آتی ہے ۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم ۔ انہیں دونوں مثنویوں کے لئے معرکۂ شرر و چکبست برپا ہوا ۔ یہ مثنویاں رسوائے زمانہ تو نہیں مشہور زمانہ ہیں ۔ مجھے ان کی یاد اس وقت کیوں آتی ہے ۔ حالی کی ایک بات کی وجہ سے حالی کے زمانے میں نیچرل شاعری کا بڑا چرچا تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزی ادبیات سے اردو خواں آشنا ہو رہے تھے ۔ اور انہیں دامانِ غزل کی تنگی کا احساس ہو رہا تھا ۔ نظموں کو رواج دینے کی مخلصانہ کوشش ہو رہی تھی ۔ مثنوی سحر البیان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ اس میں ایک مسلسل داستان بڑے فنی اہتمام کے ساتھ بیان کی گئی ہے ۔ اس میں ارباب نشاط کی بھی رونمائی کی گئی ہے ۔ میر حسن نے داستان کے ہر جزو کو بڑی فنکاری سے بیان کیا ہے ۔ مگر جہاں ایک طوائف کی چال ڈھال کا نقشہ کھینچا ہے اس کے چند اشعار دیکھئے ۔

عجب چال سے وہ چلی نازنیں — کہ مستی میں پاؤں کہیں کا کہیں
وہ پشواز اگری وہ نرگس کے ہار — وہ کمخواب کے بند رومی ازار
وہ خلقت کی گرمی وہ ڈھن بنا — نشے میں بھبوکا سا چہرہ بنا
چلی واں سے دامن بچاتی ہوئی — کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

حالی کہتے ہیں اگر یہی نیچرل شاعری ہے کہ سہ چلی واں سے دامن بچاتی ہوئی ۔ کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی تو اچھا ہوا کہ ہمارے شاعروں نے نیچرل شاعری نہیں کی ۔ حالی سے پہلے شاید میر نے سحر البیان کے متعلق کہا تھا کہ (میر حسن نے) مثنوی لکھی ہے کہ سانڈے کا تیل بیچا ہے ۔ ان دونوں حضرات کو انقلاب زمانہ کی کیا خبر تھی ۔

رہی گلزار نسیم تو وہ اس ضمن میں ان چند اشعار کی وجہ سے یاد آتی ہے جہاں تبدیلی جنس ہوئی ہے ۔ جہاں عورت مرد بن گئی ہے ۔ نسیم کا قلم یوں کاشف اسرار ہوا ہے سہ تھالی میں وہاں اگا تھا جو تیر دوسری جگہ جہاں مرد عورت بن جاتا ہے ۔ فوارہ گم خزانہ باقی ۔ دیکھئے اپنے مفہوم کو کتنی پردہ داری کے ساتھ ادا کیا ہے ۔ آج موجودہ انگریزی زبان کی کتابوں اور کہانیوں میں عورت اور مرد کے اعضائے تناسل کا نام باقاعدہ لیا جاتا ہے ۔ اردو اور دوسری ملکی زبانوں میں ترقی اور تجدد کی جو رو چلی ہے معلوم

نہیں کب ہم کو اس مرحلے سے دوچار کرے ۔

جوش ملیح آبادی جو شاعر انقلاب کی حیثیت سے مشہور ہیں اچھے نثر نگار بھی تھے ۔ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی برات" کے نام سے لکھی ہے ۔ یادوں کی برات نثر کے لحاظ سے خوب ہے مگر مواد کے لحاظ سے اکثر فحش ۔ اپنی زندگی کے وہ واقعات جو شرمناک اور ناقابل ذکر تھے انہیں کھول کھول کر بیان کیا ہے جس سے کتاب بہ حیثیت مجموعی ایک فحش کتاب بن کر رہ گئی ہے لطف یہ ہے کہ دیباچے میں انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے جس اخلاقی جرأت سے کام لیا ہے ابھی لوگ اس کی داد نہیں دے سکیں گے ۔ اس لئے کہ ابھی قوم میں اخلاقی جرأت کی کمی ہے ۔ پڑھنے والے کو اگر کوئی عبرت حاصل ہو سکتی ہے تو یہ کہ خدا کسی کو ایسی زندگی نہ دے اور ایسے انجام سے بچائے ۔

نیاز فتحپوری نے ایک کتاب "غیر فطری شہوانیت" کے نام سے لکھی مگر نفس مضمون کی رکاکت پر انہوں نے اپنے قلم کی فحاشی کا اضافہ نہیں کیا ۔ ایک بار لائبریری میں کتاب ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک ایسی کتاب نظر سے گذری جس نے ششدر کر دیا ۔ انگریزی کے مصنفین بھی عجب ذوق تحقیق رکھتے ہیں اس مصنف نے صرف یہ کام کیا تھا کہ عورت اور مرد کے اعضائے تناسل کے کتنے نام ہیں ۔ تقریباً دو سو نام شمار کرائے ہیں ۔ اس کے علاوہ ان الفاظ سے بننے والے محاورے ، تراکیب سخن اور لطائف ۔ میں نے پڑھا تھا کہ عرب دور جاہلیت میں شراب کے سیکڑوں نام تھے اور گھوڑوں کے مگر یہ ؟ اس مصنف نے لکھا ہے کہ بڑی محنت شاقہ اور لاتعداد کتابوں کے مطالعہ کے بعد اس نے اس کا یہ کام انجام کو پہنچایا

بعض وقت کسی فحش کتاب کی شہرت سات سمندر پار کر کے پہنچتی ہے ۔ ایسی ایک کتاب ڈی ایچ لارنس کا ناول " لیڈی چیٹرلیز لور " ہے لارنس بیک وقت اعلیٰ شاعر اور ماہر ناول نویس دونوں تھا ۔ اس کی شخصیت اور فن پر درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ وہ انگریزی ادب کی متنازعہ فیہ شخصیت ہے ۔ اس نے جنسی جذبات اور عمل کو کھول کر بیان کیا ہے مگر اعلیٰ زبان و اسلوب کے ساتھ ۔ اسی بنا پر اس کے حامی ناقدین کا کہنا ہے کہ اس نے فحش کو فحش ہونے سے بچا لیا ہے ۔ اس کان کن مزدور کے بیٹے نے جو کچھ روز مدرس بھی رہا عہد وکٹوریہ کے جھوٹے اخلاق کی قلعی کھولی اور دولتمند رؤسا پر مبنی معاشرہ سے انتقام لیا ۔ " لیڈی چیٹرلیز لور " میں اس نے یہی کیا ہے ۔ یہ کتاب برسوں انگلستان میں ممنوع رہی ۔ ہندوستان میں اب بھی ممنوع ہے ۔

اور وقت گذرتا رہا

رپورتاژ
مسعود جاوید ہاشمی

وقت ایک سیل رواں ہے جو ہمیشہ سفر کرتا رہتا ہے۔ اسے کہیں ٹھہراؤ نہیں۔ کبھی اچھا وقت آتا ہے وہ بھی گذر جاتا ہے۔ اور کبھی برا وقت آتا ہے سو وہ بھی گزر جاتا ہے لیکن ایک جوئے نغمہ خواں کی طرح کبھی تیز رو اور کبھی آہستہ خرامی کے ساتھ کبھی پہاڑی علاقے سے گذر ہوا تو تیزی و تندی آگئی اور کبھی میدانی علاقے راہ میں آئے تو رفتار میں کمی محسوس ہونے لگی۔ کبھی خوشی کے دن آئے تو برس اور مہینے پلک جھپکتے میں غائب اور کبھی تکلیف اور مصیبت کا احساس ہوا تو لمحہ لمحہ صدی بن گیا۔ مگر وقت تو گزرتا ہی رہا۔ البتہ وقت کو پر کیف بنانے یا بے کیف بنانے میں کچھ ہمارا اپنا بھی ہاتھ رہا۔ روزمرہ کے کاموں میں بھی وقت گذر جاتا ہے مگر ایک بے کیفی سی رہتی ہے۔ کوئی اہم کام کوئی مہم کوئی بڑا کارنامہ انجام پاتا ہے تو کیف و انبساط کا عالم ہی اور ہوتا ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار کا ذکر دراصل وقت کی سرگزشت ہے تعلیمی ترقی، تہذیب و تمدن کا عروج و زوال ادب و شعر کی رنگینیاں بھی وقت کی رہگذر کے سنگ میل ہیں۔ ہماری تہذیب اور ادب میں بھی بڑے پیچ و خم آئے۔ کبھی یہ قافلہ وادی سندھ میں آکر ٹھہرا کبھی گنگا و جمنا کے میدانوں میں کبھی برہمپترا کے کنارے اور کبھی گوداوری اور کرشنا کے دامن میں۔ اور کبھی موسیٰ کی آغوش میں محمد بن قاسم خلجی اور لودھی خاندان مغلیہ دور انگریزوں کی آمد دور آصفی ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی فورٹ ولیم کالج سر سید تحریک، دلّی اور لکھنو کے دبستان ترقی پسند تحریک، جدیدیت کی تحریک، ادب اسلامی کی تحریک یہ سب وقت کے بحر بیکراں میں مدو جزر کے نقوش ہیں جو دلوں پر ثبت ہیں۔

ادارہ ادب اسلامی کے زیر اہتمام ۵، ۶ جنوری ۱۹۵۷ء کو شہر لکھنو میں آل انڈیا ادبی کانفرنس کا اہتمام ایک سنگ میل کی حیثیت کا حامل ہے۔ کیونکہ نئی نسلیں لکھنو، معیار میرٹھ، افق

اور دانش رامپور نے ادب میں اسلامی افکار اور روحانی اقدار کی پیشکش فکری عظمتوں اور فنی رفعتوں کے ساتھ جاری رکھیں اور یہ قافلہ خودشناسی اور خداشناسی کی مشعلیں لئے گمان و تشکیک، مادیت و بے حیائی کے اندھیروں سے لڑتا رہا

وقت کے سمندر میں مدوجزر آتے ہیں تو راہوں میں پیچ و خم بھی آتے ہیں ۔ وادی و کوہ سے بھی گذرنا ہوتا ہے ۔ قافلوں کی رفتار راہ کی مشکلوں اور آسانیوں میں تیز اور سست بھی ہوتی رہتی ہے ۔ کبھی لکھنؤ میں ادبی پروگرام ہوا ۔ کبھی علی گڑھ میں اجلاس رکھا گیا ۔ کبھی دلی میں، کبھی حیدرآباد میں ادبی اجلاس اور شعری نشستیں ہوئیں ۔ بھٹکل کرناٹک میں آل کرناٹک ادبی اجلاس اور مشاعرہ ہوا جس میں سید جمال احمد امین آبادی، عزیز بگھروی، حفیظ میرٹھی، تابش مہدی، سید انور علی اور مسعود جاوید ہاشمی شریک ہوئے ۔ اورنگ آباد میں مہاراشٹرا کی نمائندہ نشست رکھی گئی جس میں کیف نوگانوی، حفیظ میرٹھی، عزیز بگھروی اور مسعود جاوید ہاشمی بھی شریک رہے ۔ گیا ادبی کانفرنس ہوئی جس میں ڈاکٹر احمد سجاد طیب عثمانی عبدالمغنی شبنم سبحانی، حفیظ میرٹھی، شاہ رشاد عثمانی اور دیگر احباب نے نثری اور شعری تخلیقات پیش کیں ۔ پھر حیدرآباد کی گنجان آبادی والے علاقے میں رود موسیٰ کے قریب لمحری گلشن میں وقت کی رفتار متغیر ہوئی ۔

ریاست آندھرا پردیش کی سطح پر کانفرنس کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں مصطفیٰ نیاز ناظم اور قمر رضا نائب ناظم بنائے گئے جناب منظور الحسن ہاشمی کی رہنمائی میں مشورے اور منصوبے تیار ہوئے ۔ یوسف خان نے مقام اور فرش کی ذمہ داری لی ۔ ابوالفاروق شعور اور عبدالقدیر عزم فراہمی وسائل میں لگ گئے ۔ طباعتی کام مسعود جاوید ہاشمی کے حوالے کیا گیا ۔ طعام کے انتظام کی ذمہ داری شہزاد نامر نے اپنے سر لی ۔ خطوط لکھے گئے ۔ آندھرا پردیش کے مختلف اضلاع سے وفود کی آمد کی اطلاعات ملنے لگیں ۔ ڈاکٹر احمد سجاد اور حفیظ میرٹھی صاحب سے شرکت کی استدعا کی گئی ۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی آمد کے پروگرام سے مطلع کیا ۔ شہر کے ممتاز ادبا و شعرا کو مدعو کیا گیا ۔ ریکارڈنگ کی ذمہ داری محمد علی خان اور احمد بن عوض کے سپرد کی گئی ۔ اجلاس کی تاریخ ۹ رنومبر مقرر ہوئی دعوت ناموں کی اشاعت اور تقسیم عمل میں آئی ۔ محبوب علی منصور اور وحید الحسن ہاشمی نے سرگرمی سے حصہ لیا ۔ رفتہ رفتہ شہر کے علمی

حلقوں میں بات پہنچ گئی۔ لیکن اس کے باوجود اقبال اکیڈمی نے اسی دن یوم اقبال منا ڈالے کیا شہر کے بے شمار ادبی انجمنوں سے تعلق رکھنے والے ادباء و شعراء نے شرکت سے اتفاق کیا۔
جناب محمود انصاری مدیر روزنامہ منصف نے اس اجلاس کی صدارت قبول کی۔ اخبارات میں خبریں چھپتے دیکھتے ہی دیکھتے ۹ نومبر آن پہونچی۔ رات ہی سے اضلاع سے ادباء و شعراء کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ جوگی پیٹ سے خفی حیدری اور لطیف آرزو سدا سیو پیٹ سے ابو متین کریم نگر سے ڈاکٹر بشیر احمد ورنگل سے نادر اسلوبی، ڈاکٹر صبیح الزماں محبوب نگر سے قمر الزماں ادیب عبدالرحمٰن جامی کرنول سے یوسف جمیل جامی طاہر گلشن آبادی کاغذ نگر مسعود جعفری شکر نگر سے سید ریاض تنہا گنتکل سے ابوالفہیم وحید اور نیلور سے ناز نیلوری آ چکے تھے۔
انور بے دل، یعقوب سروش، فضل اللہ قریشی اور تمکین آفاقی دعوت نامے جانے کے باوجود نہ آسکے۔ ۹ر نومبر کی صبح ڈاکٹر احمد سجاد صدر ادارہ ادب اسلامی ہند کلکتہ تشریف لے گئے۔
محمدی گلشن میں ساڑھے دس بجے صبح تلاوت کلام پاک سے ادبی کانفرنس کا آغاز ہوا۔
محمود انصاری مدیر روزنامہ منصف مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوئے۔ عبدالقدیر عزم نے مائیک سنبھالا اور جناب مصطفیٰ نیاز کو خطبۂ استقبالیہ پڑھنے کی دعوت دی۔
مصطفیٰ نیاز نے ریاست کے گوشے گوشے سے آنے والے ادباء و شعراء صدر ادارہ ادب اسلامی ہند اور محمود انصاری صاحب کا خیرمقدم کرتے ہوئے ادب میں صالح اقدار کی بازیافت کی اہمیت پر زور دیا۔ اور فرمایا کہ عظمت انسانیت کا شرف اسلامی نظریات سے منسلک ہے
عبدالقدیر عزم نے "ادب کے مسائل" کے زیر عنوان ایک مقالہ پیش کیا۔ مذہب اور سیاست کی جدائی کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ دین و سیاست کو جدا کرنے کی سازش نے مذہب کو احتساب کائنات کے منصب سے ہٹا کر الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات کی پرستش میں لگا دیا۔ اور ابلیس نے امت مسلمہ کو مزاج خانقہی سے روشناس کر کے ذکر و فکر صبحگاہی میں مست کر دیا اور اس کا شعور تصوف "قطرے کے دریا میں فنا ہونے" اور اسی طرح کی دوسری لایعنی بحثوں میں محدود ہو گیا۔ آپ نے ادب اسلامی کے جادہ پیماؤں کو خانقہی ادب سے پیچھا چھڑانے اور انسانی مسائل سے بحث کرنے کی دعوت دی۔ نظم و ترتیب کے ساتھ ذرائع ابلاغ کے موثر استعمال پر زور دیا

ابوالفہیم وحید نے اپنے مقالے "تہذیبی بحران اور ادب" میں ہندوستانی سماج کو کئی تہذیبی اکائیوں میں بٹا ہوا اور اپنی شناخت کی کشمکش میں مصروف سماج قرار دیا۔ پچھلے دو تین دہائیوں میں اردو کے ادیبوں اور شعراء نے اپنے تہذیبی حدود کو پھلانگ کر مانگے ہوئے تہذیبی اقدار پر تخلیق ادب کی جو کوشش کی ہے اس کو غیر فطری قرار دیتے ہوئے آپ نے "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" کی صدائے بازگشت لگائی۔

رحمت یوسف زئی نے تحقیق تنقید اور تخلیق کے رشتوں کو واضح کرکے ہر ایک کی اپنی جگہ اہمیت پر زور دیا۔

انور سہیل نے افسانوی دور کا افتتاح اپنے افسانہ "محروم تسلی" سے کیا اور سکون کے متلاشی ڈیوڈ جونز کے کردار کے پردے میں دور حاضر میں دولت کی فراوانی اور سکون قلب کی کمیابی کا ذکر حسین و جمیل پیرائے میں پیش کیا۔

سید عبدالباسط انور نے افسانہ "تھمی ہوئی چیخ" میں موجودہ معاشرہ کی لایعنی روایات اور ان سے فرار کی کوشش میں ہونے والے نقصان کا تجزیہ افسانوی پیکر میں پیش فرمایا۔

سید منظور الحسن ہاشمی صاحب نے "آخری افسانہ" میں "منفرد انسانوں کے درد کا مداوا کہاں ہے" اس بات کی منفرد انداز میں توضیح فرمائی۔

محمد علی خاں خاکی نے "آنکھیں" کس طرح اور کہاں کہاں اور کیسے کیسے شعرا و ادباء کے استعمال میں آئی ہیں اس کا خوبصورت تذکرہ شعروں کی مدد سے پیش کیا۔

ابو متین نے "انسان اور گرگٹ" میں مماثلت اور عدم مماثلت کے مسئلہ پر ڈارون کے "بندر اور انسان" کے نظریہ کا رشتے کے انداز میں نہیں بلکہ خالص اپنے ذاتی طنزیہ طرز میں گفتگو فرمائی۔

پروفیسر محمد سجاد حسین رضوی نے ادارہ ادب اسلامی کے اخلاقی اقدار کے ساتھ ابھرنے کو ایک تیسری دنیا کی تلاش کے مماثل قرار دیا۔ آپ نے تحقیق اور تنقید کے بغیر ادب کو لا حاصل ٹھہرایا۔ آپ نے فرمایا کہ ہر کوشش بار آور اس وقت ہوتی ہے جب مسلسل کی جاتی ہے اور نتیجہ تاریخ کے ہاتھ رہتا ہے۔

ڈاکٹر احمد سجاد کل ہند صدر ادارہ ادب اسلامی نے فکر کی عظمت پیش کرنے کے حسین انداز اور فنی ریاضت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ایک منافق آدمی مکمل تمثیل نہیں پیش کر سکتا عظیم ترین اسلامی فکر کو پختہ ایمان و یقین کے ذریعہ ادیب اپنے اندر سموئے۔ اس پر عمل پیرا ہو۔ پھر اس کے ذاتی تجربات پیچیدہ کیمیائی تحلیل کے بعد ادب کا روپ دھاریں۔ انداز کی خوبصورتی اور فن کی لطافت ساتھ ہو تو بہترین ادب تخلیق ہوتا ہے۔ اقبال کی لازوال اور آفاقی شاعری انہی اجزاء سے مرکب ہے اور اسلامی ادیبوں کو یہی طریق زیب دیتا ہے۔

آخر میں محمود الفاری نے اپنے صدارتی خطبہ میں اردو ادب ہی نہیں بلکہ گزشتہ چودہ سو برس کے دیگر بہت سی زبانوں کے ادب کو اسلامی ادب قرار دیا اور آج اسلامی ادب کے ابلاغ کے لئے پریس کو اہم ترین اور اپنے قابو کا ذریعہ قرار دیا۔

تین بجے دن جناب ابوالنصر عابر کی صدارت میں "ہمارے ادب کے آفاقی رشتے" کے زیر عنوان سمپوزیم منعقد ہوا۔ جس میں مسعود جاوید ہاشمی، منظور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر احمد سجاد اور جناب صدر نے حصہ لیا۔

رات نو بجے حضرت خواجہ شوق کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں شہر کے معروف شعرا کے علاوہ ریاست کے مختلف حصوں سے شریک ہونے والے مہمانوں نے اپنا کلام پیش کیا۔ رات بارہ بجے یہ رنگا رنگ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

ایک دن جیسے چند لمحوں میں گذر گیا اور وقت گزرتا رہا ـــــــ ؟!!

گوہر اسحاقی

درد اور غم جہاں میں ہیں ہم سے
ہم مرکب ہیں درد اور غم سے

دیکھئے یوں نہ چشم پرنم سے
کھیلئے یوں نہ نبض عالم سے

تم جو روٹھو تو کوئی بات کہاں ہے
کس کو جینا ہے اور ٹھو کر تم سے

خطبۂ استقبالیہ
ریاستی ادبی کانفرنس حیدرآباد

محترم حضرات!

یہ ریاستی ادبی کانفرنس' ادارۂ ادب اسلامی ہند' شاخ حیدرآباد کی جانب سے منعقد کی جارہی ہے ۔ اس موقع پر آپ حضرات کا خیر مقدم کرتے ہوئے میرے اس شہر خلوص کا ادبی ماحول بھی خوشی محسوس کرتا ہے ۔

مئے سے ' مینا سے ' نہ ساقی سے نہ پیمانے سے
دل بہلتا ہے مرا ' آپ کے آجانے سے

یہ کانفرنس محض ادبی و شعری عشق کی نمائش ہے نہ تشہیر نہ تفریح طبع ' بلکہ اس کی پشت پر ایک بلند 'صحت مند آفاقی مقصد کارفرما ہے ۔ اس کی اساس خدا پرستانہ ' اخلاقی اقدار پر مبنی تعمیری ادبی نقطۂ نظر پر ہے اس کانفرنس کا انعقاد اس شہر میں ہو رہا ہے ۔ جو شعر و ادب کی دنیا میں نہ محتاج تعارف ہے نہ غیر مانوس ۔

ہر شعور پختہ کار کی پیاسی نگاہیں اس دیار محبت و شفقت ' گہوارۂ امن و عافیت پر ہمیشہ پڑتی رہیں اور اس کی خوبیوں سے سیراب ہوتی رہتی ہیں ۔ زمانے نے کروٹ لی ۔ زندگی کی رفتار حیرت انگیز تیزی سے بڑھنے لگی ۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جتنی تبدیلیاں پچھلے برسوں میں وقوع پزیر ہوئی ہیں ۔ ماضی میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ۔ ان تبدیلیوں کو اپنے دامن میں سموتے ہوئے شعر و ادب کے دائرے بجائے پھیلنے کے سمٹتے اور بری طرح ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے نظر آتے ہیں مختصر یہ کہ ایک عجیب انتشار اور بے یقینی کی کیفیت ہر طرف نظر آتی ہے ہر شخص دوسرے سے یہ کہتا نظر آتا ہے ۔ سہ

سنے گا کون میری چاک دامانی کے افسانے   یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

زندگی سے امن و سکون اس طرح رخصت ہو گیا ہے ۔ جیسے کہ اس کا کبھی وجود ہی نہ

رہا ہو ۔ شعر و ادب کے نام پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے ۔ وہ اسی گم کردہ راہی کی عکاسی ہے نہ سمت ہے نہ تعین منزل ۔ شعر و ادب کی کیفیت واقعتاً ایک بے مایہ تنکے کی ہے جو بے راہ روی کے سیلاب کی زد پر آ گیا ہو ۔ ایسے ناخوشگوار حالات کے درمیان، ہمارے ملک میں امید کی وہ خوشگوار فضائے زیست بھی موجود ہے جس کو ایک طرف اردو نثر کی اعلیٰ روایات، سر سید حالی، شبلی، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، رشید احمد صدیقی، عابد حسین، ابوالاعلیٰ مودودی ابوالحسن علی ندوی، نعیم صدیقی اور اسود گیلانی جیسے مشاہیر ادب سے ملی ہیں، دوسری طرف اردو شاعری میں یہ فضا غالب سے اقبال تک اور آگے ماہر القادری، عامر عثمانی، احسان دانش ورکش صدیقی، حفیظ میرٹھی، کلیم عاجز کے بلند پایہ کلام سے سینکڑوں دلوں کو گرماتے ہوئے اور ذہنوں کو مسحور کیے ہوئے ملتی ہے ۔ ان اعلیٰ اقدار و روایات سے مالا مال اردو ادب کا یہ عظیم ورثہ، دیکھنے والی نگاہوں کیلئے، سننے والی سماعتوں کے لئے، سمجھنے والے دماغوں کے لئے نہ صرف اس اخلاقی دور تاریک میں مشعل راہ ہے، بلکہ اس انتشار و گمراہی کے سیلاب عظیم کے درمیان مضبوط چٹان کی طرح موجود ہے ۔ اس پر جس نے اپنا ٹھکانہ بنایا وہ محفوظ و مامون رہا اور چھوڑ گیا وہ بہہ گیا ۔

حاضرین محترم

اب یہ سوچنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے کہ سیلاب میں تنکوں کی طرح بہنے والے اور اپنے انجام سے بے خبر بہنے والے ہمارے تعلق سے کیا کہتے ہیں اور کیا نہیں ۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سماج کے چلن کو اس سمت پر ڈال دینے کی کوشش کریں ۔ جس کو خالق کائنات نے بنی نوع انسان کیلئے مقرر فرمایا ہے ۔

سوچنا یہ ہے کہ ہم کس طرح اس سمت مقدس کی نشاندہی کریں ۔ کن الفاظ و معنی سے کام لیں ۔ کس آواز سے پکاریں، کس نغمۂ دلکش سے محظوظ کریں ۔ کن اسالیب کو اپنائیں تاکہ یہ بے یقینی کا ماحول یقین میں بدل جائے ۔ بے چینی دور ہو اور سکون نصیب ہو جائے ۔ کرب و انتشار خوشی اور مسرت سے بدل جائے ۔

حاضرین محترم ! سمت مقرر ہے، نشان راہ موجود ہے، ہمیں بس چل پڑنا ہے پیغام

موجود ہے جس کی ابلاغ وترسیل کا کام ہمارے ذمہ ہے ۔ فکر موجود ہے جسے فن کے سانچے میں ڈھالنا ڈھالنا ہے اور اپنی روح کی پکار بنانا ہے ۔ آج ہمارے شاعر و ادیب حضرات آندھرا پردیش کے گوشے گوشے سے ایک عزم صمیم کے ساتھ یہاں آئے ہیں کہ ان گفتہ بہ حالات میں شعر و ادب کو صحیح سمت و رفتار بخشیں اور صالح اقدار سے روشناس کرائیں ۔

ان سب کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں ۔ انشاء اللہ یہ ادبی قافلہ ادارۂ ادب اسلامی کے پرچم تلے خدا پرستی، انسان دوستی حق کی سربلندی کی آفاقی قدروں کو انسانیت کے سامنے پیش کرنے کی راہ پر گامزن رہے گا ۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آفاقیت اور ادبی نظریات کی تشکیل اسلامی اقدار کے سوا ہو ہی نہیں سکتی ۔ انسانیت کی عظمت کا شرف اسلامی اقدار و روایات سے جڑا ہوا ہے ۔ جس کو ہر حقیقت آشنا تسلیم کرنے پر مجبور ہے ۔

آج کی اس کانفرنس میں اپنے ان احساسات کے ساتھ ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے ادبا، شعرا، ناقدین، دانشور، ان آفاقی قدروں کے ذریعہ جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے عصر حاضر کے نظریاتی خلاء اور قدروں کے بحران کو دور کرنے کی محنت مند کوشش کریں گے ۔

آج کی یہ کانفرنس اسی سمت میں ایک قدم ہے ۔

مصطفٰی نیاز

کنوینر ریاستی ادبی کانفرنس حیدرآباد

شجاع فاروقی

جاگ جائے اگر انساں کا شعور ۔ انقلاب ایک مکمل ہو جائے

نفرتیں آپ ہی مرجائیں گی — پیار کا سر یہ جو آنچل ہو جائے

ایک کنکر بھی بہت کافی ہے — ٹھہرے پانی میں بھی ہلچل ہو جائے

٭

ابوالفہیم وحید

تہذیبی بحران اور ادب

آدب انسانی جذبات، احساسات، اور خیالات کے ابلاغ کا ایک بڑا وسیلہ ہے۔ انسانی معاشرہ اپنے تجربات اور جذبات کی ترسیل کیلئے زمانہ دراز سے مصوری شاعری قصہ گوئی اور تمثیل کا سہارا لیتا آیا ہے۔ ادب ترسیل و ابلاغ کے ساتھ ساتھ تہذیب جذبات کا بھی وسیلہ رہا ہے۔ لیکن تہذیب و ترتیب کا یہ عمل ادب کا بنیادی کام نہیں ہے بلکہ اسے کسی نہ کسی مخصوص کلچر کی نمائندگی کرنی پڑتی ہے۔ ادب کسی ایک نظریہ اور اقدار کی ترجمانی کرتے ہوئے ہی اس نظریہ کے مطابق اپنے قاری پر اثر ڈالتا ہے ہر زمانہ اور ہر زبان کے ادب کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ادیب کسی نہ کسی تہذیب اور طرز فکر سے وابستگی کے بغیر غیر معمولی ادب کی تخلیق نہیں کر سکا۔ کوئی ایسا ادیب اور ادبی شاہکار ہمارے سامنے نہیں ہے جو کسی سماجی نظریہ کی توانائی کے بغیر وجود میں آیا ہو۔ دنیا بھر کی زبانوں میں تحریر کردہ کلاسیکی ادبی کتابیں جنکی آب صدیوں بعد بھی باقی ہے وہ سب کسی نہ کسی مذہبی روایات کے زیر اثر ہی لکھی گئی ہیں۔ غیر مذہبی اثرات پر مبنی کوئی کتاب بھی کلاسیکی کتب کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکی۔ اس لئے اس بحث میں وقت ضائع کرنے سے کوئی حاصل نہیں کہ ادب میں وابستگی ضروری ہے یا نہیں؛ البتہ یہ بات ضرور زیر بحث ہونی چاہیئے کہ یہ وابستگی اس نظریہ اور قدر سے ہو جو انسانی سماج کے لئے زیادہ قابل عمل اور بہتر ہو۔

> اردو جس کلچر کی نمائندگی کرتی ہے وہ اسلامی فکر کا حامل ہے یا اس میں وہ افکار شامل ہیں جو اسلامی فکر سے قریب تر ہیں۔

ہم اردو ادب سے لگاؤ رکھنے والے افراد کیلئے یہ سوال اس لئے بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہیکہ اردو ادب ایک ایسے سماج میں جی رہا ہے جو پچھلے ۲،۳ دہوں سے ایک زبردست تہذیبی بحران کا شکار ہے۔ ہندوستانی سماج جو کئی تہذیبی اکائیوں میں بٹا ہوا ہے اپنی شناخت کی کشمکش میں ہے

اور اسی مرحلہ پر ہر تہذیبی اکائی پورے سماج پر اپنے تہذیبی غلبہ کیلئے کوشاں ہے ۔ ہر تہذیبی اکائی کی پرانی قدریں شکست و ریخت کا شکار ہیں اور وہ نئے صنعتی ماحول میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش میں مصروف ہے ۔ ان اکائیوں کو انکے حال پر چھوڑتے ہوئے ہم اپنی گفتگو کا دائرہ صرف اردو ادب کی تہذیبی اکائی کی حد تک محدود رکھیں تو ہمارا نقشہ یہ ہے کہ اردو جس کلچر کی نمائندگی کرتی ہے بڑی حد تک اسلامی فکر کا حامل ہے جس میں کسی حد تک دوسری تہذیبوں کے وہ افکار بھی شامل ہو گئے ہیں جو اسلامی فکر سے قریب ہیں لیکن ہندوستان کی تہذیبی اکائیوں کے موجودہ ماحول میں اسلامی فکر پر مشتمل تہذیبی اکائی داخلی اور خارجی محرکات کی بنیاد پر ہندوستان میں اپنی شناخت اور بقا کے امکانات کے بارے میں مشکوک ہوتی جا رہی ہے اور نئے ہندوستان میں اس فکر کی عملی صورت گری انتشار کا شکار ہے ۔

اردو ادب جو اپنے ابتدا ہی سے اس فکر سے غذا حاصل کرتا آیا ہے پچھلے تین چار دہوں سے مختلف خارجی تحریکات کے زیر اثر اپنی تہذیبی وراثت سے وابستگی کھوتا رہا ہے اور پوری تاریخ ادب اردو کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس کا مشاہدہ ہوگا کہ جب جب ہماری وابستگی ہمارے تہذیبی سرچشمہ سے دور ہوتی گئی تب تب ہمارے ادب میں پھیکا پن اور توانائی میں کمی آتی گئی ہے ہمارے بہترین ادبی سرمایہ میں وہ کتابیں رہی ہیں جنکی تخلیق میں ہماری بنیادی تہذیبی فکر جذبہ بن کر شامل رہی ہیں ۔

وہ تہذیبی اکائی جو اردو بولتی ہے جب خود بدلے ہوئے سماجی ماحول میں اپنی شناخت کی حفاظت میں لگی ہوئی تھی اس مرحلہ پر ایک اہم بات یہ ہوئی کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں میں اپنے تہذیبی حدود کو پھلانگ کر مانگے ہوئے تہذیبی اقدار کی بنیاد پر تخلیق ادب کی خواہش بیدار ہوئی ۔ پھر مانگے ہوئے افکار سے ادبی تخلیقات میں مصنوعی توانائی پیدا کرنے کا یہ رجحان کسی ایک فکر تک محدود نہیں رہا ۔ بلکہ ہر ۱۰ ۔ ۵ سال کے بعد ایک چھوٹا سا گروہ اٹھتا اور پچھلے ادبی سرمایہ کو دریا برد کر کے نئے ادبی سرمایہ کی تخلیق کا دعویٰ کرتا رہا اپنی اپنی نئی فکر کو عین ادبی دیانت داری قرار دیتا ۔ ترقی پسندی سے جدیدیت اور جدیدیت سے عدم وابستگی کے نعرہ تک یا رہا یہی ہوتا رہا اور اب نوبت یہ ایں جا رسید کہ اردو کا "ادب" لکھنے کیلئے

لکھ رہا ہے اس کے پاس قاری کو کچھ دینے کیلئے لکھنے کا تصور باقی نہیں ہے۔

یہ ایک تفصیلی داستان ہے جسے کسی اور وقت کیلئے اٹھا رکھتے ہوئے صرف اتنی بات جان لیں کہ اردو بولنے والے طبقہ میں تہذیبی بحران پیدا کرنے میں جہاں دوسرے عوامل کارفرما رہے ہیں وہیں خود اردو کے ادیبوں میں ایک ادبی طبقہ ایسا نکل آیا جس نے اس بحران کو ہوا دی ہمارے لکھنے والوں میں جب ایسے لوگ کم ہوتے گئے جو اپنی وراثت کے سوتے سے توانائی حاصل کرتے تھے تو مانگے کے اجالے سے روشنی حاصل کرنے کی جستجو نے ادبی تخلیقات پر غلبہ حاصل کرلیا اس تمام عرصہ میں ہمارے ہاں الفاظ اور حروف کی کمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن زندہ رہ جانے والا ادب کم تر ہوتا گیا۔ تفصیل میں گئے بغیر آپ کے غور و بحث کیلئے یہ بات کافی ہے کہ پچھلے ۲۵، ۳۰ برسوں میں ہم نہ کوئی "مسدس" پیدا کرسکے اور نہ کوئی "سحر البیان"۔ آخر اسکی کیا وجہ ہے؟ جوش اقبال اور جگر تک کے سینکڑوں اشعار حتی کہ شبلی، حالی اور مولانا آزاد کے بیسیوں نثری جملے پڑھے لکھوں میں نہیں عوام تک میں ازبر ہیں لیکن ہمارے اطراف کے لکھنے والوں میں سے کتنوں ہی کے کئی کئی مجموعہ چھپ چکے ہیں اور "عصر حاضر کے" نئے لہجے اور عصری حسیات کے کتنے شعرا ہیں جن کے چند شعر بھی زبان زد عام ہوگئے ہوں؟ اسکی وجہ کیا ہے؟ ترسیل کا المیہ؟ نہیں۔ اسکی وجہ "بے فکری" کا المیہ ہے! جب فکر و خیال میں توانائی اور عملی زندگی سے ہم آہنگی نہ ہوگی تو تخلیق کردہ ادب دل و دماغ کو چھو لینے کی صلاحیت سے دور ہوگا اور ایسا ادب ظاہر ہے کہ یادداشت میں آسانی سے بار نہیں پا سکتا۔

بات وہ کہیے کہ سننے والا یہ سمجھے گویا کہ میرے دل میں ہے۔ یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب تخلیق کار کسی فکر و جذبہ کا حامل ہو اور وہ کسی تہذیبی عقیدہ پر جیا ہوا ہو۔

انتشاری اور بحرانی دور نے انتشاری اور بحرانی ادب ہی پیدا کیا۔ اسوقت اردو میں خاصا ادبی کام ہو رہا ہے۔ دھڑا دھڑ شعری مجموعے۔ افسانے ڈرامے تنقیدی مضامین بازار میں آ رہے ہیں۔ اردو میں ہر موضوع پر ادبی کتابوں کا ذخیرہ بڑھتا ہی جارہا ہے لیکن اس میں کیفیت، افادیت اور ارتقار کتنا ہے اور قاری کی ذہنی یا جذباتی غذا کا سامان کیا ہے؟

اس کا اگر کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کرے تو غالباً غالب فیصد مایوسی کی شکل میں ملے گا۔ دراصل اس کی وجہ وہی بنیادی کمزوری ہے۔ انتشار کو ہوا دینے والے ادیب ہی سرگرم عمل ہیں اور انکی تحریریں ذرائع ابلاغ کے ذریعہ پر شائع تو ہو ہی جاتی ہیں لیکن عملاً ذہنوں پر قبضہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔

اردو بولنے والی آبادی میں اس ادب کا زیادہ بار نہ پانا بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہیکہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔

بحرانی دور کے اس ماحول میں اردو کے ادیبوں کی یہ ذمہ داری ہیکہ وہ اس بات کو سمجھ لیں کہ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ اور پچھلے دو تین دہوں کے ادبی تجربات کو سامنے رکھکر اپنے تہذیبی ورثہ کی بازیافت کا شعوری فیصلہ کریں۔ اور ہماری تہذیب کے ان جاندار عناصر کو جنکی وجہ سے اردو حلقہ ایک عالم میں ممتاز ہے۔ اپنی ادبی تخلیقات میں اس طرح سموئے کہ ادبی تخلیقات میں توانائی پھر سے جاگ اٹھے وہ ادیب جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنی ٹوٹی ہوئی تہذیبی زنجیر کی کڑیوں کو دوبارہ ملانا ہے انہیں اس بات کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ پچھلے دو تین دہوں قبل تک کے ادبی شاہکار اس راہ میں ہمارے لئے بہترین نمونہ ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ اسی ۲ دہوں کے درمیان ادب میں بہت اچھے فنی تجربات ہوئے ہیں۔ ان فنی تجربات سے فائدہ اٹھائے بغیر کوئی اچھی ادبی تخلیق ممکن نہیں ہے۔ اپنے تہذیبی ورثہ سے ادب کو پیوستہ کرنے کیلئے ہم جو بھی کوشش کریں اس میں ادبی دیانت داری۔ فنی ریاض اور معلومات کی فراہمی کی مسلسل کوشش ترسیل کو زیادہ سے زیادہ بامعنی بنانے کی کوشش کا غیر معمولی دخل ہے جو فن کار ان سب امور کا بخوبی لحاظ کئے بغیر تخلیق کے میدان کی شہ سواری کرنا چاہتے ہیں وہ عموماً ادبی شہ کاروں کی تخلیق کے بجائے سپاٹ واعظ بن جاتے ہیں۔ ہمارے قدیم ادب میں واضح مقصدی شعور کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی فن کاری کے معیاری نمونوں کی کمی نہیں ہے ہم اگر ان نمونوں کو سامنے رکھکر اپنے تہذیبی ورثہ کو خود میں سموکر ادبی تخلیق کیلئے تیار ہوں تو ہم نہ صرف ادب میں تہذیبی ورثہ کی بازیافت میں کامیاب ہوں گے بلکہ شاید کسی نہ کسی حد تک اس تہذیبی بحران پر قابو پانے میں سماج کی مدد کریں گے جس کا اسوقت پورا ملک شکار ہے۔

کیا اسلامی ادیب اس چیلنج کو قبول کرنے کی خود میں ہمت پاتے ہیں۔ ؟ ▲▲

سید عبدالقدیر عزم حیدرآباد

ادب اسلامی کے مسائل

متمدن انسان کسی نہ کسی نظام حکومت کے تحت زندگی بسر کرتا ہے - جدید سیاسی تصورات کے تحت مملکت انسانوں کی ایک ایسی جماعت ہے جو کسی معین علاقے میں قانونی اغراض کی تکمیل کیلئے منظم ہو اور جس میں حاکم و محکوم کا عادتاً تعلق پایا جاتا ہو۔ مملکت اپنے منشاء کو موثر بنانے کیلئے اپنا دروبست جن افراد کے سپرد کرتی ہے وہ حکومت کہلاتے ہیں حکومتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں لیکن خارجی اثر یا اندرونی انتشار سے جب تک مملکت کی وحدت کو صدمہ نہ پہونچے مملکت قائم و برقرار رہتی ہے۔ جدید مملکت کی خصوصیات یہ ہیں (۱) مذہب و اخلاق سے بے تعلقی (۲) ہمہ گیری اور (۳) وطنیت کے تصور سے کسب تقویت

جدید مملکت کی ان تینوں خصوصیات میں سے میں صرف پہلی خصوصیت مذہب و اخلاق سے بے تعلقی کے بارے میں بات کروں گا کیونکہ اسی خصوصیت نے ادب کو متاثر کیا ہے اور مسائل پیدا کئے ہیں۔

> دین و سیاست کو جدا کرنے کی سازش نے مذہب کو احتساب کائنات کے منصب سے ہٹا کر الہیات کے ترشے ہوئے اصنام کی پرستش میں لگا دیا

میکالے نے سیاست کو مذہب سے جدا رکھنے کی تعلیم دی۔ میکالے کے پیش نظر سولھویں صدی عیسوی کی عیسائیت تھی۔ شہنشاہیت اور پاپائیت کی دائمی جنگ - کلیسائی اداروں کا اندرونی انتشار اور زبوں حالی کے مناظر تھے۔ ان حالات کے مدنظر میکیاولی نے مذہب و اخلاق کو افراد کی نجی شئے قرار دیا اور مملکت کو اس سے بالاتر رہنے کی مشورہ دیا - مملکت کا فرض اپنے بقاء و استحکام کیلئے قوت اقتدار کا حصول (ہر جائز و ناجائز ذریعے سے) قرار پایا

اس باطل پرست فلسفی نے سچ اور جھوٹ کو ایک صف میں کھڑا کر دیا۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد یوروپی دانشور ایسے امور دریافت کرنے لگے جو مملکت کو قوی اور اسکی جنگی قوت کو افزوں کرنے والے تھے چاہے ان کے استعمال سے اخلاق کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے۔ میکیاولی نے زمانہ پرستی کو اصول بنا دیا اور مملکت کو حق دے دیا کہ وہ اپنے استحکام کیلئے جو چاہے کرے اس لئے کہ اصل

چیز مقصد ہے نہ کہ ذریعہ ۔ میکیاولی نے بادشاہ کیلئے جن آزادیوں کا اعلان کیا ۔ بعد میں مطلق العنان حکمرانوں اور جمہوری حکومتوں کا طرۂ امتیاز بن گئیں ۔

یونان اور روم میں مذہب اور سیاست جدا جدا نہیں تھے ۔ مذہب اور سیاست کی دوئی عیسائیوں کے ہاتھوں قائم ہوئی ۔ جبکہ قیصر اور خدا (کلیسا) کے حقوق الگ الگ پورا کرنے کی دعوت دی گئی ۔ نشاۃ ثانیہ تک مملکت اور کلیسا کی جدائی کے باوجود یورپ میں عالمگیر سلطنت کا تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ۔ لیکن لوتھر کی اصلاح مذہبی تحریک نے قیصریت اور پاپائیت کے جوئے کو اتار پھینکا اور جدید مملکتوں نے جنم لیا ۔ شروع میں مطلق العنان حکمرانوں نے مملکت کے استحکام کے فرائض انجام دیئے ۔ بعد میں جمہوری اور پارلیمانی نظام حکومت کو فروغ حاصل ہوا ۔ مطلق العنان حکمرانوں کے حقوق ربانی کی جگہ جمہوریت کے معاہدۂ عمرانی کا چلن ہوگیا ۔ لیکن سیاست کو مذہب سے الگ رکھنے کا رجحان برقرار رہا بلکہ زیادہ طاقتور ہوتا گیا ۔ آج نوبت یہ آپہونچی ہے کہ مملکت اس امر کی مجاز ہے کہ افراد حکومت کے اشارۂ ابرو پر قتل وغارت کرتے اور مذہب و اخلاق کے سب ضابطوں کو توڑنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے ۔ بے بس انسانیت اپنی غمزدہ آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی ہے مگر لب بستہ ہے ۔ میکیاولی کے ہموطن ایک مشہور ماہر سیاست نے کہا ہے اگر ہم اپنی ذات کے لیئے وہ سب کچھ کریں جو اپنے ملک کے لئے کرتے تو ہم بہت ہی ذلیل اور بدمعاش خیال کئے جاتے۔

انسانی زندگی ایک وحدت ہے اسکو روح اور مادے میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ۔ اگر ایسا کیا جائے تو اسکی حقیقت مسخ ہوجائے گی ۔ سعی و عمل کی دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ انسان اجتماعی زندگی میں اخلاق سے بے نیاز رہے اور انفرادی زندگی میں ان پر عمل کرے ۔ سیاست میں اگر ظلم اور خودغرضی روا رکھی جائے تو اس تمدن کے سائے میں زندگی بسر کرنے والے افراد انفرادی زندگی میں بھی آپس میں بے مروتی اور خودغرضی روا رکھیں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تمدن کا ڈھانچہ عدم توازن کا شکار ہے

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی ! سماتی کہاں اس فقیری میں میری
حکومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سربلندی ہے یہ سربہ زیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کیلئے نامرادی دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

میکیاولی کی دین و سیاست کو جدا کرنے کی اس سازش نے مذہب کو الٰہیات کے تراشے ہوئے اصنام کی پرستش میں لگا دیا۔ اقبال نے اپنی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اسی چیز کو پیش فرمایا ہے۔ ابلیس اپنے مشیروں کو امت مسلمہ کو خوابیدہ رکھنے کا نسخہ بتاتا ہے۔

ابنِ مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

کیا مسلماں کیلئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

یہ تمام فتنے جو امت مسلمہ کو الجھانے کیلئے پیدا کئے گئے انہوں نے اپنا کام پوری طرح کیا اور جس طرح عالم اسلام انہیں مسائل تک محدود ہو کر رہ گیا۔ قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کی تفسیر تشریح اور تاویل میں الفاظ کے دریا بہا دئے گئے لیکن اسکی روح کی پکار کی طرف سے کان بند کر لئے گئے۔ مسلمانوں کے دور انحطاط کا تمام تر ادب اسی قسم کے مسائل سے بھرا پڑا ہے اسلامی ادب کے نام پر جو تصور عوام کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ اگر شاعری ہو تو "حمد" "نعت" "سلام" "منقبت" "مرثیہ" "یا قصیدہ" کی اصناف سخن ہیں۔ یا پھر غزل کے وہ اشعار جن میں وحدت الوجود یا وحدت الشہود جیسے فلسفوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ کار جہاں سے زندگی کی حقیقتوں سے بے نیاز اس ادب کو ایسے مذہب کا ادب سمجھا جا رہا ہے جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو اپنے پیروؤں کو امر بالمعروف اور تنھون عن المنکر کا حامل قرار دیتا ہے۔ اور طرفہ تماشا یہ ہیکہ اس قسم کے ادب کو عیب کے بجائے عین ہنر کا درجہ دیا جا رہا ہے۔

اقبال کے الفاظ میں "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے یہ اشعار ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جسکے دیں کی احتساب کائنات

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

اور جب یہ مزاج خانقاہی اس امت کے رگ و پے میں رچ بس گیا ۔ جب اسکا شعور تصوف گل و بلبل ۔ لب و رخسار ۔ قطرے کے دریا میں فنا ہونے کے دائروں میں محدود ہوکر رہ گیا تو پھر ادب میں وہ تحریک اٹھی جس نے ادب برائے زندگی کے نام پر زندگی کے حقائق کو معاشرے کی خرابیوں اور خامیوں کو ہر ذریعہ ابلاغ کا استعمال کر کے اس انداز میں پیش کرنا شروع کیا کہ انسان اپنے معاشرے کی اصلاح اور بہتر مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جائے ۔ عوام مایوس ہو کر الحاد کی گود میں جا گریں تاکہ جب نام نہاد انقلاب برپا ہو تو اگر وہ اس کا ساتھ نہ بھی دیں تو کم از کم خاموش تماشائی ضرور بنے رہیں ۔

ان حالات میں ادب اسلامی کی تحریک کے ذمہ داروں کے سر بھاری ذمہ داری آتی ہے کہ وہ پہلے تو عوام کے ذہن سے اس غلط تصور کو دور کریں کہ اسلامی ادب خانقاہی ادب ہے اسکا زندگی اور اسکے مسائل سے کوئی واسطہ نہیں ۔ ان کو عوام کے سامنے اپنی تحریروں اور اشعار سے یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلامی ادب کوئی جامد ادب نہیں اور اس میں انسانی مسائل چاہے وہ سیاسی ہوں کہ معاشی سماجی ہوں کہ نفسیاتی ۔ کا تذکرہ شجر ممنوعہ کی حیثیت نہیں رکھتا ۔ ادب اسلامی کی تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کو اپنا انداز سخن بدلنا ہے ۔ خطیبانہ انداز ترک کر کے خالص ادبی اور علمی اصطلاحات میں بات کرنی ہے ۔ اور ان تمام سازشوں کا جواب بننا ہے جو ادبی محاذ پر ادب کو مذہب سے علاحدہ کرنے کیلئے کی جا رہی ہیں ۔ اس سلسلے میں خوشی کی بات یہ ہے کہ کچھ کوششیں ہوئی ہیں ۔ جیسے نعیم صدیقی ، حفیظ میرٹھی ۔ ڈاکٹر احمد سجاد ، نجات اللہ صدیقی اور احسان دانش وغیرہ لیکن اب بھی اکثر افراد روایاتی انداز اپنائے ہوئے ہیں اور جو روایات سے ہٹ رہے ہیں ۔ انہوں نے غیر ادبی اور خطیبانہ انداز اختیار کر لیا ہے ۔ ہمیں اس سے بچنے کی ضرورت ہے ۔ ادب مرکب ہے مواد اور ہیئت کا ۔ ادیب کچھ کہنا چاہتا ہے پھر وہ کہنے کا ایک اسلوب نکالتا ہے ۔ ہمیں پورے شعور کے ساتھ صحیح انداز نظر اختیار کرنا ہے اور اس مواد کو واضح اور جمیل انداز میں پیش کرنا ہے

ادب اسلامی کی تحریک کا ایک مسئلہ انتشار اور غفلت ہے ۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب اسلامی کی تحریک کے کاروان میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے ۔ لیکن ربط باہمی کا فقدان ہے ۔ تنظیم اور ترتیب کی کمی ہے ۔ اسکے نتیجے میں اسلامی فکر بلکہ یوں کہیے کہ صالح

انسانی اقدار کے یہ نقیب ذرائع ابلاغ کو اتنے بہتر طور سے استعمال نہیں کر پا رہے ہیں۔ جتنا کہ دوسری تحریک کے علمبردار کر رہے ہیں۔ کئی شعراء اور ادیب ایسے ہیں جو اپنی اپنی تحریکوں کے کندھوں پر سوار ہو کر اپنا قد بڑھائے ہوئے ہیں اور ادب اسلامی کی تحریک کے قدآور بھی ان کے سامنے بونے نظر آنے لگے ہیں۔ حالانکہ بقول جامی۔

جامیؔ مرے اشعار کا قد ناپنے والے　　وہ لوگ ہیں جو ریت کے ٹیلوں پہ کھڑے ہیں

انتشار اور ربط باہمی کا فقدان ایک اہم مسئلہ ہے اور اس کا حل زیادہ مشکل نہیں اگر اس تحریک سے وابستہ افراد طے کر لیں کہ ؎

پرونا ایک تسبیح میں اگر ان بکھرے دانوں کو　　جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

ان مسائل سے قطع نظر کئی دوسرے چھوٹے بڑے مسائل بھی ہیں۔ لیکن ان کا حل ہونا چنداں دشوار نہیں۔ میں وقت کی تنگی کے پیش نظر اس گفتگو کو اسی موڑ پر چھوڑنا بہتر سمجھتا ہوں اپنے ہم سفروں سے یہ کہتے ہوئے کہ ؎

اٹھ کے ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر　　بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر　　قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں۔

غزل

نوید متین

ہر ایک چشم یہاں تر ہے کیا کیا جائے　　زمانہ غم کا سمندر ہے کیا کیا جائے
مجھے تھا ناز بہت جس کی دوستی پر بھی　　اسی کے ہاتھ میں خنجر ہے کیا کیا جائے
عجیب بات ہے ساقی مرے مقدر کی　　ہر ایک جام نگوں سر ہے کیا کیا جائے
سکون کے لئے آیا تھا تیری محفل میں　　سکون خود یہاں مضطر ہے کیا کیا جائے

تنقید کا منصب

رحمت یوسف زئی
لکچرر شعبہ اردو ۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد

تنقید کے بارے میں ارسطو سے لیکر آج تک مختلف مفکرین نے مختلف النوع خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ اور اردو تنقید کا المیہ یہ ہے کہ یا تو اسے قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا اور معشوق موہوم کمر یا اقلیدس کا نقطۂ خیالی جیسے خطاب سے سرفراز کرکے اپنی انا کی تسکین کے سامان فراہم کئے گئے یا مغربی نظریات تنقید کو اردو تنقید کے سر پر لاد دیا گیا ۔ مختلف تنقیدی افکار پر سرسری جائزہ ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بہرحال تنقید کسی فن پارے کے احتسابی جائزہ کا نام ہے ۔ اب کسی نے فن کو تاریخی سماجی اور معاشرتی تناظر میں دیکھنے پر زور دیا تو کسی نقاد نے نفسیاتی تحلیل کے طریقۂ کار کو اہمیت دی ۔ کسی نے جمالیاتی نقطۂ نظر کو اہم قرار دیا تو کسی نے وجودی فلسفہ کو اپنے تنقیدی افکار کا محور بنایا ۔

ادب احساس، مشاہدہ اور فکر کو اظہار کا پیکر عطا کرنے کا نام ہے اور اظہار کا سلیقہ عطیۂ خداوندی ہے ۔ سلیقۂ اظہار کی تفہیم اور فن کے اندر چھپی ہوئی بصیرت کی تلاش وہ اہم کام ہے جو تنقید انجام دیتی ہے ۔ اس طرح نقاد قاری اور فن کار کے درمیان ایک رابطہ کا کام بھی کرتا ہے اور آنے والے ادب کیلئے راہیں متعین کرنے کا اہم فریضہ بھی انجام دیتا ہے لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ یورپی مفکرین کے عطا کردہ نسخہ ہائے کیمیا یعنی تنقیدی نظریات نے کسی عظیم ادب پارے کی تخلیق میں کوئی معاونت نہیں کی ۔ اور ایسا ادب وجود میں نہیں آسکا جسکے ذریعہ اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار کو فروغ مل سکے ۔ اس طرح تنقید صرف نکتہ چینی اور تنقیص کا ذریعہ بنی اور تنقید کے اس اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا کہ نقاد کو تعمیری رخ اختیار کرتے ہوئے ادب کیلئے ایسی راہیں متعین کرنی چاہیں جن سے انسانی سماج دینی اور معاشرتی اعتبار سے بہتری کی طرف قدم بڑھا سکے ۔

بظاہر تنقید اس وقت معرض وجود میں آتی ہے جب فن کا ظہور ہو چکا ہوتا ہے ۔ لیکن

حقیقت یہ ہے کہ تنقید مستقبل کی تخلیق کیلئے مشعل راہ ثابت ہوتی ہے۔ تنقید ادب کی راہوں کو متعین کرتی اور ایک اعلیٰ ادب کو تخلیق کرنے میں فن کار کی مدد و معاون ثابت ہوتی ہے فنکار تنقید ہی سے روشنی حاصل کرکے اپنے فن کو سنوارتا اور نکھارتا ہے اور اس طرح یہ توقع پیدا ہوتا ہے کہ ایک مہتم بالشان ادب وجود میں آئے گا ــــ دراصل ہر فن کار میں بھی ایک تنقیدی شعور کا ہونا لازمی امر ہے۔ اگر کوئی فن کار تنقیدی شعور سے عاری ہو تو پھر اس کا فن بھی کج بیانی اور خامیوں سے بھرپور ہوگا۔ لیکن اگر فن کار خود ایک تنقیدی ذہن کا حامل ہو تو تخلیق سرزد ہونے سے قبل ہی غیر محسوس طریقہ پر تخلیق کی خوبیوں اور خامیوں کا محاسبہ خود ہی کرلے گا۔

اب اگر فن کار اعلیٰ انسانی اقدار کو اہمیت دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو پھر اس کا فن بھی ان ہی اوصاف سے متصف ہوگا۔ اس طرح ادب اور زندگی کا رشتہ مضبوط تر ہوتا جائے گا کیونکہ ادب ماضی حال اور مستقبل کے درمیان ایک ایسی کڑی ہے جو انسانی فکر کو صحیح راہ پر گامزن ہونے میں مدد دیتی ہے۔

دنیا نے تنقید نے مختلف نظریات کو اپنا کر آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے لیکن نتیجہ ہوا ہے کہ نظریات کے رد و اختیار کے طولانی عمل نے ادب کی راہوں کو گنجلک بنا دیا ہے اور بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر وقت ایک قسم کا نظریاتی خلا موجود ہے۔ ایسے ہی لمحوں کے دوران وسیع کائنات کے تناظر میں انسان جب اپنے آپ کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی روح پیاسی ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ تصورات کی شکست و ریخت کے درمیان اس کا اپنا مقصد وجود کیا ہے۔ اب اگر یہ فکر صحیح راستہ اختیار کرے تو عرفان ذات کی منزل تک جا پہنچتی ہے اور گمرہی کی شکار ہو جائے تو لایعنیت کے کھائی غار میں گر کر غا موں کہلاتی ہے۔

حالی نے جب ادب کو اخلاق کا نائب مناسب بتایا تو اس کا مفہوم یہ سمجھا گیا کہ ادب کو ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے لیکن حالی کا مقصد یہ تھا کہ ادب کو انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے ہونا چاہیے اور ایسی تحریر جو جذبات میں ہیجان برپا کرے اور بے راہ روی کو فروغ دے وہ ادب نہیں کہلائی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں دھوم

مچا دینے والے عقیدوں کو جنہیں مسجود معاشرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسلام کی روشنی نے ماند کر دیا اور اپنے وقت کے یہ عظیم عقائد پس منظر میں چلے گئے۔ اس لئے کہ اسلام نے جذبات کی تہذیب کا سبق دیا۔ ہمدردی، خلوص اور اخلاقی اقدار کو اہمیت دی اور بے راہ روی اور ہیجان انگیزی کو یکسر مسترد کر دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح راستہ کیا ہے۔ اصل میں ادب ہنگامی ضرورتوں کے تحت پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ہنگامی ضرورتوں کے تحت تخلیق کیا جانے والا فن ادب کے معیارات پر پورا نہیں اترتا۔ کیونکہ ہنگامی ضرورتیں اور وقتی مصلحتیں کسی نہ کسی عمومی مقصد کے تحت ہوتی ہیں۔ اعلیٰ ادب تو وہی ہے جس میں بنیادی انسانی اقدار موجود ہوں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ادیب اپنا رشتہ فکری اور روحانی طور پر اخوت، محبت اور خلوص سے استوار کرے۔ کیونکہ یہی وہ اقدار ہیں جو راہ نجات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور اس طرح تنقید کا منصب یہ بھی ہو جاتا ہے کہ ادیب کیلئے وہ کھرے اور کھوٹے کی پہچان کے سلسلے میں کسوٹی پیش کرے۔

قاری کی کمزوری یہ ہے کہ وہ صرف تخلیق کے سہارے آگے بڑھتا ہے اور اسی سے تاثر قبول کرتا ہے۔ جبکہ نقاد تخلیق کار کی انفرادیت تک پہنچ کر اس کے محسوسات کی نشاندہی کرتا ہے اور ان عوامل کی وضاحت کرتا ہے جہاں قاری کا ناپختہ ذہن نہیں پہنچ سکتا۔ یوں نقاد پر ایک بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حق اور باطل میں تفریق کے مسئلے کو قاری کیلئے آسان کر دے۔

قاری ہر خوبصورت نظر آنے والی شئے کے پیچھے بھاگنے کی جبلت کا شکار ہوتا ہے نقاد کا فرض یہ ہے کہ وہ اس خوبصورت نظر آنے والی شئے کی اصلیت کو قاری پر واضح کر دے اس وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ فنی اظہار میں لفظوں کی پیکر تراشی سے ایسی سحر کارانہ کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے کہ جو ذہن کو مسحور کر لے اور پھر اس فن کارانہ اظہار میں جو تباہ کن مقصد چھپا ہوا ہے اس چشم پوشی کر لی جائے اور وہ تباہ کن مقصد غیر محسوس طریقہ پر قارئین کی ایک جماعت کو متاثر کرے۔

مثال کے طور پر ناگن خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم خوبصورتی کی

ستائش کرتے ہوئے ناگن کو آستین میں رکھ لیں۔ ظاہر ہے کہ خوبصورت نظر آنے والی ناگن کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ وہ ڈس لیا کرتی ہے۔ نقاد کا کام یہ ہے کہ وہ اس ناگن کی خوبصورتی میں پوشیدہ زہر کو عیاں کرے تاکہ کمزور ذہن متاثر نہ ہونے پائے۔ بظاہر چمکدار نظر آنے والے ہیجان انگیز اظہار اور دنیا میں پھیلنے والی بے راہ روی کے مضر اثرات سے بچانے کیلئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ نقاد بے باکی اور جرأت سے کام لیں اور ادب کو ایسی راہ پر گامزن کرنے کیلئے آگے بڑھیں جو فلاح کی راہ ہے۔

اسماعیل ظریف

اب کہاں باقی رہا وہ امتیاز و انتخاب
محفلوں میں شاعروں کے واسطے کیو لگ گیا
پانچ سے زاید نہ ہوں اشعار یہ اعلان ہے
شاعرو! ہشیار ہو جاؤ کہ کرفیو لگ گیا

ریل کے اک حادثے میں اک مسافر مر گیا
دیکھئے انسانیت بھی کس قدر پستی میں ہے
اس کی بیوہ کو ملی نقدی رقم لیکن ظریف
ہے ابھی مرحوم زندہ اور اسی بستی میں ہے

مکار دنیا دار کو تو آزما کے دیکھ
گر دیکھنا ہو اس کو تو مسجد میں جا کے دیکھ
ہو ہاتھ کی صفائی اگر دیکھنا ظریف
سجدے میں جیب سے تو اٹھنی گرا کے دیکھ

بیگم نے پیار سے کہا شوہر سے حضور!
ہوٹل سے ناشتہ یہیں گھر پہ منگائیے
کتے پکڑ رہے ہیں سنا بلدیہ کے لوگ
میری قسم ہے آپ کو باہر نہ جائیے

صدارتی تقریر
محمود انصاری ایڈیٹر "منصف"

یہ بات خوش آئند ہے کہ ادب اسلامی کی کانفرنس کا ریاستی سطح پر انعقاد عمل میں آرہا ہے۔ اور میں محسوس کررہا ہوں کہ ساتھ ساتھ مقالے تعمیری اور نمائندہ ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا کاروان ادب صحیح سمت میں گامزن ہے۔ احمد سجاد صاحب کا میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ انکی ادب پر گہری نگاہ ہے۔ میں پروفیسر محمد اور حسین رضوی صاحب کا بھی خیر مقدم کرتا ہوں۔

ادارہ ادب اسلامی قومی سطح پر سرگرم ہے اور اس کا ترجمان فنکار نکالا جاتا ہے۔ ادب اسلامی کی تحریک نئی تحریک نہیں ہے۔ یہ گذشتہ چودہ سو سال سے جاری ہے اور انتہائی موثر تحریک ہے۔ چاہے اردو زبان کا وجود نہ رہا ہو لیکن ادب اسلامی کی تحریک مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے جاری رہی ہے۔

ادب میں مختلف تحریکات رہی ہیں ابھی کچھ عرصہ قبل ترقی پسند تحریک کی ترقی کی گولڈن جوبلی بھی منائی گئی لیکن پچیس تیس سال ہی میں مردہ ہوگئی اس کے بعد جدیدیت کی تحریک ابھی ابھی وہ چل رہی ہے لیکن میرے خیال میں وہ بھی مردہ ہو چکی ہے۔ جو لوگ ترقی پسند تحریک یا جدیدیت کی تحریک یا کسی اور تحریک کا ساتھ دیتے رہے اور انہیں صحیح راستہ نہیں مل سکا۔ اب چاہے آپ ادب اسلامی کا نام لیں چاہے صداقت کو سمولنے کا نام لیں چاہے حق کا راستہ قرار دیں۔ بہرحال ساری انسانیت کے لئے صرف ادب اسلامی کا راستہ ہی باقی رہ گیا ہے۔ اس وقت ادب صرف تحریری شکل میں نہیں ہے بلکہ ریڈیو ٹیلی ویژن بھی دنیا میں آگئے ہیں لیکن ادب کی تحریری شکل ہی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ٹی وی صرف پروپگنڈہ کی شکل ہے۔ اور حکومت کے میڈیا کی حیثیت رکھتی ہے اس میں آپ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرسکتے۔ لیکن آپ کو پریس کی اس قدر آزادی حاصل ہے کہ آپ اس ادب کو اسلام کی تبلیغ کا اچھے خیالات کی ترویج کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔

غزلیں

عزیز بگھروی

زخمِ غم بھول گئے، داغِ الم بھول گئے
تجھ سے ہم مل کے زمانے کے ستم بھول گئے

دامِ خوش رنگ میں پھر آ گئے مرغانِ چمن
حیف! پھر فطرتِ اربابِ کرم بھول گئے

مجھ کو پیمانِ وفا یاد دلانے والے
اپنا پیمانِ وفا اپنی قسم بھول گئے

کہہ گئے اُن سے نہ کہنے کی تو باتیں کیا کیا
اک وہی بات جو کہنے کی تھی ہم بھول گئے

رکھنے والوں نے بھرم عصمتِ غم کا رکھا
بھولنے والے ترے لطف و کرم بھول گئے

گھر سے بے گھر ہوئے بیگانۂ منزل ٹھہرے
وہ مسافر جو ترے نقشِ قدم بھول گئے

ہیں تو وہ آج بھی تیرے ہی پرستار مگر
تیری باتیں، تری خوشیاں، ترے غم بھول گئے

معتبر جتنے حوالے تھے کہانی کے عزیز
لکھنے بیٹھے تو وہی اہلِ قلم بھول گئے۔

راشد احمد راشد

اچھا ملا ہے میری وفا کا صلہ مجھے
ہر ہر قدم پہ آپ نے دھوکا دیا مجھے

روؤں میں اتنا پھر نہ رہے غم حیات میں
آج ایسی داستاں مرے ہمدم سنا مجھے

راہوں کی ٹھوکروں نے کیا منزل آشنا
میری ہی لغزشوں نے سہارا دیا مجھے

کچھ ایسے حادثات بھی آئے حیات میں
خود اپنے گھر کو آگ لگانا پڑا مجھے

راشد وہ رازدارِ محبت سہی، مگر
ان سے بھی دل کا راز چھپانا پڑا مجھے

غزلیں

اختلافوں کی گرہ فرمائیے کیونکر کھلے
گفتگو کی منزلوں میں بھی جہاں خنجر کھلے

اب تو ہر سائل پر سارق کا گماں ہونے لگا
کیا بڑھے دستِ کرم ایسے میں کس کا در کھلے

زندگی خود ان دنوں ایک قیدِ بے زنجیر ہے
کب بہار آئے نہ جانے کب قفس کا در کھلے

دور تک ٹوٹی ہوئی دیوار بھی ملتی نہیں
زندگی صحرا بہ صحرا پھر رہی ہے سر کھلے

راز میرے ساتھ کچھ احباب تیرے کچھ جاذ گر
سوچتا ہوں زخم کے ٹانکے مگر کیونکر کھلے

مسعود جعفری کاغذ نگر

رات کیسی تھی جدائی کا سماں کیسا تھا
ابنِ یعقوب سے پوچھو کہ کنواں کیسا تھا

ایسا طوفان کہ پتھر کی فصیلیں ٹوٹیں
ایسے طوفان میں مٹی کا مکاں کیسا تھا

آخرِ شب ہی بجھاتے ہیں دئیے سب لیکن
دوپہر ہی سے مکانوں میں دھواں کیسا تھا

میں نے تاریخ کا ہر حرف لہو سے لکھا
میرے اخلاص پہ لوگوں کا گماں کیسا تھا

اس کے بارے میں تجھے وقت سے ملنا ہوگا
تیرا مسعود زمانے میں کہاں کیسا تھا

داؤد نصیب

ہٹو بھی جائیے دامن کہاں چھڑا کے چلے
یہ کیا جگہ ہے کہاں آپ مجھ کو لا کے چلے

خوشی کی بزم میں ورنہ کہاں جگہ ملتی ہے
غموں کی بھیڑ میں ہم راستہ بنا کے چلے

اسی خیال میں کب ان کا سامنا ہو جائے
جہاں جہاں سے چلے ہم نظر جھکا کے چلے

تمہارے نام سے کر کے چراغِ دل روشن
بڑے تپاک سے ہم سامنے ہوا کے چلے

نصیب دیتا رہا غم پہ غمِ جہاں لیکن
ہم آبروئے محبت سے مسکرا کے چلے

غزلیں

مرزا غلام جیلانی بیگ صادق

سب کی آنکھوں میں ہے اک رونق محفل تنہا
جلوہ آرا نظر آتا ہے ہر اک دل تنہا

دیکھ ساحل کا سکوں شورش طوفاں پہ نہ جا
کتنے طوفان پلٹ دیتا ہے ساحل تنہا

واسطا کیا ہو ہر اک راہگزر سے میرا
ہے مرے پیش نظر بس مری منزل تنہا

ہم تو اٹھ جائیں گے یہ بات تو ہو سکتی ہے
ہو نہیں سکتی کبھی آپ کی محفل تنہا

اپنے صادق پہ بھی اب کیجیے کرم بہر کرم
دل ہے اب زورِ حوادث کے مقابل تنہا

خواجہ شوق

عقل کا زور وبالِ دل و جاں ہوتا ہے
تیز اجالا ہو تو آنکھوں پہ گراں ہوتا ہے

غم کے اظہار سے غم اور نہاں ہوتا ہے
حسن چھپ جاتا ہے جب جلوہ کناں ہوتا ہے

پہلے ہر بات پہ ہوتا تھا وہاں ذکر اپنا
اب بعنوانِ حدیث دگراں ہوتا ہے

زندگی پھول لٹاتی رہی جن راہوں میں
آج انھیں راہوں پہ مقتل کا گماں ہوتا ہے

شوق آزار رسانی ہے شناخت اپنوں کی
جس کو اپناؤ وہ آزار رساں ہوتا ہے

ذاکر گوڈر شاہی

فقط دامن کو تر سے چشم ترا ایسا نہیں ہوتا
ستم ہوتا ہے دنیا میں مگر ایسا نہیں ہوتا

تو کہتا ہے مرا دل تیرا گھر ہے ٹھیک ہے لیکن
زمانہ دیکھ کر کہتا ہے گھر ایسا نہیں ہوتا

نقاب رخ ادھر الٹی ادھر نظریں جھکیں میری
خدا معلوم کیا ہوتا اگر ایسا نہیں ہوتا

مجھے پہچاننے کا ہوش باقی ہے تعجب ہے
کوئی دیوانہ کوئی بے خبر ایسا نہیں ہوتا

نظر ملتی بھی ہے ذاکر قدم بھی ان کے اٹھتے ہیں
گذر جائیں وہ مجھ کو دیکھ کر ایسا نہیں ہوتا

غزلیں

علی الدین نوید

خاکستر جاں سے کوئی چنگاری اڑے گی
مٹی کا دیا بجھتے ہی اک شمع جلے گی

تم چاہے ہواؤں سے اسے لاکھ بجھاؤ
یہ جسم کی دیوار تو گر کر ہی رہے گی

سناٹے میں کھو جائیں گے دنیا کے جھمیلے
خاموشی ہی آواز کا پیمانہ بنے گی

سورج نکل آیا ہے چلو خود کو تلاشیں
سایہ بھی نہ مل پائیگا جب دھوپ ڈھلے گی

ہاتھوں کی لکیروں میں یہ کیا ڈھونڈ رہے ہو
حالات کی تحریر تو چہروں پہ ملے گی

آرام سے جینے کی ہوس کس کو نہیں ہے
دنیا ہے یہ آرام سے مرنے بھی نہ دے گی

میں تیرے لئے جاں سے گزر جاؤنگا جس دن
اخبار کی سرخی تری آنکھوں میں چبھے گی

رؤف خیر

فروتنی میری دشمنی کو اثر کرتی ہے
بڑے ادب سے وہیں ردِ کبر کرتی ہے

وہ شام جس نے سنبھالے ہوئے رکھا ہے ہمیں
کبھی کبھی تو بہت تیرا ذکر کرتی ہے

یہ رکھ رکھاؤ ہی ملنے سے روکتا ہے ہمیں
یہی انا ہے جو مائل بہ ہجر کرتی ہے

مجھے یہ فکر کہیں شاخ بے نمو نہ رہوں
یہی زمین بھی کیا میری فکر کرتی ہے

ملال یہ ہے کہ آسودہ ہے وہ چنگاری
جلا کے خاک جو یونان و مصر کرتی ہے

رؤف خیر عقیدے کی ضرب ہے ایسی
ادب بڑا بھی اگر ہو تو صفر کرتی ہے

غزلیں

عبدالرحمٰن جامی (محبوب نگر)

جہاں کا درد میسّر ہے کیا کیا جائے
یہ میرا اپنا مقدر ہے کیا کیا جائے
لرزتے ہاتھ میں خنجر ہے کیا کیا جائے
وہ اپنا روپ بدل کر ہے کیا کیا جائے
زمانہ آج سر دار لے چلا ہے جسے
وہ شخص واقعی حق پر ہے کیا کیا جائے
دہکتی آگ کے شعلے جہاں سے اٹھے ہیں
وہیں قریب مرا گھر ہے کیا کیا جائے
جسے میں راز داں اپنا بنا لیا جامی
وہ میری راہ کا پتھر ہے کیا کیا جائے

یوسف نظر

ارمان و آرزو کا قرینہ عجیب ہے
بہتا ہے ریت پر یہ سفینہ عجیب ہے
لب پر ہنسی کے ساتھ ہی پلکوں میں ہے نمی
دل میں تمہارے غم کا دفینہ عجیب ہے
ارباب ہوش میں یہ سلیقہ نہ آسکا
کچھ میری زندگی کا قرینہ عجیب ہے
ہر لمحۂ حیات پہ صدیوں کا ہے گماں
تیرے فراق کا یہ مہینہ عجیب ہے
میرے نفس نفس میں ہے خوشبو بسی ہوئی
اس شوخ کے بدن کا پسینہ عجیب ہے

قمر رضا

منزل نئی ہے اور نہ رہبر نیا ہے دوست
سیٹی نئی ہے ریل کا انجن نیا ہے دوست
ہر زاویے سے تاج محل دیکھتا ہوں میں
تصویر کھینچنے کا یہی فن نیا ہے دوست
ممکن ہے کھیلتا ہو کھلونے خرید کر
اس بوڑھے شخص کے لیے بچپن نیا ہے دوست
گھر کی بہو جلی تو خسر پر نہ آنچ آئے
چولھوں میں اب جہیز کا ایندھن نیا ہے دوست
خوشیوں کے دیوتا پہ چڑھاتا ہے خوں کی بھینٹ
تہوار کے جہاں کا یہ راون نیا ہے دوست
جس کے بدن پہ دیکھئے ہے آتشیں لباس
کتنا یہ میرے شہر کا فیشن نیا ہے دوست

ارمان

سید منظور الحسن ہاشمی

"نہیں سلیمان! اب میں زیادہ پریشان نہیں ہوتی۔ اب تو مجھے کچھ عادت سی ہو گئی ہے کھانسی کے دورے تو پڑتے ہی رہتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور پھر جب کھانستے کھانستے خون آجاتا ہے تو اس وقت بھی کچھ زیادہ گھبراہٹ نہیں ہوتی۔

فاطمہ نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ سلیمان اس کے مرجھائے ہوئے پیلے پیلے چہرے کو سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی فاطمہ تھی جو بہار بن کر اس کے لئے ایک نئی زندگی لے کر آئی تھی، لیکن وہ اس درخت کی طرح تھی جس کے پتے سوکھ سوکھ کر پوری طرح جھڑ چکے ہوں اور جس کی زندگی کا آخری لمحہ کسی طوفانی آندھی کا منتظر ہو۔ اس نے پھر ایک بار آنکھیں کھولیں اور نہایت کمزور آواز میں کہا۔

"شروع شروع میں، میں بہت پریشان ہوتی تھی سلیمان۔ دل زور زور سے دھڑکتا تھا۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ جاتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے"

نقاہت پھر ایک بار غالب ہو گئی اور فاطمہ کے ہلتے ہوئے ہونٹ خاموش سے ہو گئے۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو لہرا رہے تھے۔

سلیمان! اور تو کچھ نہیں۔ مجھے اپنا فیصل یاد آجاتا تھا۔ سوچتی تھی میں اگر مر گئی تو اس معصوم کا کیا ہوگا۔ کسے ماں کہہ کر پکارے گا۔ کس کی گود میں ہمک کر بیٹھے گا۔ کس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر۔۔۔"

"فاطمہ تم رونے لگیں"

"نہیں سلیمان! میں اب رو کر کیا کرونگی، یونہی کچھ آنسو آنکھوں میں آ گئے تھے۔ ہاں میں سوچا کرتی تھی، میرا فیصل، میرا ننھا سا پھول مرجھا کر رہ جائے گا۔ میں ڈرتی تھی کہ اگر میں مر گئی تو۔۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔ ایک سوتیلی۔۔۔۔"

فاطمہ یہ تم بک رہی ہو ۔ اس قسم کی فضول باتوں سے کوئی فائدہ؟"

"نہیں سلیمان! اب تو اس قسم کا کوئی خیال آتا بھی نہیں ہے ۔ اب تو میرا فضیل ماشاء اللہ! جوان ہوگیا ہے ...... اور سلیمان اب تو میں نے رونا بھی چھوڑدیا ہے، میرے دل کو ایک ڈھارس سی بندھ گئی ہے ۔ میرا فضیل پڑھ لکھ گیا ہے ۔ قاہرہ سے واپس آکر میرے پاس رہے گا، تو وہ خود ہی میرا علاج کریگا ۔ میں اچھی ہوجاؤنگی، سلیمان!

بہت جلد اچھی ...... آف کھانسی ...... کھانسی چین نہیں لینے دیتی۔"

" فاطمہ! یقیناً تم بہت جلد اچھی ہوجاؤگی، تم رو کیوں رہی ہو، لو سیب کی چند قاشیں کھالو، طبیعت سنبھل جائے گی۔"

"میرا بیٹا فضیل! خدا اسے خوش رکھے، میرا بڑا خیال رکھتا ہے" قاہرہ سے کیسی کیسی قیمتی اور کیسے شاداب پھلوں کے پارسل روانہ کیا کرتا ہے مگر میری بیماری میرا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ سلیمان! جب وہ آئیگا اور جب وہ مجھے اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے اٹھا کر دوا پلائیگا تو وہ دوا میرے لئے اکسیر بن جائے گی ۔

فاطمہ کے تھکے ہوئے چہرے پر سکون اور مسرت کی ملی جلی کیفیتیں کچھ اس طرح لوٹ آئیں جیسے دریائے نیل کے سیلاب نے کھیتوں کو لہلہا دیا اور وادی نیل کی ساری فضا مسکرا اٹھی ۔

فاطمہ کا سکوت پھر ٹوٹا اور ایک طفلانہ مسکراہٹ کے ساتھ سلیمان کی طرف دیکھا ۔

"اے لو میں بھی کیسی دیوانی ہوں، نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں سوچنے لگی ۔ سلیمان تمہیں شادی کا سامان بھی کرنا ہے، سلیمان جاؤ ۔ جلدی جاؤ ۔ دلہن کے لئے تو تم کچھ بھی نہیں لائے اور وہ ہار نیکلس بنا کر کب لائے گا ۔

سلیمان تم تو بڑی دیر لگاتے ہو، تمہیں نہیں معلوم مجھے اپنی بہو کا کتنا شدید انتظار ہے ۔ اسکی صراحی دار گردن میں جب میں یہ ہار پہناؤں گی تو چاند تارے بھی شرما جائیں گے ۔ سلیمان تم جاتے کیوں نہیں ۔ اے لو تم تو کھڑے مسکرا رہے ہو ۔ جاؤ سلیمان ــ جلدی جاؤ .... آف کھانسی ہائے کھانسی کا دورہ پھر پڑا ۔ یہ کھانسی چین نہ لینے دے گی ۔ ارے خون ۔ خون پھر آگیا ۔ اللہ اکبر اٹھا دو ۔ سلیمان ذرا مجھے تھام لو۔"

فاطمہ کی زندگی غم و یاس اور کیف و سرور کا ایک عجیب و غریب امتزاج تھی۔ اس کی زندگی کراہوں اور سرد آہوں کا دلخراش مجموعہ بن کر رہ گئی تھی اور زندگی کی یہ بے چینیاں اس کے حوصلوں میں........ اور اس کے جذبات میں مایوسی کی کیفیت پیدا کر دیتی تھیں۔ زندگی اسے تاریک نظر آتی تھی اور مستقبل بالکل بھیانک دکھائی دیتا تھا، مگر جب فضیل کا خیال اس کے تھکے ہوئے دماغ میں آجاتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی اندھیری جھونپڑی میں کوئی دیا جگمگا رہا ہو، یا کسی ویران سنسان مقبرہ میں کوئی ٹمٹماتا ہوا چراغ اندھیری فضاؤں کو بار بار ڈھکیل کر باہر نکال رہا ہو۔ فاطمہ کے پیلے پیلے سے چہرے پر ایک رونق سی آجاتی اور اس کے خشک ہونٹوں پر تبسم کی لہریں دوڑنے لگتیں۔

آج بھی فاطمہ کھانستے کھانستے بے دم سی ہو گئی تھی اور جو کچھ خون سیب انگور انار نے اس کے جسم میں پیدا کیا تھا وہ سب کا سب اس کے کھانستے ہوئے پھیپھڑوں نے باہر اگل دیا تھا مگر اس ہیجانی کیفیت کے بعد بھی گڑھے میں دھنسی ہوئی فاطمہ کی آنکھوں میں کچھ چمک موجود تھی۔ اس کا زرد زرد مغموم سا چہرہ کچھ مسکراتا ہوا نظر آرہا تھا۔ شائد وہ اپنی چاند سی بہو کو آتا ہوا دیکھ رہی تھی اس کے مہکتے مہکتے سنہرے بال اس کے ارمانوں کو گدگدا رہے تھے اس کی شرمائی ہوئی غزالی آنکھیں اس کی تمناؤں میں نئی زندگی پیدا کر رہی تھیں، اس کی دھیمی دھیمی چال اور چھمکتا ہوا سا انداز اس کے مرجھائے ہوئے دل میں شگفتگی پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

شاید کہہ رہے ہیں۔

"آؤ بیٹی۔ آؤ میرے پاس آؤ۔ تم میرے ارمانوں کی دنیا ہو۔ تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو۔ آؤ۔ بیٹی۔ تمہیں گلے سے لگالوں۔ تمہیں سونے کا جگمگاتا ہوا ہار پہناؤں"

"تم کچھ سوچ رہی ہو فاطمہ..... لو میں تمہاری بہو کا ہار لے آیا ہوں نا بڑا خوبصورت"

"بڑا پیارا ہار ہے..... جب وہ پہنے گی....."

"ارے تم بار بار رونے کیوں لگتی ہو۔؟"

"سلیمان۔ تم کہتے ہو۔ میں رو رہی ہوں۔ نہیں۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ بڑے ارمانوں کے بعد وہ دن قریب آرہا ہے۔

"پھر تم نے رونا شروع کر دیا۔

"سلیمان .... میں سوچتی ہوں کیا سچ مچ وہ دن دیکھنے کے لئے میں زندہ بھی رہوں گی؟"

"فاطمہ! تم نے تو ہمیشہ جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا ہے۔ تمہارے صبر کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی رہی ہے ..... اور فاطمہ یہ تمہاری جرأت ہی تو ہے جس نے فضیل کو اس قدر جری اور بہادر بنا دیا ہے ....."

"ہاں سلیمان! مگر اب دل بڑا کمزور ہو گیا ہے۔ بات بات پر آنسو آ ہی جاتے ہیں اچھا سب انتظامات کر لئے ہیں نا؟"

"ہاں سارے انتظامات خدا کے فضل سے ٹھیک ہو چکے ہیں۔"

"سلیمان میں کبھی کبھی جھلا اٹھتی ہوں، تم برا تو نہیں مانتے؟"

"نہیں فاطمہ! بھلا میں برا مانوں گا؟"

"اچھا آٹھ بجے کی ٹرین سے فضیل آ جائے گا نا؟"

"ہاں انشاء اللہ امید تو ہے۔"

دن آہستہ آہستہ رخصت ہو رہا تھا۔ دن کے سارے ہنگامے آہستہ آہستہ اختتام کو پہنچ رہے تھے۔ اسکندریہ کے اسکولوں نے گھنٹیاں بجا کر ننھے ننھے بچوں کو چھٹیاں دے دیں کارخانوں نے سیٹیاں بجا کر مزدوروں کو چھوڑ دیا۔ دفتروں کے دروازے آہستہ آہستہ بند ہونے لگے۔ بڑے بڑے عہدیداروں کی خوبصورت کاریں شاہراہوں سے گذرتی ہوئی کلب گھروں کی طرف جانے لگیں۔ کم تنخواہ پانے والے بیچارے کلرک فائلوں کے پلندے دبائے ہوئے اور سستے قسم کے سگریٹ کا دھواں اگلتے ہوئے بازار کی طرف اور بازار سے گھر کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور ان کی للچائی نگاہیں کبھی کبھی بالاخانوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں جہاں حسن فروشی کا اہتمام ہو رہا تھا سورج ڈوبا اور اسکندریہ کی سڑکیں جگمگا اٹھیں۔ سجی ہوئی خوبصورت دکانیں رنگینیوں اور رومانوں کا مرکز بننے لگیں۔ مصر کی دوشیزائیں مغربی تہذیب کو شرماتی ہوئی بازار کی رونق میں اضافہ کرنے لگیں، ہر جگہ قہقہے تھے۔ رنگینیاں تھیں اور رومان پرور نظارے تھے۔

رات کی تاریکیوں میں کلب گھر کا حسن نکھر اٹھا۔ ناچ گھروں کی فضاؤں میں نظر نواز تھرتھراہٹیں پیدا ہونے لگیں۔ بحیرہ روم کی نرم نرم لہروں سے کھیلنے والے ساحلوں کے کنارے انگریزوں اور

اطالیوں کے رلیسٹوراں میں نوجوان جوڑے داخل ہونے لگے۔ عادی نیل کا حسن کرنل ناصر کا ممنون تھا کہ اس آمریت کے دور میں بھی اسے پوری پوری جمہوری آزادی حاصل ہے۔ دختران مصر کے سنہرے خوابوں میں بالی ووڈ کی رعنائیاں مکمل آزادی کے ساتھ رقصاں تھیں۔ اگر پابندیاں تھیں تو صرف اخوان پر تھیں، ان ہی رومانی فضاؤں سے گذرتا ہوا سلیمان چلا جا رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس کا فضیل ان ناپاک دھاروں کی زد میں نہ آجائے۔ مگر فاطمہ کی تربیت نے اتنے بڑے اونچے مقام پر پہنچا دیا تھا مگر کیا ناصر کا قہر ان لوگوں کو برداشت کرسکے گا۔ جوان آوارگیوں سے پاک ہے۔ کیا ناصر کی سیاست نوجوانوں سے انتقام نہ لے گی جوان دھاروں کو روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔؟ یہ سوالات بار بار ابھر کر سامنے آرہے تھے۔ یہ سوالات کبھی نامعلوم سا خوف اس کے دل میں پیدا کر دیتے تھے لیکن بہت جلد وہ اپنی خوف زدہ آنکھوں سے دور بہت دور روشنی اور چمک دیکھنے لگتا ہے اور اسے ایسے معلوم ہوتا جیسے اس کے بدن میں ایک نئی روح دوڑنے لگی ہو۔

"ارے آٹھ بجا چاہتے ہیں، گاڑی آہی رہی ہوگی"!

گاڑی دندناتی ہوئی آگئی۔ قاہرہ سے آنے والے مسافر ایک ایک کرکے گاڑی سے اترے مگر فاطمہ کا فضیل نہ آیا سلیمان کو مایوس لوٹنا پڑا۔

"کیا فضیل آگیا .... نہیں آیا۔؟ خدا خیریت سے رکھے۔ ہاں کچھ مصروفیت ہوگی، سلیمان اس وقت میرے دل پر کیا کچھ گذرہی ہے تم نہیں جانتے۔ میرا بیٹا آجاتا، میں اسے سینہ سے چمٹالیتی۔ اسکی چمکتی ہوئی پیشانی کو چوم لیتی"؛

"سلیمان! تم نے کسی سے پوچھا بھی کہ میرا بیٹا کیوں نہیں آیا۔ ارے تم نے تار دے دیا ہوتا کل تک خیریت معلوم ہوجاتی۔

" سنتے ہو۔ میرا دل نہ جانے کیوں دھڑک رہا ہے، نہ جانے کیسے کیسے خیالات میرے دل میں آرہے ہیں"؛

"سلیمان! تم نے کبھی کچھ راستہ میں سنا۔ کھڑکی کے باہر اخبار والے پکار رہے تھے کہ اخوان کے کئی لوگ گرفتار کر لئے گئے ہیں.... اور اگر میرا بیٹا...."! فاطمہ تم خواہ مخواہ وہم میں

مبتلا ہوتی ہو ۔"

"سلیمان نہ جانے یہ وہم بار بار میرے دل میں کیوں پیدا ہو رہا ہے پروردگار تو ہی میرے بیٹے کا محافظ ہے ۔ میری آرزو ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے فضیل کو دولہا بنا لوں ۔ کیا میں ۔ کیا میری آرزو پوری نہ ہوگی ..... آف .... کھانسی دم نہیں لینے دیتی ..... خون .... پھر خون آ گیا سلیمان ذرا اگالدان اٹھا لو ...... "

آدھی رات کی تاریکیوں نے اسکندریہ کی جگمگاہٹ کو آہستہ آہستہ ختم کرنا شروع کر دیا ۔ بے حیائیاں جو سر بازار رقص کر رہی تھیں ۔ سمٹ سمٹ کر خلوتوں میں پہنچنے لگیں ۔ آہستہ آہستہ سڑک کی چہل پہل سکوت میں تبدیل ہونے لگی ۔ ہنگامہ خیز سڑکوں پر ایک ہو کا عالم تھا ۔ کہیں کسی بدمست شرابی کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو دیکھ کر کتے واویلا کرنے لگتے تھے ۔

نیلے نیلے آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے ۔ مگر ان کی چمک غم ناک تھی ۔ چاند مسکرا رہا تھا مگر اس کے تبسم میں حزن و ملال تھا ۔ بحیرہ روم کی لہریں رات بھر رقص کرتی رہیں ، مگر وہ کسی آنے والے طوفان کا پتہ دے رہی تھیں ۔ گناہوں میں ڈوبا ہوا اسکندریہ کرنل ناصر کی قیادت سے خوش تھا ۔ بہت خوش ۔ مگر یہاں کچھ گوشے ایسے بھی تھے جہاں دلوں کی دھڑکنیں کرنل ناصر کی قیادت سے سخت متنفر تھیں ۔ ان کے عزائم فرعونی عزائم نہیں تھے ۔ ہر جگہ انسانیت دم توڑ رہی تھی ۔ مگر انسانیت کا جوہر ابھی چند انقلابیوں کی روح میں زندہ تھا ۔

صبح نمودار ہوئی ۔ پرچم لہرائے ۔ ترانے گائے گئے ۔ ناصر زندہ باد کی آوازیں فضا میں گونجیں ۔

فاطمہ اسی طرح کھانستی رہی ۔ فضیل کی یاد اسے اسی طرح تڑپاتی رہی ۔

"سلیمان ! کیا ابھی تک کوئی تار نہیں آیا ۔ فضیل ! تم آ کیوں نہیں جاتے ؟ فضیل ! کیا تم مجھے بھول گئے ۔ فضیل بیٹا ! تمہاری ماں تمہارا انتظار کر رہی ہے ۔ ایسا نہ ہو تمہارے آنے سے پہلے ہی وہ دنیا سے چل بسے ....."

" سلیمان ! میرا خیال ہے کہ فضیل گرفتار ہو گیا ہوگا ۔ کرنل ناصر کے سپاہیوں نے اسے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی ہوں گی ۔ فضیل ! تم کسی تاریک کوٹھری میں بند پڑے ہو گے ، بیٹا ، تمہیں

کچھ اوڑھنے بچھانے کے لئے ملا بھی یا نہیں۔ بیٹا! تم نے کچھ کھانا بھی کھایا یا نہیں۔ تم بھوکے ہوگے۔ بیٹا تمہیں اپنی ماں یاد آرہی ہوگی۔ تم مجھ سے لپٹ جانے کے لئے بے تاب ہوگے بیٹا ..... آجاؤ۔ تم میرے پاس آجاؤ۔ دوڑ کر چلے آؤ۔ مگر بیڑیاں تمہارے پیروں کو روکے ہوئے ہیں۔ لوہے کی سلاخیں راستہ میں حائل ہیں۔"

"سلیمان! کیا میرا بیٹا واپس نہیں آسکتا۔؟"

"آسکتا ہے!"

"وہ کیسے؟ بتاؤ جلدی بتاؤ ـــــ ارے تم خاموش کیوں ہو، تم بھی رو رہے ہو... سلیمان کیوں میرا بیٹا خیریت سے تو ہے۔؟"

"ہاں خیریت سے تو ہے، مگر گرفتار ہو چکا ہے، ابھی کچھ دیر پہلے تار آیا تھا۔"

"گرفتار ہوگیا؟..."

"ہاں گرفتار ہوگیا!"

"کیا وہ واپس نہیں آسکتا؟"

"نہیں...! ہاں آسکتا ہے مگر...!"

"مگر.... مگر کیا کہتے کیوں نہیں ..... خاموش کیوں ہو؟"

"آسکتا ہے مگر اسے معافی مانگنی پڑے گی۔"

"معافی؟ وہ کیسی؟......"

"ہاں .... یہ وعدہ کہ اخوان سے اب میرا کوئی تعلق نہ ہوگا!"

"اخوان سے میرا...... میرا کوئی تعلق نہ رہے گا..... نہیں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ فیصل۔ تم فاطمہ کے بیٹے ہو۔ فیصل تمہاری رگوں میں فاروقی خون دوڑ رہا ہے۔ تم معافی کبھی نہیں مانگ سکتے۔ کرنل ناصر تمہیں ذبح کر ڈالے مگر بیٹا... مگر بیٹا تم معافی نہ مانگنا..."

"اُف کھانسی کا دورہ۔ ہائے یہ کھانسی شاید موت کا پیغام لیکر آئی ہے۔ پروردگار میری ایک تمنا ہے۔ مرنے سے پہلے اپنے چاند کو دیکھ لیتی... مگر آہ... آرزو پوری نہ ہوگی

اسے کھانسی کے دورے کتنے شدید ہوتے ہیں۔ خون۔۔۔پھر خون آئے گا۔ سلیمان خدا مجھے تھام لو۔"

کھانستے کھانستے فاطمہ کا جسم بے جان سا ہو گیا تھا۔ ہڈیوں کا کمزور ڈھانچہ۔ چارپائی پر پڑا ہوا زندگی کے آخری لمحوں کو طے کرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ سلیمان کی مغموم نگاہیں اس کے زرد سے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو زندگی کی لذتوں سے نہ جانے کب کا محروم ہو چکا تھا۔ اس نے دیکھا فاطمہ کے ہونٹ ہلنے لگے۔ اس کے چہرے پر تبسم کی کچھ کیفیتیں پیدا ہونے لگیں۔ مسکراکر اس نے آنکھیں کھولدیں۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم اس وقت کچھ سو گئی تھیں۔ اس وقت تم نے کچھ خواب دیکھا ہے"

"ہاں ایک خواب دیکھا تھا"

"تم نے دیکھا ہوگا کہ فضیل دولہا بنا ہوا سامنے کھڑا ہے"

"نہیں سلیمان!"

"تو شاید یہ دیکھا ہوگا کہ تم اپنی بہو کو ہار پہنا رہی ہو"

"نہیں سلیمان، یہ بھی نہیں"

"تو پھر کس بات پر مسکرائیں"

"سلیمان! میں نے دیکھا۔۔۔میں نے دیکھا۔۔۔"

"نہیں میں اب نہیں روؤنگی، یہ میرے خوشی کے آنسو ہیں۔۔۔ہاں تو سلیمان! میں نے دیکھا ـــ میرا فضیل! پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوا ہے۔

"وہ کھڑا مسکرا رہا ہے۔ کرنل ناصر کے سپاہیوں نے جیسے ہی اسے پھانسی دی، فرشتوں نے بڑھکر اسے"

"فرشتوں نے بڑھکر اسے لپٹا لیا۔۔۔"

"ہاں سلیمان! فرشتوں نے بڑھکر اس کی پیشانی چوم لی!"

"بڑا اچھا خواب تھا۔۔۔!"

"ارے فضیل تو آگیا ـــ فاطمہ ـــ فاطمہ ـــ تمہارا فضیل آگیا"

"میرا فضیل آگیا ؛ میرا بیٹا آگیا ؟؟ ـــــ بیٹا جیتے رہو مگر تم کیسے آگئے ۔ بیٹا ! کیا تم نے معافی مانگ لی ؟ کیا تم نے اخوان سے رشتہ کاٹ لیا ؟ بیٹا کیا تم فاروق کو بدنام کروگے فاطمہ کبھی تمہارا دودھ نہ بخشے گی ـــــ بیٹا تم واپس چلے جاؤ، جاؤ ہتھکڑیاں، بیڑیاں پھر پہن لو بیٹا۔

" امی ! میں نے معافی نہیں مانگی ۔ میں صرف ایک گھنٹہ کی اجازت لے کر آیا ہوں ۔ باہر سپاہی کھڑے ہیں "

" بیٹا فضیل ! تم نے معافی نہیں مانگی ... سچ کہتے ہو بیٹا ! ـــــ آؤ ـــــ آؤ ۔ پھر فاطمہ کے گلے سے لگ جاؤ ۔ ہاں اب فاطمہ کے سارے ارمان پورے ہو گئے ۔ بیٹا ! تم نے اپنی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا "

" آؤ بیٹا ! اپنی ماں سے لپٹ جاؤ "

" آہ کھانسی ـــــ اُف ! کھانسی زندہ نہ رہنے دے گی "

آہ خون . . . . سلیمان ! ذرا مجھے تھام لو . . . . اُف بیٹا ! اب میں جا رہی ہوں میں جا رہی ہوں ، میں جا رہی ہوں . . . . "

کلمہ پڑھتی ہوئی فاطمہ، زندگی کے آخری لمحے طے کر چکی تھی ۔ اس کا پرسکون چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے سارے ارمان پورے ہو چکے ہیں ۔

ـــــ اب اسے کسی بات کی تمنا نہیں ہے ۔

زاہد قادری

عقل میں جب فتور آتا ہے
آدمی کو غرور آتا ہے
اس کے جلوؤں کی حد نہیں کوئی
وہ نظر دور دور آتا ہے
وقت سے ہے فرار ناممکن
وقت سب پر ضرور آتا ہے

تھکی ہوئی چیخ

سید عبدالباسط انور

" وقت کوئی محلول میں ٹھہرا ہے جو ہماری اس چھوٹی سی کٹیا میں ٹھہر جاتا —"!!
زندگی وقت کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی یہاں تک پہنچتی ہے - کبھی بھنور کے جانکس لمحات، کبھی ساحل پر اطمینان کی سانس، کبھی تیز بہاؤ کبھی گہرے پانی کا سکون، بڑا ہی عجیب سا محسوس ہوتا ہے - یہ سب کچھ کیا ہے —! ہکیا انکی حقیقت ہے —! ؟ یہ خواب تو نہیں جو گہری نیند میں دکھائی دیتا رہا —! ؟
یا پھر حقیقتوں کے سخت پتھر جو جسم کے ہر حصہ پر لگتے رہے اور ہر چوٹ - درد کی اک نئی دینا بساتی رہی —!
یہ سب کچھ کیا ہے - میرا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا - ایسا ہی لگتا ہے مجھے - ایسا کیوں نہیں ہو جاتا کہ میں سو جاؤں —— ایک ایسی گہری نیند جس سے کوئی جگانا بھی چاہے تو میں جاگ نہ سکوں اس کے جگانے کی آس ٹوٹ کر میرے مکمل وجود کو ڈھانپ ہی لے پھر میری سوچ کی طاقت سلب ہوگئی - میری متحرک آنکھوں کے چمکدار کٹورے مجھ سے چمٹے ہوئے ماحول کے وحشی لمحات کے اندھیاروں کو اپنے اندر جذب کرتے کرتے نامانوس جنگل کی اندھیری گپھاؤں جیسے بن گئے — میری آواز —!

ڈیڈی نے میرے سر پر
ہاتھ رکھا -
" بیٹی ! میری عزت
اب تمہارے ہاتھ ہے"

کرب بے کراں کا شاہکار —— ! سر پر منڈلاتے اجلے سورج کی تپش میں پیاس پیاسی، بے رحم سرابوں کو للکارتی نہ جانے کب خاموش چیخ کی صورت سنگلاخ وادیوں میں ابھر کے ڈوب گئی - اور اگر ایسے میں رات کی ملکہ کو یہ معلوم ہو بھی جائے تو کیا حاصل کہ اسکی سلطنت میں ایک اور تلوار ٹوٹ کر بکھر گئی -
ڈیڈی مجھے یاد آتا ہے — وہ آپکی گہری خاموشی - بات کرتے کرتے کہیں گم ہو جاتا - ممی سے ذرا ذرا سی بات پر الجھ پڑنا اور ممی کا گھنٹوں اپنے آنچل کو آنکھوں کے سینے سے لگائے روتا یہاں تک کہ انکی سرخ آنکھوں کی سوجن سے آپ بھی پریشان ہو جاتے اور کہتے —— سنو اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں ! پھر بھی جتنی کوشش مجھ سے ہوتی ہے کرتا ہوں —— اس کے باوجود بھی کوئی بات بنتی نظر نہ آتی —— میری آہٹ پر آپ کا چونک جانا، ادھر ادھر کی باتیں کرنا —— آپکی وہ مایوس

راتوں کی صبح وہ گمبھیر غم میں ڈوبی ہوئی طنزیہ مسکراہٹوں والی شام، وہ بے سکون لمحے آپ کے الجھے الجھے بال، ملگجے کپڑے، سلیقہ سے سجائے ہوئے چھوٹے سے گھر کی خوشبو آم کے پیڑ سے لٹکا ہوا طوطے کا خوبصورت پنجرہ ـــ "دیکھو دستک ہوئی ہے، کوئی مہمان آیا ہے ـــ" طوطا اتنا ہی جانتا تھا، ہر صبح و شام یہی دہراتا ہمارا یہ چھوٹا سا مکان یہ چھوٹا سا خاندان کسی مہمان کے آنے کی چاہ میں کب تک چشم براہ رہتا۔! ہر رات تھک کر سو جاتا۔ کبھی کبھی آدھی رات کے بعد آپ کا بے چینی سے صحن میں آجانا۔ میری جاگتی آنکھوں میں بھی اکثر بے شمار خواب ٹہلنے آجاتے، گرم لحاف میں دبکی ہوئی میری آنکھیں یہ منظر یونہی دیکھ لیا کرتیں لیکن کبھی آپ کے پاس آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مجھے اندازہ نہیں کہ ممی کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ ہاں مجھے

اتنا ضرور یاد ہے کہ شام کے دھندلکوں کے دبیز ہونے سے پہلے میری سہیلیاں میرے آنگن میں خوبصورت چڑیوں کی صورت چہچہانے لگتیں۔ ان کے ساتھ گھنٹوں کتنے ہی غیر اہم موضوعات پر بڑی سنجیدگی، انہماک اور دلائل کے ساتھ گفتگو ہوتی۔ پھر رات کا ابتدائی حصہ، کاپیوں کتابوں کی جھرمٹ میں گذر جاتا ـــ ان دنوں جانے کیوں آپکو اتنی فکر لاحق ہوگئی تھی کہ میرا بھی ایک گھر بس جائے اسکی ضرورتوں کی تکمیل کیلئے آپ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی چیز خرید لاتے مجھے بہت دیر تک سمجھاتے رہتے کاش وہ منظر نہ بدلتے ـــ!! آج میں جس طرح ذرہ ذرہ ٹوٹ کر بکھر رہی ہوں۔ جس طرح میری روح اذیت ناک لمحوں کا ناقابل برداشت بوجھ اٹھائے صحرا صحرا بھٹک رہی ہے اگر آپ سامنے ہوتے تو بالکل برداشت نہ کرتے۔ انسانوں کا یہ دلدل ـــ ایک قدم جتنی قوت سے اٹھانا چاہتا اسی تیزی سے دوسرا قدم پھنس جاتا ہے۔ انسانوں کا یہ جنگل ـــ! پیلے پتوں کے نیم مردہ جسم زہریلی ٹہنیوں کے زخموں سے ابلتے ہوئے سوکھے، بدرنگ خون کی بوندیں اپنے کئے ہوئے داغدار لبوں پر مسلتے ہوئے۔ اپنے اندر لگی ہوئی خوفناک آگ کو باہر کے جھونکوں سے شعلوں کا رقص پیش کرتے ہیں۔ یہاں کوئی حسن نہیں صرف ہوس ہے۔ روح بے قیمت اور جسم کروڑوں کا جذبات سے کوئی واسطہ نہیں اداؤں پر جان قربان ہوتی ہے۔

میں اپنے آپکو کیسے ظاہر کروں آپ پر ـــ! کیسے بتلاؤں آپکی وہ اکلوتی بیٹی کس مصیبت کے جال میں پھنسی ہے کہ آہیں حلق میں گھٹ کر رہ گئیں۔ ہاتھ پیر کی حرکت زنجیروں کی جکڑ میں ہے۔ سب کچھ ہے لیکن کچھ نہیں۔ ساری آسائشیں میسر پر سکون نہیں۔ چہرہ سنوارنے کا بیشتر

خزانۂ تخیل کی زینت بنا ہے لیکن ضمیر کا چہرہ اتنا زخم زخم کہ خون کا رسنا کم نہیں ہوتا ۔ بے کیف زندگی کے داغ کس طرح چھپتے نہیں ـــ !!

وہ پہلی رات جو ایک نئی زندگی بخشتی ہے ـــ اس رات سہیلیوں نے کہا تھا خوب باتیں ہوتی ہیں خوب باتیں بنتی ہیں لیکن مجھے کیا ہوا پتہ نہیں ۔ قربتوں کے کناروں پر دوریوں کا سیلاب امنڈ سا تھا ـــ ہم ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ـــ صرف "اللہ" جیکہ سکتے تھے ـــ اس دن ڈیڈی اور ممی بے حد خوش تھے ۔ میرے ہاتھ بھی مہندی سے دمک رہے تھے ۔ خوب دھوم مچی رات ساری رنگین روشنیوں سے جگمگاتی رہی ۔ صبح کو طوطا خاموش رہا ـــ مہمان گھر میں موجود تھا میری آواز پھر بھی کسی ساحل پر گم تھی ڈیڈی نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا "بیٹی میری عزت اب تمہارے ساتھ ہے ـــ" اک دم پھٹی ہوئی آپ کی جھلستی آنکھوں کے لامحدود ریگزاروں میں 'فلک بوس ریت کے پہاڑ آندھیوں کی ٹھوکر دل سے ڈھیر ہو گئے ۔ کناروں پر کھڑے کوہساروں سے آواز کی تڑپ کی بازگشت ٹکرا کر تھم گئی ۔ اجنبی ماحول میں جا کر مجھے بھروسہ ہے میری بیٹی اپنے باپ کے خون کا رنگ میلا نہ ہونے دیگی ۔

ایرپورٹ پر میری آنکھیں خشک ہو گئیں ـــ وہ بھی ہر ایک کو نظر سے دلاسہ دیتا رہا ۔ ہماری زندگی کا نیا سفر زمین اور آسمان کے درمیان سے گذر کر شروع ہوا ہے ۔ چند ہی گھنٹوں بعد اک نئی دنیا میں قدم رکھا تھا ۔

ہر طرف خوشحالی ۔ دولت کی لہریں ہر گذرنے والے کے قدم چوم رہی ہیں ـــ ہر سو فراوانی ۔ جہاں کمسنی نے شوہر کا ہاتھ تھاما تھا ۔ جہاں چھوٹی چھوٹی شرارتیں معصومیت کا دامن پکڑ کر لال مٹی سے لیپے ہوئے صحن میں آج بھی پھدکتی پھرتی ہونگی ـــ جہاں کی خوشبو سے والہانہ انس تھا ـــ اس گھر سے بہت دور ـــ ایک نیا گھر بسانا تھا ـــ نئی امنگوں آرزوں کی راہ ہموار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا ۔ تو آندھیاں چلیں ـــ کہ بجلیاں کوندیں ـــ کہ پتھر برسنے لگے ۔ راستہ بھٹک گیا ۔ اپنے آپکو بہت تلاش کیا ـــ اور جب اپنے کو پایا ' حاصل کیا تو دیر ہو چکی تھی جو کچھ تھا سو لٹ گیا ـــ وحشیوں نے شب خون مارا کہ قافلہ بکھر کر بے سروسامان ہو گیا ـــ اور ایسے میں رنگ نہ چاہتے ہوئے بھی بدلتے لگے ۔ رنگ پیرا اور رنگ غالب آنے لگے ـــ تو

ڈیڈی میں اب آپکو یہ کیسے یقین دلاؤں کہ میں کتنی مجبور اور بے بس ہوں ـــ ! بے روح کھلونا ــــ بے جان لاش ـــــ میری آواز آج بھی کسی ساحل پر گم ہے ـ میرا جسم دینار سے بھری سرخ تھیلی کی مانند منتقل ہوتا رہا ـــ میں تو حرف آشنا ہی کرسکی ـــــ بے بس ولاچار ـ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر گھر کی چھت کو ٹکٹکی لگائے پتھرائی آنکھوں سے کسی ساحل پر گم اپنی بے شمار مہیب چیخوں کا عکس دیکھتی رہی ـ

بڑی مشکل سے ـــــ اپنی ساری قوت جمع کر کے آپکو شاید آخری بار ـــ یہ بتانے کی ہمت اگر کروں تو کیا حرج ہے ـ

جب آپ کے گھر سے چلی تھی اس وقت آپ کا ایک داماد میرے ساتھ تھا ـ اور ڈیڈی آج آپ کو اپنا ساتواں داماد مبارک ہو ـــ !!!

غزل

ناز نیلوری

میں تنک ظرف سہی دیکھ تو کیا دیتا ہوں
دوست تو دوست عدو کو بھی دعا دیتا ہوں

جب کبھی آتی ہے گلستاں میں خزاں دیدہ بہار
خونِ دل سے روشِ دل کو سجا دیتا ہوں

گیسو تو پروردۂ شب ہائے گراں ہوں لیکن
مہر کو تاب ستاروں کو ضیاء دیتا ہوں

نازؔ بگڑے ہوئے حالات کے آئینے میں
میں زمانے کے خد و خال دکھا دیتا ہوں

محروم تسلی

انور سہیل

ھم ہوٹل ہیرالڈ میں بیٹھے ہوئے تھے ڈیوڈ جونز آج پھر بے تحاشہ پیتا چلا جا رہا تھا میں نے اسے روکنا چاہا تو وہ مجھ پر برس پڑا۔

"عزیز! کیا تم مجھ کو تھوڑی دیر کیلئے بھی سکون پاتا ہوا دیکھ نہیں سکتے۔ عزیز! ابھی ایک چیز تو ہے جو مجھے جزوی طور پر کچھ دیر کیلئے سکونِ قلب عطا کرتی ہے۔ میں پی کر مدہوش ہو جاتا ہوں۔ عزیز۔ تم کیا جانو کہ بے سکونی کیا ہوتی ہے؟ انسان مال و دولت رکھ کر بھی سکون نہیں پا سکتا عزیز ہرگز نہیں میں نے اس بے سکونی سے اس بے چینی کی کیفیت سے نجات پانے کے لئے ڈان میں چھلانگ لگانی چاہی تھی۔ لیکن برا ہو ان لمحات کا جب تم نے مجھے دیکھ لیا اور مجھے مرنے سے بچا لیا تم نے تو اپنی دانست میں مجھے بچا کر احسان کیا لیکن میں پھر اسی بے چینی و بے سکونی کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ جس سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ بتاؤ عزیز! آخر تمہیں کیا ملا مجھے بچا کر تم مجھے چین و سکون تو نہ دے سکے جس کا میں خواہشمند ہوں۔ اور اب میں تھوڑی دیر کیلئے سکون حاصل کرنا چاہتا ہوں تو تم اس سے بھی روک رہے ہو۔ آخر کیا بات ہے عزیز تم نے مجھے پھر بے چینی و بے سکونی میں مبتلا کر دیا ہے" وہ اپنی رو میں کہتا جا رہا تھا اور میرا ذہن مجھے ہوٹل کے اس میز سے اٹھا کر کہیں اور لئے جا رہا تھا۔

یہ مئے تھی جونز کیلئے سرچشمۂ سکون
پالیا تھا
دل سینہ بے نور
میں
محروم
تسلی

آج سے دو ماہ پہلے کے واقعات پردہ ذہن پر فلم کی مانند گھومنے لگے۔

اتوار کی ایک حسین شام تھی دن بھر گھر میں کیرم و شطرنج سے دل بہلانے کے بعد میں ڈان کے کنارے بنے ہوئے پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ سورج کی زرد اور سنہری کرنیں ڈان کی اٹھکیلیاں کھاتی ہوئی شوخ و چنچل موجوں سے بغلگیر ہو رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں اب ہم بارہ گھنٹے بعد دوسری صبح تم سے ملیں گے۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مہندی کی باڑھوں کو ہلا رہے تھے دوشیزائیں آپس میں چھیڑ چھاڑ کرتی پھر رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے تتلیوں کے پیچھے دوڑتے پھرتے تھے۔ نوجوانوں کے غول ماحول کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دنیا کے تازہ ترین حالات پر بحث کر رہے تھے انہیں میں میں بھی ایک تھا۔

ناگاہ میری نظر ڈان کے کنارے بنے ہوئے پارک کے اس سنسان حد پر پڑی جہاں پارک کی ریلنگ کچھ ٹوٹی ہوئی تھی۔ تیز رو گہرا دریا اس مقام سے ایسا نظر آرہا تھا جیسے کوئی خونخوار درندہ منہ پھاڑے شکار کی گھات میں ہو۔ ایک نوجوان تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں ہیں میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور اسی طرف دوڑ گیا جدھر وہ نوجوان جا رہا تھا۔ لیکن میرے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ کچھ ہو گیا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ نوجوان دریائے ڈان میں کود چکا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کے پیچھے چھلانگ لگادی۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں اسے کنارہ پر کھینچ لانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں اسے اٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ فوری ڈاکٹر کو بلوایا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آگیا تھا۔

میرا تجسس اپنی انتہا کو پہونچ رہا تھا مختلف سوالات ذہن میں ابھر رہے تھے۔ "یہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیوں خودکشی کر رہا تھا۔؟"

میں نے سوالات کی بوچھار کردی۔ اس نے بتایا کہ اسکا نام ڈیوڈ جونز ہے "جونز۔۔۔۔۔!" ایکبارگی میں چونک پڑا مجھے یاد آیا کہ مسٹر ہیری جونز شہر کے بڑے رئیس آدمی تھے اور اپنی موت سے پہلے انہوں نے اپنی کروڑوں کی جائیداد اپنے اکلوتے بیٹے کے نام کردی تھی۔

اور میں پوچھ بیٹھا کیا تم مرحوم ہیری جونز کے اکلوتے بیٹے ہو؟" اس نے کہا "ہاں تو وہ بدنصیب میں ہی ہوں" بدنصیب ــــ" ؟ لفظ بدنصیب نے مجھے متحیر کردیا۔ " تمہارے پاس تو کروڑوں کی دولت ہے۔ دنیا بھر کی آسائش تمہیں میسر ہے پھر بھی تم بدنصیب ہو؟ تم خودکشی کیوں کرنے والے تھے؟ آخر کیوں؟ خودکشی تو وہ کرتے ہیں جو اپنے پاس ڈگریوں کی ایک لمبی فہرست رکھتے ہوئے بھی بیروزگار ہوں۔ تمہارے پاس تو بے اندازہ دولت ہے پھر بھی تم نے خودکشی کرنا چاہی۔ تعجب ہے؛ اس نے کہا " مسٹر کیا تم دولت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہو؟ دولت انسان کو آرام و آسائش

تومہیا کر سکتی ہے سامان عشرت تومہیا کر سکتا ہے لیکن سکون قلب نہیں دے سکتی ۔ پیسے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے لیکن سکون قلب نہیں ۔ میں نے سکون کی تلاش میں ہر کام کیا ۔ دن ہوٹلوں میں راتیں کلبوں میں گذار دیں ۔ پھر جنسیات میں پناہ ڈھونڈنی چاہی لیکن بے سود ہر جگہ میں ناکام رہا۔ سکون قلبی مجھے کہیں نہیں ملا ۔ آخر ایک دن مجھ سے ایک شخص ملا اس نے مجھے بتایا کہ "خودکشی تو تمہارا پیدائشی حق ہے" اسے استعمال کرو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے چینی و بے سکونی سے نجات پا جاؤ اور میں بے سکونی سے دور ہونا چاہتا تھا لیکن تم نے مجھے بچا لیا آہ ۔ مجھ پر تم نے بہت بڑا ظلم کیا"

بس اسی روز سے وہ اور میں ایک دوسرے کے ساتھی تھے ۔

اچانک ایک جھٹکا کہ ہوا میں چونک کر ماضی سے پھر حال کی دنیا میں پلٹ آیا ۔ دیکھا تو ڈیوڈ کی آنکھیں نشہ سے بوجھل تھیں ۔ شراب کا پیالہ نیچے گر کر ٹوٹ چکا تھا اور وہ خود کرسی پر مدہوش پڑا تھا ۔ میں سوچنے لگا کہ ڈیوڈ کی اس بے سکونی کو کیسے دور کروں کیسے اسے سکون قلبی حاصل ہو ۔ میں اٹھا ڈیوڈ کو سہارا دیکر باہر لایا اسے ایک ٹیکسی میں سوار کرایا ڈرائیور کو پتہ بتا دیا ۔ مجھ پر بس ایک ہی دھن سوار تھی وہ یہ کہ کسی طرح ڈیوڈ کو بے سکونی کی کیفیت سے نجات دلائی جائے اچانک نزدیکیں سے " یا ایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم " کی آیات قرآنی کانوں میں رس گھولنے لگیں ۔ عشاء کی اذان ہو رہی تھی اور میں نے ٹیکسی قریب اسلامک بک سنٹر لے رکھے ۔ اٹھایا سے ریکارڈ کی پیٹ جونز کے لئے سرچشمہ سکون وامن پالیا تھا ۔ اور اسی سرچشمہ (قرآن مجید) کا انگریزی ترجمہ لینا چاہتا تھا جس میں اللہ نے ہمیشہ ہمیشہ کا سکون رکھ دیا ہے ۔ اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اطراف کا ماحول پکار پکار کر کہہ رہا ہو ۔ سہ

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی

عزیز ناگپوری

ملیں اہل زمانہ چاہے کتنی ہی محبت سے
دلوں کا فاصلہ پھر بھی دلوں کے درمیاں ہوگا
وفا کے نام پر ہم نے گذاری زندگی اپنی
نجانے اور ابھی کب تک ہمارا امتحاں ہوگا

ڈاکٹر بیگ احساس

پرانی بستی اور نیا شہسوار

وہ دیکھو فضا میں دھول اڑ رہی ہے شاید وہ آرہا ہے" چوتھے کردار نے اچانک ہی خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

وہ سب اسی سمت دیکھنے لگے۔ کچھ دیر سناٹا چھا گیا۔

" نہیں شاید دھواں ہے" چوتھے کردار نے مایوسی سے کہا۔

"کیا تمہیں دھویں اور دھول میں کوئی فرق نظر نہیں آتا"؟ پہلے کردار نے اکتا کر کہا۔

" میری نظریں دھندلا گئی ہیں" چوتھے کردار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا" لیکن اس بار میں نے ٹاپوں کی آواز بھی سنی تھی"

"ٹاپوں کی آواز" وہ سب استہزائیہ انداز میں ہنس پڑے۔

" تمہارے کان بج رہے ہیں، کیا تمہیں اب بھی امید ہے کہ وہ شہسوار آئے گا؟" دوسرے کردار نے پوچھا۔

" امید؟ بھائی میرا تو ایقان ہے اس پر کہ وہ ضرور آئے گا" چوتھے کردار نے کہا۔

" پہلے بھی وہ ایسی ہی ایک بستی میں پہنچا تھا جس کے گھروں پر چھت نہیں تھی۔ ہماری بستی کے گھروں سے بھی چھت غائب ہے۔ درو دیوار شکستہ ہیں۔ تو تم ہی بتاؤ وہ اب نہیں آئے گا تو پھر کب آئے گا"؟ چوتھا کردار بولا۔

" لیکن یہ تو صدیوں پہلے کی بات ہے وہ شہسوار تو مشرق سے لے کر مغرب تک ساری دنیا کا حکمران تھا۔ خدا نے اسے اتنی طاقت دی تھی کہ وہ بُروں کو سزا دے اور بھلوں کیساتھ نرمی سے پیش آئے۔ لیکن اب ایسا ممکن کہاں؟ برسوں سے ایسا نہیں ہو رہا ہے اور اب تو جو بھی سوار یہاں آتا ہے اسے تم نجات دہندہ سمجھ لیتے ہو" دوسرے کردار نے کہا۔

کیا ایسا سمجھنے والا میں اکیلا ہوں؟" چوتھے نے پوچھا۔

" نہیں" انہوں نے گردن جھکا کر کہا" ہم سب ہی اس کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور پھر وہ

پانی کی اس حد کو پار کر کے کہیں گم ہو جاتا ہے"

فضا میں پھر سناٹا چھا گیا ۔ ایک لکڑی چٹخی اور ہلکا سا شعلہ اٹھا ۔

" آخر کب تک ہم اس طرح اجڑی ہوئی بستی کا سوگ مناتے رہیں گے" تیسرے کردار نے کہا ۔

کسی نے جواب نہیں دیا ۔

" میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہ بستی چھوڑ دوں گا" دوسرے کردار نے کہا تیسرا کردار تمسخرانہ انداز میں ہنسا

" تم کیوں ہنسے اس طرح ؟" دوسرے کردار کو غصہ آ گیا ۔

" پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہ جگہ چھوڑنا کیوں چاہتے ہو ۔ تیسرے نے کہا ۔

" کیا مطلب ہے تمہارا ؟"

" یہی کہ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں سکون و عافیت ہو ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اس پار انہوں نے پانی کی حد کے اس پار بھی حملہ کیا تھا" تیسرے نے کہا ۔

" ہم سب جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن یہ بھی ہوگا" پہلے کردار نے کہا" وہ کئی دنوں سے جلتے ہوئے تیر اکٹھا کر رہے تھے"

" ہم نے محافظوں سے کہا بھی تھا کہ وہ ہم پر تیر برسائیں گے اور ہماری بستی کو جلا ڈالیں گے" دوسرے کردار نے غصے سے کہا ۔

" ہاں لیکن جواب یہی دیا گیا کہ محافظوں کی موجودگی میں وہ اپنے تیر کمانوں پر چڑھا نہیں سکیں گے ـــــ انہیں اس کا موقع ہی نہیں دیا جائے گا ـــــ رہی مشعلوں کی بات ! وہ تو ان کی پرانی رسم ہے" پہلے کردار نے زہریلے انداز میں کہا ۔

" ہاں یہ محافظوں کی سازش ہے کہ وہ ہماری بستیوں میں سے گذرتے ہیں" دوسرے کردار نے کہا ۔

" وہ کہتے ہیں ہم میں سے کسی نے مشعل چھین کر ان پر پھینکی تھی" پہلے کردار نے کہا ۔

" کس میں ہمت ہے اتنی ؟" ہم تو اپنے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے اور اس وقت تک باہر نہیں آئے جب تک وہ باجوں کا شور دب نہیں گیا ۔" دوسرے کردار نے کہا ۔

"لیکن الزام یہی ہے کہ ہم میں سے کسی نے ان پر مشعل کھینچ ماری تھی" پہلے نے کہا۔

"پوچھ لو ساری بستی کے لوگ یہیں ہیں" دوسرے کردار نے کہا۔

تم کچھ بتا سکتے ہو" تیسرے کردار نے اس شخص سے پوچھا جو بہت موٹا تھا۔

"نہیں ایک بار میں اپنے گھر کے دروازے جلا چکا ہوں۔ اس کے بعد میں نے ہاتھی دانت کے مضبوط دروازے لگا لئے"۔

"کم سے کم اس پر کوئی جلتا ہوا تیر تو اثر نہیں کر سکتا" موٹا شخص اپنی بات ختم کرکے ہانپنے لگا۔

"تم کیوں آئے ہو یہاں" پہلے کردار نے غرا کر کہا۔

"یہ دیکھنے کیلئے کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو"

"جاؤ آرام سے اپنے مضبوط دروازے بند کرکے سو جاؤ" پہلے کردار نے طنز کیا۔

"کیا بکواس ہے؟" موٹا شخص جھلا گیا۔

"تمہیں بات کرنے کی تک تمیز نہیں ہے"۔

"اپنی تمیز اپنے پاس رکھو۔ بستی پر جب کبھی افتاد آتی ہے تم دروازے بند کر لیتے ہو۔ ساری مصیبت تو ہم جھیلتے ہیں۔ پچھلی بار بھی ہم نے اپنے کئی ساتھی کھو دئیے"۔

"جاہل ہو تم سب —— اسی طرح مرو گے"

موٹا شخص بڑبڑایا اور اپنے گھر چلا گیا۔

اس نے بڑے زور سے ہاتھی دانت کا دروازہ بند کیا۔ فضا تھرا گئی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔

"مجھے نفرت ہے ان ہاتھی دانت کے دروازے والوں سے" پہلے کردار نے کہا۔

"کیوں — کیا اس لئے کہ تمہارے پاس ایسا دروازہ نہیں ہے؟" دوسرے کردار نے طنز کیا۔

"نہیں بلکہ اس لئے کہ جس وقت ہم سب چیخ رہے تھے وہ اندر بیٹھے کسی کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے جیسے اس بستی سے اس زمین سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے"۔

"بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب وہ شہسوار آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

"میرا خیال ہے وہ آ رہا ہے" چوتھے کردار نے فضا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی لیکن وہ ان کا پانچواں ساتھی تھا ۔
"کیا خبر ہے ؟" چاروں نے پوچھا ۔ دوسرے لوگ بھی متوجہ ہو گئے ۔
"میں چھپتے چھپاتے پانی کے اس پار سے آرہا ہوں"۔ پانچویں کردار نے ہانپتے ہوئے کہا۔
"پھر ؟"
"میں نے لاشوں کا ڈھیر دیکھا ہے"۔
"ہر نکڑ پر لاش ہے" پانچویں نے کہا۔
"کس کی لاشیں ہیں ، ہماری یا ان کی"۔
"نہیں بھئی ـــــ میں یہ نہیں بتا سکتا ۔ لیکن وہ انسانوں کی لاشیں ہیں"۔ پانچویں نے کہا۔
"کیا ان کے جسموں میں جلتے ہوئے تیر پیوست ہیں" پہلے کردار نے کہا ۔
"ہاں ـــــ اکثر لاشوں کے جسموں میں جلتے ہوئے تیر پیوست ہیں" ـــــ پانچویں نے کہا ۔
تم لوگ بھی کسی محفوظ جگہ پہنچ جاؤ یہاں کیوں جمع ہو"۔
"ہم شہسوار کا انتظار کر رہے ہیں"۔ چوتھے کردار نے کہا ۔
"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ آئے گا ؟" پانچویں نے مضمحل آواز میں پوچھا ۔
"ہاں یقین ہے"۔ چوتھے کردار نے کہا ۔
"فرض کرو وہ آگیا اور اس نے ہم سے کہا کہ لاؤ لوہے کے ٹکڑے میرے پاس لاؤ ۔ پھونکو اس کو یہاں تک کہ وہ آگ ہو جائے اور اوپر سے اس کے گلا ہوا تانبا ڈال دو ۔
تب کیا کرو گے ؟ پانچویں کردار نے کہا ۔
"ہاں پہلے بھی اس نے یہی کیا تھا ۔ اس نے اوّل لوہے کے بڑے بڑے تختے بنائے تھے اور ایک پر ایک رکھتا چلا گیا تھا ۔ پھر تانبا پگھلا کر اس کے اوپر ڈالا تھا ۔ وہ سب مل کر ایک مضبوط پہاڑ بن گیا تھا"۔
دوسرے کردار نے پانچویں کردار کی تائید میں کہا ۔
"ہم مال جمع کریں گے" ؛ پہلے کردار نے جوش میں کہا ۔
تمہارے پاس ہے ؟"

پھر ایک سناٹا چھا گیا۔ صرف لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی بگولا اٹھتا تھا۔
نہیں میرے پاس نہیں ہے، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ اس ہاتھی دانت کے دروازے والے کے پاس بہت مال ہے۔"
"ہماری بستی میں کتنے ایسے لوگ ہیں؟"
"ہر تیسرے مکان کا دروازہ مضبوط ہے۔ اگر صرف ایک ہی مضبوط دروازہ والا چاہے تو اتنا ل فراہم کر سکتا ہے کہ ساری بستی کے گرد دیوار کھنچ جائے۔"
لیکن وہ ایسا نہیں کریں گے۔" پانچویں کردار نے کہا۔
"کیوں نہیں کریں گے!؟" پہلے کردار کو غصہ آ گیا۔
"اس لئے کہ جلتے ہوئے تیروں کا جتنا خطرہ تمہیں ہے۔ اتنا انہیں نہیں ہے۔ ان کے مکانوں کی دیواریں بہت اونچی ہیں اور دروازے مضبوط ہیں۔" پانچویں نے کہا۔
"کیا انہیں اس کا بھی خوف نہیں کہ جب ہمارے گھر پوری طرح جل جائیں گے تو پھر ان کی دیواریں بھی اس آگ سے کمزور ہو جائیں گی؟" دوسرے کردار نے پوچھا۔
"اسی خوف کے مارے وہ کبھی کبھی ہماری باتیں سننے چلے آتے ہیں۔"
"سب بے کار باتیں ہیں۔ کسی سے کوئی امید نہیں، بس اس شہسوار کا انتظار کرو۔ چوتھے کردار نے کہا۔
مجھے یاد آیا کہ شہسوار نے یہ بھی تو کہا تھا کہ مال میرے پاس بہت ہے، ہاتھ پاؤں سے تم بھی محنت کرو۔ کیا ہم سب محنت کرنے تیار ہیں؟ تیسرے کردار نے کہا۔
"محنت؟" نحیف کردار نے کراہ کے کہا اور اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔
"اسے خود پتہ نہیں کہ اسے کس سمت جانا ہے ——— وہ دیکھو کیسے لڑکھڑاتا ہے۔" پہلے کردار نے کہا۔ وہ سب اسے حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔
" مجھے ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔" چوتھے کردار نے کہا۔
تمہارے کانوں میں ٹاپوں کی آواز ہی گونجا کرتی ہے۔ پہلے کردار نے جل کر کہا۔
" اگر واقعی ٹاپوں کی آواز آ رہی ہے تو اب تک وہ کیوں نہیں آ گیا؟"

"جب سورج چشمے کے نیچے ڈوب جائے گا تب وہ آئے "۔ چوتھے نے کہا۔

پہلے کردار کا قہقہہ پوری فضا کو مرتعش کر گیا۔

"چپ رہو ـــــ خدا کیلئے چپ رہو" دوسرے کردار نے کہا "جب تم اس طرح ہنستے ہو تو میری روح کانپ جاتی ہے۔

"تمہاری روح بہت کمزور ہو چکی ہے۔ جاؤ اپنے گھر میں آرام کرو"

"کس گھر میں"؟ دوسرے نے اداسی سے کہا۔

ان سب نے شرمندگی سے چہرے لٹکا لئے۔

" جس وقت تمہارے گھر پر جلتے ہوئے تیر برسائے گئے تم نے احتجاج کیوں نہیں کیا؟"

پہلے نے کچھ دیر بعد کہا۔

"احتجاج؟ احتجاج کرنے والوں کو وہ زندہ نہیں چھوڑتے۔ کتنے چھوٹے چھوٹے بچوں تک پر انہوں نے رحم نہیں کیا"

دوسرے کردار نے اسی اداسی سے کہا۔

"تم جینا کیوں چاہتے ہو؟ پہلے کردار نے زہریلے انداز میں کہا۔

"کیا اس بستی میں ایسا کوئی نہیں جو میری حفاظت کرے" دوسرے نے سب کی طرف دیکھا

" اگر ایسا کوئی ہوتا تو میں کیوں شہسوار کا انتظار کرتا" چوتھے کردار نے دھیمی آواز میں کہا لیکن اسے سب نے سن لیا۔

"جس وقت وہ نیلا کم پانی کی اس لکیر کو پار کر کے ہماری بستی میں آیا تھا تو ہم نے سمجھا وہی نجات دہندہ ہو گا" پانچویں کردار نے کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی تھا۔ راتوں میں چھپ کر اور بھیس بدل کر وہ ہماری خبر لیتا تھا"

"پھر کیا ہوا"؟ کسی نے سوال کیا۔

"اسے سمجھایا گیا کہ اس طرح جاگتے جاگتے وہ نیند کو ترس جائے گا اور لوگ محافظوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیں گے" تیسرے کردار نے کہا۔

پھر وہ کبھی محل کی کسی آرام دہ خواب گاہ میں جا کر گہری نیند سو گیا" پہلے نے کہا۔

چنانچہ اس پار پانی کے اس پار بھی آگ لگی۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔
وہ کتنے مطمئن، کیسے بے نیاز تھے جیسے ان کا ہم سے ہماری بستی سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔
اب پتہ چلے گا انہیں" — دوسرے نے کہا۔
"لیکن اب کے جو شہسوار آئے گا وہ ایسا نہیں ہوگا — وہ سب ٹھیک کردے گا"
چوتھے کردار نے کہا۔
ٹاپوں کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔
"میں نہ کہتا تھا ——— وہ آرہا ہے" چوتھا خوشی سے چلایا۔
"واقعی ٹاپوں کی آواز تو صاف طور پر سنائی دے رہی ہے" وہ چونک پڑے۔
دھویں کے بادل چیر کر ایک شہسوار آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آسمان سے اترا ہو۔ اس کی سواری کا جانور بھی عجیب سا تھا۔
"وہ آگیا ——— دیکھو وہ آگیا، میں نہ کہتا تھا کہ وہ ضرور آئے گا" چوتھا ہذیانی انداز میں چلانے لگا۔
"کون ہو تم؟ کیوں اس طرح چلاتے ہو۔ شہسوار نے گرج کر کہا۔
"تم نجات دہندہ ہونا؟" چوتھے نے جیسے کہ اس کی آواز سنی ہی نہیں
"واپس جاؤ ——— اپنے گھر کو ——— کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایسے حالات میں کھلی جگہ کھڑا رہنا خطرناک ہوتا ہے، کوئی جلتا ہوا تیر تمہارے جسم کو چھید سکتا ہے۔
شہسوار نے کہا۔
"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ انہوں نے میرا گھر چھین لیا ہے" چوتھے کردار نے کہا
"کہاں رہتے ہو تم؟"
"اسی سرزمین پر ——— ؟"
"وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے تمہارا گھر چھین لیا ہے۔؟"
"تم نہیں جانتے؟ وہ لوگ آگ کے تیر چلاتے ہیں اور اچانک ساری بستی میں چھا جاتے ہیں" — چوتھے نے جواب دیا۔

وہ چاروں بھی شہسوار کے سامنے آ گئے۔

"کیا تمہارا بھی وہی غم ہے جو اس کا ہے"۔ شہسوار نے پوچھا۔

"ہاں!" پانچوں نے ایک آواز میں کہا۔

"اور کتنے ساتھی ہیں تمہارے، جو یہ چاہتے ہیں کہ انہیں ان آگ کے تیر برسانے والوں سے محفوظ کیا جائے"۔

"ساری بستی یہی چاہتی ہے" پانچوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے کل جب سورج کیچڑ اور چشمے کے بیچ سے نکلے گا تو میں دوبارہ آؤں گا ..... لیکن تم بستی کے سارے لوگوں کو اکٹھا کر لینا۔ میں تم لوگوں کی مدد سے ایک ایسی دیوار بناؤں گا کہ قیامت تک تم ان کے شر سے محفوظ رہ سکو۔

شہسوار نے کہا اور سواری کے جانور کو اس طرح ایڑھ لگائی کہ وہ بجلی کی طرح نکلا اور فضا میں گم ہو گیا۔

دوسرے دن صبح ہونے سے پہلے ہی پانچوں نے بستی کے بہت سے لوگوں کو جمع کر لیا بستی والوں کو ان کی بات پر یقین نہیں تھا لیکن ان میں اکثر وہاں تماشہ دیکھنے آئے تھے۔

دوسرے روز سورج نکلا تو وہ شہسوار وہاں پہنچ گیا۔ اس کی آمد کی اطلاع آگ کی طرح پھیل گئی۔ ساری بستی اسے دیکھنے امڈ آئی۔ اس کا چہرہ اتنا روشن تھا کہ بستی کا کوئی آدمی اس سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔ جب انہوں نے اسے گھیر لیا تو اس نے گرج دار آواز میں کہا۔

"وہ کون ہیں جو تمہیں اس طرح ستاتے ہیں اور تمہارے مکانوں کو جلا دیتے ہیں"۔

بستی کے آدمیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ بھی نہ کہہ سکے۔

"ڈرو نہیں مجھے بتاؤ ——— وہ کون شر پسند ہیں جو تمہاری بستی کو جلا دیتے ہیں"۔

اچانک ہی مجمع دو حصوں میں بٹنے لگا۔ اب وہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو گئے وہ پانچوں اب بھی سوار کے قریب کھڑے تھے۔

"کیا تم ایک دوسرے سے لڑنا چاہتے ہو؟"۔ شہسوار نے پوچھا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نئی بستی کے لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پر سے یہ تماشہ

دیکھ رہے تھے ۔

"مجھے بستی کے اس حصے میں لے چلو جہاں سے وہ شر پسند داخل ہوتے ہیں ۔ وہیں وہ دیوار اٹھائی جائے گی تاکہ تم ان کے شر سے محفوظ رہ سکو۔"

اس نے بستی کا سفر شروع کیا ۔ اس کے پیچھے پیچھے بستی کے لوگ تھے ۔ ایک جگہ وہ رک گیا

"کیا یہاں سے دیوار اٹھائی جائے؟" اس نے مجمع سے کہا ۔

"نہیں ـــــ دو چار آوازیں ابھریں ۔"

"یہاں تو ہمارے گھر ہیں۔"

وہ آگے بڑھ گیا ۔ جس جگہ وہ رکتا ۔ کوئی نہ کوئی چیخ اٹھتا ـــ "یہاں ہمارے گھر ہیں۔"

"یہ ہماری زمین ہے۔"

ساری بستی وہ گھومتا رہا ۔ پھر ایک میدان میں رک کر اس نے کہا ۔ "دیکھو ـــ تمہاری بستی کے کنارے ایسے دو پہاڑ بھی نہیں ہیں کہ ان دونوں کے درمیان پگھلی ہوئی دھات کی دیوار بنائی جائے اب تم ہی بتاؤ کہ کس طرح راستہ روکا جائے ۔ اور دیوار کہاں سے اٹھائی جائے۔" شہسوار نے کہا ۔

" تم شہسوار ہو ـــ تمہیں پورا اختیار ہے ۔"

پیچھے کھڑے کردار نے کہا ۔ لیکن اس کی مخالفت میں اتنی آوازیں ابھریں کہ اسے خاموش ہو جانا پڑا ۔ شہسوار نے بستی بستی کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا ۔ سورج غروب ہونے لگا ۔ وہ بڑے زور و شور سے بحث کرتے رہے ۔ شام تک بھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہونچے ۔ تھکن کے مارے ان کے چہرے ان کے شانوں پر لٹک گئے ۔ اور جب سورج پانی کی لکیر میں غائب ہو گیا تو شہسوار نے آخری بار بستی پر نظر ڈالی اور اپنی سواری کے جانور کو ایڑ لگائی اور اسے تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے غبار میں کھو گیا ۔ ▲▲

ابھی نہیں ابھی نہیں

محمد سلیم خاں ہمراز
جے ۵۷۳ فتح پور ولیج روڈ
کلکتہ ۔۔۔ ۲۴۔۔۔۷۰۰

خدا وندِ قدوس سے اجازت لے کر جب آدمؑ و حواؑ نے اپنی اولاد کو آسمان کا نیلگوں پردہ ہٹا کر دیکھا تو آدمؑ غصے سے کانپ گئے ۔ ...... ان کا رواں رواں غصے کی آگ میں تپنے لگا ...

لوٹ کھسوٹ ....

مار دھاڑ .. ..

چھینا جھپٹی ....

حیوانیت درندگی ـــــــ اپنی اولاد کو اس حال میں دیکھ کر ....

انہوں نے خدا سے درخواست کی ـــــــ

" اے خدا ـــ ! میری اولاد دنیا میں رہنے کے قابل نہیں رہی میری اولاد کے کرتوت دیکھ کر میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو ان پر بھیانک عذاب نازل کر دے ـــــ قیامت برپا کر دے ، اسرافیل کو حکم دے کہ وہ صور پھونک دے ......

ـــ سورج کو میری اولاد پر آگ برسانے کیلئے مجبور کر دے ، پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا دے ، زمین کو تانبے کی طرح سرخ بنا دے ۔ میرے خدا ، میری درخواست قبول فرما ۔ !! ؟

اور حواؑ آدمؑ کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگیں .... نہیں نہیں ..... ایسا مت ہو !!

" حواؑ سچ کہتی ہے ! " عرش بریں سے صدا آئی !! میں اسرافیل کو صور پھونکنے کا حکم ابھی نہیں دونگا تم مغرب کی سمت پردہ ہٹا کر دیکھو ، تمہیں نظر آئے گا وہ جس کے سبب میں نے قیامت کو موخر کر دیا ہے "

انہوں نے مغربی سمت کا پردہ ہٹایا .... ریگستان ...... ایک سوکھی پہاڑی ...... پہاڑی پر بوسیدہ لباس میں ، ایک خوبصورت شخص جسکا چہرہ بے حد نورانی تھا .... تنہا ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا وہ شاید پکار رہا تھا .... اسکی آواز آدمؑ و حواؑ کو سنائی نہیں دے رہی تھی ......

آدمؑ و حواؑ نے دیکھا کہ کچھ ہی دیر میں چاروں طرف سے لوگ آئے ۔ انہوں نے پہاڑی کو گھیر لیا ۔

وہ شخص ان سے کہہ رہا تھا ..... اور لوگوں کے چہرے غصے سے تمتما رہے تھے .....
کچھ لوگ اس پر تھوک رہے تھے ..... کچھ غلاظت پھینک رہے تھے ..... کچھ پتھر برسا رہے تھے
اس کا بدن زخمی ہو گیا تھا ..... سرخ سرخ خون رس رہا تھا اس کے سر سے .....
لیکن وہ شخص انہیں برابر سمجھائے جا رہا تھا ..... معلوم نہیں کیا سمجھا رہا تھا وہ ——!؟
لوگوں نے تھوکنا بند کر دیا ..... پتھر پھینکنے والوں نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ خالی ہاتھ
لوگوں نے اپنی گردنیں جھکالیں ——— متفق ہو گئے تھے شاید وہ لوگ اس کی باتوں سے ———
لیکن جن ہاتھوں میں تلواریں ——— اور نیزے تھے انکی گردنیں اکڑی ہوئی تھیں ——— لوگ
چاروں سمت سے پہاڑی کی سمت آتے رہے ——— مغرب سے مشرق سے شمال سے جنوب سے
انسانوں کا اژدھام ....

اور وہ ———!

اقدار والے .... اس شخص کی باتوں سے سمجھوتہ کرتے والے" آنے والوں کو" اکڑی
ہوئی گردن والوں کو عاجزی و انکساری سے اس شخص کی باتیں سمجھا رہے تھے .....
کچھ سمجھنے لگے .... کچھ نے مان لیا ——— اس شخص کی باتوں کو، اس کے اصولوں کو
اس کے آدرش کو تسلیم کر لیا اور اکثریت نے ہتھیار سنبھال لئے :،

جنگ ....

جنگ ——— حق و باطل کی

جنگ ——— جھوٹ اور سچ کی

جنگ ——— تلواروں سے ——— جنگ پتھروں سے ——— خونی ہتھیاروں سے، جنگ زبانوں سے

جنگ ذہنوں سے ——— اقلیت و اکثریت، اقلیت حق ——— اکثریت باطل

جنگ چاروں سمتوں میں ہونے لگیں .... فتح سچ کی ہوتی رہی ....

پھر اس شخص کے ماننے والوں کے مقابلے میں توپوں والے .... بندوقوں والے آئے۔

پھر میزائل اور بموں والے آئے ——— ناسمجھ، جاہل، غصیلے ....

آگ ــــ خون .... دھواں

خدایا ــــ یہ کیا ہو رہا ہے ۔ کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے" آدمؑ و حواؑ ایک ساتھ گھبرا کر بولے ــ

پھر یکلخت ان کے کانوں سے اپنی اولاد کی آوازیں ٹکرانے لگیں ــــ

شور ..... چیخ و پکار ــ آہ و بکا ہر سمت میں بٹے ہوئے انسان ــــ اپنے اصولوں ...

اپنی جاہلیت میں منقسم ــــ !!

"میں خدا ہوں" ــــ ! آدمؑ کے بیٹے کی آواز آئی ...... ہاں ــ آدمؑ کے کچھ بیٹوں نے اقرار کیا۔

"پتھر خدا ہے ــــ !" آدم کے کچھ بیٹوں کی ریسرچ ۔" ہاں ــ !" آدم کے بیٹے پتھر کے سامنے سربسجود

"کوئی خدا نہیں !" آدم کے کچھ گنجے بیٹوں کا چیلنج ــ "ہاں ــــ ! آدم کے کچھ بیٹوں کا اقرار ــ

ایک خون میں لتھڑے ہوئے نیزوں، بھالوں، تلواروں والے بڑے مجمع کا نعرہ "ہمارے

باپ طوا کے مذہب پر جو کیچڑ اچھالے گا ہم اس کا خون پی جائیں گے ــــ خون پی جائیں گے !!"

قتل ــ قتل ــــ قتل چاروں سمتوں سے آوازیں آ رہی تھیں ــــــــ ہمارا

مذہب بلند ہے سچا ــ ہم افضل ہیں ــ ہم بڑے ہیں ۔ باقی پنچ ــــ باقی کمتر ــ باقی ذلیل

بندوقوں کے شعلے ــــ ٹھائیں ٹھائیں ۔ بموں کے دھماکے ــــ لرزہ خیز دھماکے ۔

ہم ہندوستانی ہیں .... ہم امریکی ہیں ...... ہم روسی ہیں .... ہم چینی ہیں .....

ہم افضل ہیں ۔ ہم بڑے ہیں

"ہم سیکولر ہیں ــ" (ہتھیاروں سے لیس)

"ہم سوشلسٹ ہیں ــ" (ہتھیاروں سے لیس)

"ہم کمیونسٹ ہیں ــ" (ہتھیاروں سے لیس)

ــــــ غریبوں کے ہمدرد، بم بنانے والے، میزائیل بنانے والے ... سبھوں کی آواز ــ

اس شخص کے اصول بدل ڈالو ــــ !

"اس شخص کی بات ماننے والوں کی زندگی اجیرن کر دو، ہمارے پاس طاقت ہے ۔ ہمارے پاس

دولت ہے ــــ ہمارے پاس حکومت ہے .... ہم ان سے ہزارہا درجہ بہتر ہیں ۔ افضل ہیں

باوقار ہیں ۔ برتر ہیں۔

اور پہاڑی پر کھڑا وہ شخص اب نظر نہیں آرہا تھا ــــ لیکن ہاں اب اسکی آواز دنیا کے کونے کونے سے آرہی تھی .....

"وہ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اسی نے ہمیں پیدا کیا وہی مارے گا ــــ وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ مشرق کا رب ہے..... وہی مغرب کا آقا، وہی شمال کا پروردگار، وہ جنوب کا مولا ــــ"

"اس کے نزدیک کسی عربی کو عجمی پر کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے ۔ اس کے یہاں تو وہ بڑا وہ ہے جس کے اخلاق بلند ہوں .. جو خدا سے ڈرتا ہو"

عرش بریں سے صدا آئی "اے آدم و حوا" !! جب تک زمین سے یہ صدا آتی رہے گی۔ اسرافیل کے صور پھونکنے کا حکم نہیں دیا جائے گا۔ ▲▼

غزل

محبوب علی منصور

گرے آنسو جو چشم دیدہ ور سے
فزوں تر ہو گئے وہ قیمت میں گہر سے
ملامت کے ہزاروں تیر برسے
گرا جس دن سے میں انکی نظر سے
رہ دشوار آساں ہو گئی ہے
عزائم سے مرے ذوق سفر سے
اٹھو کشتی نہ حق کی ڈوب جائے
ہوا جاتا ہے پانی اونچا سر سے

غزلیں

مضطر مجاز

سوچو تو خوش مذاق بھی وہ کس بلا کا تھا
یاروں کو اس کے زہر پہ دھوکا دوا کا تھا
امراض بڑھ رہے تھے خلائق میں نت نئے
اٹھ کر لے کے دیکھا تو چرچا شفا کا تھا
کوئی نہ تھا کہ اٹھ کے دریچہ ہی کھول دے
ہر شخص دیکھنے میں تو بھوکا ہوا کا تھا
کج فہموں کو گماں کہ تھا مدوجزر سحر
سمجھا بہت تو سمجھا کہ جادو عصا کا تھا
مضطر بتا بھی دو کہ ہمیں ہیں وہ عقلمند
مرمر پہ جن کو وہم نسیم و صبا کا تھا

طاہر گلشن آبادی

جام کوئی ادھر نہیں آتا
ساقیا کیا نظر نہیں آتا
موت سے قبل تو سنبھل غافل
وقت کچھ بول کر نہیں آتا
دوست کہنا اسے حماقت ہے
کام جو وقت پر نہیں آتا
ہے جبین نیاز کی توہین
سجدہ کرنا اگر نہیں آتا
جس کی آنکھیں نہیں کسی قابل
وہ اسی کو نظر نہیں آتا
دل میں جب تک نہ درد ہو طاہر
شاعری میں اثر نہیں آتا

تابیب ہاشمی

ہر منزل حیات کا منظر نظر میں ہے
دنیا کے ساتھ میری نظر بھی سفر میں ہے

حق ناشناس فکر و نظر کے فریب سے
تہذیب نو کا آج سفینہ بھنور میں ہے

صیاد نے قفس میں کیا قید بھی تو کیا
پرواز کی تڑپ تو مرے بال و پر میں ہے

جس رہگذر پہ ثبت ہیں نقش قدم ترے
راہ نجات سب کی اسی رہگذر میں ہے

کیوں شورشوں سے دہر کی گھبرا گیا یہ دل
اک سلسلہ فساد کا خود اپنے گھر میں ہے

غزلیں

عبدالقدیر عزم

نہ حرم سے نہ کلیسا سے نہ میخانے سے
ترا افسانہ ہے باقی مرے افسانے سے

اپنے محبوب کی رسوائی نہیں شیوۂ عشق
شمع نے جل کے کہا راز یہ پروانے سے

لمحہ لمحہ جو پگھلتا ہے وہی جاتا ہے
کتنا دشوار پگھل جانا ہے جل جانے سے

غمِ ایام کو ساغر میں ڈبونے والو
گردشِ دہر کو کیا ربط ہے پیمانے سے

کوئی منصور کو اے کاش یہ سمجھا دیتا
ہو زیادہ تو چھلک جاتی ہے پیمانے سے

ہوش والا تو ہر اک گام پہ رک جاتا ہے
منزلیں آ کے لپٹ جاتی ہیں دیوانے سے

عزم رونق تو بہر حال رہا کرتی ہے
کبھی خود ان کے کبھی یاد کے آجانے سے

مسعود جاوید ہاشمی

گرا ہوں بار ہا لیکن سنبھل رہا ہوں میں
ہزار ٹھوکریں کھا کر بھی چل رہا ہوں میں

پناہ مل نہیں سکتی کہیں اندھیروں کو
کہ مہر و ماہ کے ہمراہ چل رہا ہوں میں

قدم قدم پہ سمٹنا پڑے گا باطل کو
کہ اپنے خول سے باہر نکل رہا ہوں میں

سکوں نواز کناروں کی کچھ خبر نہیں
بھنور میں سیل میں طوفاں میں چل رہا ہوں میں

بھڑک رہی ہے اگر نفرتوں کی آگ تو کیا
محبتوں کے سمندر اگل رہا ہوں میں

غلط کیا مری طاقت کا تم نے اندازہ
عمل کے زور سے دنیا بدل رہا ہوں میں

بہ جبر سر پہ مسلط نہیں ہوا لیکن
دلوں میں آرزو بن کے مچل رہا ہوں میں

ابن اشرف الوعید
محمد علی خان خاکی (حیدرآباد)

آنکھیں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم -

اور یہ حقیقت ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی سب سے اشرف سب سے بہتر اور سب سے خوبصورت مخلوق ہے اور انسان کے وجود میں آنکھ سب سے زیادہ خوبصورتی کی حامل ہے۔ پھر لطف کی بات یہ کہ جن خوبصورت آنکھوں کو دیکھکر ہم لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ وہ خوبصورت آنکھیں خود دنیا کی دوسری خوبصورت چیزوں کو دیکھکر لطف اندوز ہوتی ہیں ۔ گویا نورٌ علیٰ نور ۔ آنکھیں ہمارے علم کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہیں ۔ انسان شروع ہی سے انکی طرف متوجہ رہا ہے اور سائینسدانوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہیں عینکیں بنائی گئیں ۔ دوربینیں اور خوردبینیں ایجاد کی گئیں ان کیلئے مختلف قسم کے علاج اور اصول علاج تجویز کئے جاتے رہے اور اب تو قلمی اور پیوندی آنکھیں بھی وجود میں آگئیں ۔

آنکھوں کی خصوصی اہمیت اور افادیت کو مدّنظر رکھتے ہوئے اردو کے زباندانوں نے بھی انکی طرف خوب خوب توجہ دی اور شاعروں نے بھی انکو اپنی طبع آزمائی کا موضوع بنایا اور انکے ذریعہ بڑے خوبصورت انداز میں اپنے مطالب سمجھانے اور ادا کرنے کی کوشش کی ۔

> مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
> کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

آیئے ذرا ان زباندانوں اور شاعروں کی اس کارگذاری پر نظر ڈالیں ۔

ایک آنکھ سے دیکھنا : اگر آپ کسی کے متعلق یہ سنیں کہ وہ سبکو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے تو آپ اسکو اسرائیل کا موشے دایان یا پنجاب کا رنجیت سنگھ نہ سمجھ لیں ۔ اس کا مطلب ہے سب کے ساتھ انصاف کرنا سب کو ایک درجہ کا سمجھنا ۔ لیکن ہمارے خیال میں جس طرح سبکو ایک لاٹھی سے ہانکنا مناسب نہیں ۔ اسی طرح سب کو ایک آنکھ سے دیکھنا بھی کچھ زیادہ مستحسن بات نہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو آنکھیں اسی لئے عطا فرمائی ہیں کہ ہم ایک سے ظالم کو اور دوسری سے مظلوم کو دیکھیں لیکن اہل زبان کی زبان کو کون پکڑے وہ تو کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رض نوشیروان، شہنشاہ جہانگیر اور

اور اسی قسم کے دوسرے منصف مزاج لوگ نہ صرف ظالم و مظلوم بلکہ پوری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔

آنکھیں چار ہونا: اگر دو آدمیوں کا اتفاقاً آمنا سامنا ہو جائے تو کہتے ہیں کہ آنکھیں چار ہوئیں آنکھیں چار ہونے کو تو خیر ہم تسلیم کر لیتے ہیں۔ دو آنکھیں ایک آدمی کی اور دو دوسرے آدمی کی مل کر چار ہو گئیں۔ لیکن آنکھیں چار ہونے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ اتنے مختلف بتائے جاتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے کبھی کہتے ہیں کہ آنکھیں چار ہوتے ہی ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے اور دونوں طرف سے خوشی و مسرت کے آنسو رواں ہو گئے کبھی فرماتے ہیں کہ آنکھیں چار ہوتے ہی ہاتھا پائی شروع ہو گئی اور نوبت مار پیٹ بلکہ کشت خون تک جا پہنچی۔ شاعر خوشی محمد ناظم عقل مند تھے کہ انہوں نے آنکھیں چار ہوتے ہی بن باسی کو سلام کر لیا۔ کہتے ہیں جوگی سے جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں جھک کر میں نے سلام کیا۔ تب آنکھ اٹھا کر ناظر سے یوں بن باسی نے کلام کیا۔

دل کے ہو دو ٹکڑے جب چار ہوئیں آنکھیں اب اسکا مطلب کون سمجھائے

آنکھ چرانا: کسی دوسرے کی چیز انکی مرضی کے خلاف پوشیدہ طور پر لینا چوری ہے۔ لیکن آنکھوں کی چوری اس عام مروجہ چوری سے مختلف ہے۔ انسان خود اپنی ہی آنکھ آپ چراتا ہے بھری محفل میں چراتا ہے۔ اس کے باوجود معتبر شخصیت قرار پاتا ہے۔

آپ کو دیکھ کے جب ہم نے چرائیں آنکھیں لوگ سمجھے کہ کوئی اجنبی آیا ہوگا۔

آنکھ لگنا: میلہ لگتا ہے دکان لگتی ہے دھیان لگتا ہے اور دل بھی لگتا ہے تو پھر آنکھ کیوں نہ لگے لیکن آنکھ کسی اور ہی طرح لگتی ہے۔ بلکہ طرح طرح سے لگتی ہے۔

- عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
- نیند آئی نہ ہو مقدر کو آنکھ لگتی نظر نہیں آتی
- سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے۔
- آنکھیں لگی رہیں گی برسوں وہیں سبھوں کی ہوگا قدم کا تیرے جس جا نشاں زمیں پر

آنکھوں ہی آنکھوں میں لے جانا: بعض لوگ چوری کرنے میں ایسے ماہر ہوتے ہیں کہ ادھر آپ نے کوئی چیز رکھی اور وہ لے اڑے اپنے فن میں مہارت کی وجہ سے وہ دیکھتے ہی دیکھتے سب

کے سامنے چوری کرتے میں کامیاب ہوجاتے ہیں ایسے ہی موقع پہ کہا جاتا ہے کہ چور آنکھوں ہی آنکھوں میں چوری کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں دل لے گئے، یہ باتیں بھی یقیناً آنکھوں ہی باتوں میں کیا ہوگیا

آنکھ لڑانا بعض لوگوں کو مرغ لڑانے کا شوق ہوتا ہے اور بعضوں کو بٹیر لڑانے کا۔ بعض لوگ پتنگ بھی لڑاتے ہیں۔ آنکھوں کی لڑائی میں آنکھوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہوتا

آتی بھی کیا ہے دیدہ دلیری کہ غیر سے   آنکھیں لڑا لیئے ہمیں آنکھیں دیکھا ئیے۔

آنکھوں میں سمانا: سب آنکھ والے جانتے ہیں کہ آنکھ میں ایک معمولی سے معمولی ذرہ یا چھوٹے سے چھوٹا تنکا بھی نہیں سما سکتا لیکن ان شاعروں کی آنکھوں کا کمال دیکھئے کہ ان میں دنیا کی ہر چیز سما سکتی ہے۔ کسی کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار۔   ہو گئی کیسی نگاہ طرز سلف سے بیزار

سمایا ہے جب سے تو آنکھوں میں میری   جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔

آنکھیں بچھانا: مہمانوں کی آمد پر ان کے استقبال کیلئے مختلف قسم کی تیاریاں کی جاتی ہیں دریاں اور چادریں بچھائی جاتی ہیں۔ قالین بچھائے جاتے ہیں صوفے اور کرسیاں بچھائی جاتی ہیں بطور مذاق کے دورہ روس پر تو لڑکیوں نے اپنے بال تک بچھا دیئے۔ لیکن شاعروں اور زباندانوں نے یہاں بھی بازی لے جانے کی کوشش کی اور سوچا کہ اپنے مہمانوں کے استقبال کیلئے کوئی ایسی چیز بچھائی جائے جو دنیا کا کوئی اور آدمی نہ بچھا سکے۔ چنانچہ انھوں نے مہمانوں کی راہ میں آنکھیں بچھانا شروع کردیں

میں نے راہوں میں بچھادی آنکھیں   وہ بھلا کب میرے گھر آتے ہیں۔

آنکھوں میں پھرنا: آنکھیں کوئی پبلک گارڈن یا زو پارک نہیں ہے کہ لوگ اس میں گھومیں۔ پھر بھی اسکے باوجود آنکھوں میں پھرایا جاتا ہے۔ پھرتی ہیں آنکھوں میں آکر بارے کیا کیا صورتیں

آنکھیں سینکنا: جب زیادہ سردی محسوس ہوتی ہے تو آدمی دھوپ یا آگ کے ذریعہ گرمی حاصل کرتا اور سردی کی تکلیف کو دور کرکے سکون و راحت محسوس کرتا ہے اس عمل کو آگ سینکنا یا دھوپ سینکنا کہتے ہیں۔ اسی سے آنکھیں سینکنا بنا لیا گیا یعنی آنکھوں کو سکون و راحت پہنچانا۔ سہ   اس مہر کا نظارہ تو مشکل ہے امانت

خورشید سے سینکا کرو دو چار گھڑی آنکھ

آنکھیں دکھانا اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دیکھنے کیلئے بنائی تھیں لیکن آج کل لوگ دوسروں کو دکھانے کے کام میں لاتے ہیں اور دکھاتے بھی مختلف زاویوں سے ہیں کبھی غصہ اور ناراضگی کے اظہار کے لئے اور کبھی قطع تعلق کیلئے ہمیں نرگس ... غیر کے ہاتھوں سے کیوں بھیجا۔

ہمیں نرگس کا غنچہ غیر کے ہاتھوں سے کیوں بھیجا ۔ اگر آنکھیں دکھانا تھیں دکھاتے اپنی آنکھوں سے

آنکھیں موندنا آنکھیں بند کرنا اور آنکھیں موندنا میں فرق یہ ہے کہ آنکھیں بند کرنے کے بعد اگر آپ چاہیں تو انہیں کھول بھی سکتے ہیں لیکن جب آنکھیں مند گئیں تو پھر کھل نہیں سکتیں آپ وہ قیامت ہی کے دن کھلیں گی ۔

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا ؎
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے میرے بالیں پہ اسے پر کس وقت

آنکھیں کھولنا یا کھلنا: آنکھیں معنوی اور مادی دونوں اعتبار سے کھلتی ہیں۔ اگر انسان سو رہا ہے تو آنکھیں بند ہیں جاگ جائیگا تو کھل جائینگی اسی طرح اگر کسی حقیقت کا علم نہیں تو آنکھیں بند ہیں اور حقیقت کا علم ہوجانے لگا تو آنکھیں کھل جائینگی ۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا
کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر ہر رہ گزر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ
عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم ؎ ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بے خبر سب

آنکھیں تر ہونا یا آنکھ نم ہونا } تر ہونا یا نم ہونا بھیگنے کو کہتے ہیں اور بھیگا پانی میں جاتا ہے ۔ لیکن آنکھ کو آپ چاہے جس قدر پانی سے بھگولیں وہ تر آنکھ یا نم آنکھ نہیں کہلائے گی اس کیلئے آنسوؤں سے بھیگنا ضروری ہے ۔

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر لطف ہے کیا اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا ؎
سنجیدگی ہزار سوغم سے مفر نہیں دنیا اسی میں بند ہے جو آنکھ تر نہیں ۔

آنکھوں میں جچنا دیکھنے میں مناسب اور موزوں ہونا نظر کیلئے قابل قبول ہونا۔

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی   کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

اپنی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی   آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا

آنکھیں چپکنا بچوں کی آنکھیں جب دکھنے آتی ہیں اور وہ صبح سو کر اٹھتے ہیں تو انکی آنکھوں کی پلکیں ایک دوسری کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسکو ہم آنکھوں کا چپکنا کہتے ہیں لیکن جب میرؔ کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ انکی آنکھیں کسی اور ہی طرح چپکا تھیں۔

اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہے آنکھیں   مشکل بنی ہے انکے یہ صاحب نظروں کی

آنکھیں سفید ہونا یہ محاورہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بھی استعمال فرمایا ہے۔ اور غالباً عربی ہی سے اردو میں لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی جدائی کے غم میں ان کے والد حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے سفید ہونے کا مطلب آنکھوں کا بینائی سے محروم ہو جانا ہے۔

رفتہ رفتہ ہو گئیں آنکھیں بھی اب میری سفید   نامے کا کتنا کیا یاروں کے میں نے انتظار

آنکھ مارنا جب لاٹھی، ڈنڈا، پتھر مارا جاتا ہے، گولی ماری جاتی ہے تو پھر آنکھ کیوں نہیں ماری جاسکتی لیکن آنکھ مارنے والے بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اپنی آنکھ اپنے پاس رکھتے ہیں اور چوٹ بھی کر جاتے ہیں۔ لیکن چوٹ نظر نہیں آتی صرف محسوس کی جاسکتی ہے اسی لئے نہ پولیس ان کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتی ہے اور نہ کسی عدالت ہی میں چارہ جوئی ہو سکتی ہے۔

آنکھوں کا تارا: یہ سب جانتے ہیں کہ تارے آسمان پر ہوتے ہیں چنانچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے   وہ کیا گردوں تھا تو جسکا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

مگر دیگر شاعر حضرات کے نزدیک آنکھوں کا تارا بھی ہوتا ہے

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں   جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

اپنے دل کی ٹھنڈک ہے اپنی آنکھ کا تارا ہے   یاد رہے اے دنیا والو ہندوستاں ہمارا ہے

آنکھ کا اشارہ: آنکھ اشارہ کرنے کے کام بھی آتی ہے۔

ایک تری آنکھ کے اشارے پر   دشمنی دوستوں سے لے لی ہے۔

آنکھوں میں کھٹکنا : کھٹک رہا ہوں میں اہل چمن کی آنکھوں میں
میرا یہ جرم کہ نفرت کا شیح ہو نہ سکا ہوں

میری اس خاکساری سے بھی دنیا خوش نہیں ہوتی — غبار راہ بنتا ہوں تو آنکھوں میں کھٹکتا ہوں

آنکھیں ہونا : آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ کچھ لوگ بغیر کانوں اور بغیر آنکھوں کے پیدا ہوتے ہیں لیکن بڑے ہو کر جیسے جیسے ان سے غلطیاں اور لغزشیں سرزد ہوتی جاتی ہیں اور وہ حماقتیں اور بے وقوفیاں کرتے جاتے ہیں ان کے کان اور آنکھیں ہوتی جاتی ہیں ۔

دیکھ کر تجھکو نہ دیکھیں گے کبھی بے دید کو — تری آنکھیں دیکھکر اے یار آنکھیں ہوگئیں ۔

اس طرح آنکھیں لڑانا، آنکھیں نکالنا، آنکھیں بہنا، آنکھیں جھپکنا، آنکھیں پھیرنا، آنکھوں میں اترنا، آنکھ بھر آنا، آنکھوں میں گھر کرنا، آنکھوں پر بٹھانا، آنکھیں ملانا، آنکھوں کا نیچا اور اونچا ہونا آنکھ ڈالنا، آنکھیں خیرہ ہونا، آنکھ بچانا، آنکھیں پھاڑنا، آنکھیں مٹکانا، آنکھیں چھپانا، آنکھ اٹھانا، ایک آنکھ نہ بھانا، آنکھیں امنڈنا وغیرہ سینکڑوں طرح ۔ اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کو اہل زبان استعمال کرتے ہیں لیکن شکر کم ہی کرتے ہیں ۔

آخر میں سنیئے کہ شاعر کبھی اپنے آپ کو بھی آنکھ کہتا ہے ۔

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست دپائے قوم
محفلِ نظم حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ — کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

نادر اسلوبی (ورنگل)

دشمنی شیشے کی ہے یہ دوستی شیشے کی ہے
ٹوٹ جانا ہے سبھی کو زندگی شیشے کی ہے
دل نچھاور کرنے والے ہوش کے ناخن تو لے
مورتی پتھر کی ہے اور آرتی شیشے کی ہے

انسان اور گرگٹ

دُنیائے بے ثبات کو کوئی قرار نہیں ۔ یہاں کی ہر شئے بنتی اور بگڑتی رہتی ہے، ٹوٹتی اور بکھرتی رہتی ہے ۔ انسان کا ظاہر بھی بنتا اور بگڑتا رہا ہے اور باطن بھی اس نے اپنا چولا دلکش اور صورت دل فریب بنالی ہے ۔لیکن سینے میں صرف فریب ہی فریب بچ رہا ہے ۔ اس طرح ظاہر سرپٹ اور باطن چوپٹ ہو کر رہ گیا ہے ۔ گرگٹ کی رنگ بدلتی خصلت کو انسان نے کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا ۔کیونکہ انسان صاحب عقل وفہم ہے مگر وہ ظاہر کا پجاری ہے باطن کا نہیں۔ فوری ملنے والی چیز سے

ایلومتین ۔ سدا سیوپیٹ

رغبت رکھتا ہے اور دیر سے ملنے والی چیز اس کی نظر میں بے وقعت ہے ۔ اس کی اصل وجہ ایک مشہور مقولہ ہے جس کو انسان قیمتی ورثہ کی طرح ایک سے دوسرے کو منتقل کرتا آیا ہے ۔ اس کی حیات ناپائدار مختلف مقولوں کے گرد گھومتی رہتی ہے ۔ جیسے یہ کوئی خدائے بزرگ و برتر کے مقدس فرمان ہوں ۔حقیقی فرمان کو تو انسان نے محض اشلوک و منتر کی حیثیت دے کر جھوم جھوم کر پڑھنے پر اکتفا کیا ہے ۔ چومنے چاٹنے اور اپنے آپ کو اس سے بچائے رکھنے میں عافیت محسوس کی ہے ۔ البتہ مقولے گھڑ گھڑ کر پھیلتا اور ان پر عمل پیرا ہوتا رہا ہے ۔ جیسے کوئی پاگل خود اپنے سائے کو پکڑنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو ۔ انسان کی عجلت پسندی پر دلالت کرنے والا مقولہ ہے "کل کی مرغی سے آج کا انڈا بہتر ہے" ۔ اسی طرح گرگٹ کے رنگ بدلنے کو مکاری و دغا بازی اور ابن الوقتی کا مفہوم پہنا کر اس کو لعنت ملامت کرنے والا انسان یہ نہیں سوچتا کہ گرگٹ کی رنگ بدلی میں جو فطری اصول کار فرما ہے وہ انسان کے فکری وجود سے کوئی میل نہیں کھاتا ۔ گرگٹ اپنے خالق کے مقرر کردہ ضابطے سے بال برابر تجاوز نہیں کرتا ۔ لال ۔ پیلے اور ہرے رنگوں کو نہیں بگاڑتا ۔لیکن انسان شتر بے مہار بن کر بے روک ٹوک وہ سب کچھ کرتا رہتا ہے جس سے خالق نے منع کر رکھا ہے ۔ اور یہ اسی کا طرۂ امتیاز ہے ۔

بات نکلی تھی گرگٹ کا چولہ بدل بدل کر اکڑنے کی وہ ازل سے جو خوبی یا خامی لے کر آیا ہے اور وہ اس پر جوں کا توں قائم ہے۔ لیکن انسان نے اپنے اندر جو ٹوٹ پھوٹ کر لی ہے اسکا ظاہر کسی خوش رنگ جال میں پھنس گیا ہے تو باطن مختلف عصبیتوں میں دفن ہے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں پر الزام لگاتا ہے کہ "لومڑی مکار ہوتی ہے"۔ گرگٹ مغرور ہوتا ہے" "کوا سیانا ہوتا ہے" وغیرہ وغیرہ خود انسان کو کیا ہونا تھا اور کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی فکر اس کو نہیں ہے یہ اپنی ترقی کے گیت گاتا، بدمست ہاتھی کی طرح جھومتا آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ دورِ جدید کے سیکولر انقلاب نے ہر پست کو بالا اور بالا کو پست کر دیا ہے۔ جس طرح چڑھتے دریا کی سرکش موجیں اپنا راستہ بدل کر آبادیوں کا صفایا کر ڈالتی ہیں اسی طرح بے لگام انقلابات نے انسان کو فرعونِ بے سامان بنا دیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں کی نسل کشی کر رہا ہے۔ فرعون اپنی قوم کا پیشوا تھا لیکن غرقاب ہونے تک دل بدلی کی عافیت میں پناہ لینے کی تدبیر نہ کر سکا۔ لیکن آج ہمارے لیڈر اور ان کے وفادار پیرو بھی سیال مائع کی طرح زمانے کی ہر پستی میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ لیڈر سیاسی دل بدلی میں مبتلا ہیں تو عوام وقت کی ہر پھیلنے والی وبا کا شکار ہیں۔ کوئی ٹھہراو ہے نہ قرار۔ آج کچھ رواجوں کا چلن عام تو کل ہے کچھ اور۔ آج کچھ رسومات کے دھارے سیلاب بنکر دندنا رہے ہیں تو کل کچھ اور کے، آج کچھ نظریات کا طوطی بول رہا ہے تو کل کچھ اور کا۔ آج کسی پارٹی کا ڈنکا بج رہا ہے تو کل کسی اور کا۔ انسان تھپیڑے کھا رہا ہے۔ ٹھوکریں اس کا مقدر بن گئی ہیں اور وہ ڈولتا جا رہا ہے۔ جب ایک طوطی کی بولی میں بریک لگ جاتا ہے اور ڈنکے کی چوٹ بے ہنگم آواز میں بدل جاتی ہے تو طوطا چشم لیڈر آنکھیں لال پیلی کر کے دوسرے طوطی کے وارے نیارے بکھرنے لگتا ہے۔

لیڈر تو ہمارے سماج کے سر فہرست کھلاڑی ٹھہرے۔ بھلا یہ دل بدلی نہ کرینگے تو کیا دل بدلی کریں گے۔؟ یہ کام تو ڈاکٹر کرتے ہیں اور ان کی ماہر خدمات بھی ان ہی اونچے اونچے لوگوں کیلئے وقف ہیں۔ ورنہ پچھلے لوگ تو بدن میں دم خم رہنے تک زندگی کے مزے لوٹتے ہیں، اس کے بعد عاملوں کے ٹونے ٹوٹکوں اور جھاڑ پھونک کے درمیان دم توڑ کر آخرت کا سامنا کرنے چلے جاتے ہیں۔ بغرض لیڈروں کی دل بدلی ہو یا ڈاکٹروں کی دل بدلی، ان سب میں گرگٹ کی

کی رنگ بدلی ضرور شامل ہے ۔

ایسا بھی نہیں کہ انسان محض رنگ وروپ کے تغیر پر مر مٹا ہو، اور اس کی تیز رفتار ترقی نے زمانے کو کچھ نہ دیا ہو ۔ یہ روشن زمانہ انسان کی سوجھ بوجھ کا جیتا جاگتا شاہکار ہے ۔ اسکے احسان کا زبردست بوجھ زمانہ اٹھانے سے قاصر ہے حتیٰ کہ حیاتِ انسانی اسی بوجھ تلے دبنے لگی ہے جوبات عرصے تک مسئلہ بنی رہی اس کو انسان نے چٹکی بجاتے حل کر کے رکھ دیا ہے ۔ عریانی کو آرٹ کا حسین نام دے کر پستی کو عظمت میں بدل دیا ہے ۔ نقالی دکھاوڈپن، ناچ اور گانے کے تکون میں سرخ رنگ بھر دیا ہے ۔ اور ہر شخص اپنے ایک یا دو بچوں کو ساتھ لئے تعمیر کا رخ کرتا نظر آتا ہے ۔ روٹی کپڑا اور مکان کی بنیادی ضروریات کو اس طرح حل کر دیا ہے کہ ہر ایک اسی مشاغل کے گوشوں میں سرمارتا نظر آتا ہے ۔ عرصہ دراز سے انسان محبت اور ہمدردی کا پیاسا تھا ۔ وہ اس کی چاہ میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا انسان نے آج اس کو بھی زرخرید غلام بنالیا ہے ۔ اب یہ مال تجارت ہے جس نے بھی مال خرچ کیا اسے حاصل کرلیا ۔ غربت، افلاس اور جہالت، انسان کے تن نازک کے ناسور تھے جن کی کسک سے انسانیت انسان کراہ رہی تھی لیکن آج انسان نے اس کا بھی علاج کر دیا ہے ۔ مشینوں کی گھن گرج میں سسکیاں دم توڑ کر رہ گئی ہے ۔ اب کسی میں یارا نہیں کہ حرفِ شکایت زبان پر لاسکے اور اگر کوئی شکوہ کر ہی دے تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کا مقولہ آخر کس دن کے لئے ہے ۔ علم اور فکر وفن کے میدان میں انسان نے سارے پچھلے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں ۔ اب کتابوں کی لائبریریوں کی جگہ کیسٹ لائبریریاں آگئی ہیں اور ہر شخص خود ایک مکمل کتاب کیسٹ بن گیا ہے ۔ گراما فون ریکارڈ بے چارہ کہاں اتنی وسعت رکھتا تھا ۔ اب تو علم تولنے کی مشین میں وزنی سکہ ڈال کر ڈگری نکال لینے کا فن چل پڑا ہے ۔ علمیت اور انسان میں چولی دامن کا ساتھ اب قصہ پارینہ بن گیا ہے اب تو انسانی زندگی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے زمانے کا ساتھ دینے لگی ہے ۔

ماہنامہ

فنکار

حیدرآباد

تعمیری اور صالح ادب کا نقیب

مارچ، اپریل، مئی ۱۹۸۶ء

جلد (۱۳) شمارہ (۳، ۴، ۵)

مجلس ادارت اعزازی

مدیر اعلیٰ ۔ ڈاکٹر احمد سجاد

مدیر ۔ مسعود جاوید ہاشمی

مجلس مشاورت

- ابوالمجاہد زاہد
- ڈاکٹر شبنم سبحانی
- ڈاکٹر سہیل زیدی
- حفیظ میرٹھی
- عزیز بگھروی

فی شمارہ ۲/۵۰ روپے

سالانہ ۲۵/= روپے

معاونین سے ۱۰۰/= روپے

دیگر ممالک سے ۱۰۰/= روپے

رابطہ

۱۔ دفتر "فنکار" لکڑکوٹ حیدرآباد ۔ ۲

۲۔ ڈاکٹر احمد سجاد

طارق منزل، بریاتو ہاؤزنگ کالونی

رانچی، بہار

مسعود جاوید ہاشمی نے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر "فنکار" لکڑکوٹ حیدرآباد سے شائع کیا

نقوشِ تازہ

نقشِ اوّل

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

کائنات کی طرح انسانی فکر و شعور بھی ہنوز ناتمام ہے
یہ صحیح ہے کہ انسان "اس ناتمامی" پر قابو پانے اور صدائے کن فیکون کی حقیقت و ماہیت کو سمجھنے اور اسے اپنی گرفت میں لانے کی ہر روز نت نئی تدبیریں بھی کر رہا ہے اسے جزوی کامیابیاں بھی ہو رہی ہیں۔ مگر فنا و بقا، علت و معلول اور جبر و اختیار کے ازلی و ابدی سلسلے میں وہ اس طرح بندھا ہوا ہے کہ ہر روز ایک نئی کامیابی اس کے لئے ایک نئی آزمائش بھی بن جاتی ہے اور ہر دعویٰ اپنے بطن میں جواب دعویٰ لے کر سامنے آتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل انسانی شعور کے معروضی ہونے کا دعویٰ بڑے زور و شور سے پیش کیا گیا جو بالآخر ایک مفروضہ ثابت ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ شعور قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ مگر انسان بے حس آئینہ نہیں اس کا شعور تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اپنے پس منظر سے الگ ہو کر کچھ نہیں کر سکتا۔ جس طرح جاندار، ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اسی طرح انسانی ذہن و شعور بھی نظریاتی خلا میں کام نہیں کر سکتے۔ یہ اس کی خلقی ضرورت ہے کہ کسی نہ کسی عقیدہ اور اعتقاد کے سہارے ہی خود کو آگے بڑھائے۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ معروضی محققین، جنھوں نے استخراجی (Deductive) طرز تحقیق کی فرسودگی سے ہٹ کر استقرائی (Inductive) طرز تحقیق سے کام لیا ہے۔ ان کی معلومات اور حاصل شدہ نتائج کی گہرائی میں کسی نہ کسی "اعتقاد" ہی کی شمع فروزاں ہے۔ مشہور مصنف Jhon caird نے اپنی تصنیف[1] میں یہ تسلیم کیا ہے کہ

"تحقیق کے ہر گام پر ہمیں اپنے تصورات ہی سے رہنمائی حاصل کرنی پڑتی ہے۔۔۔۔۔۔ انسان کے لئے جس طرح اپنے سائے سے بے تعلق ہونا ناممکن ہے، بالکل اسی طرح وہ اپنے تحقیقات کے نتائج کو اپنے بنیادی تصورات سے الگ نہیں کر سکتا"

۱ An Introduction to the philosophy of Religion - (P-86-87)

بیون (Bevan) نے بھی اپنی معروف تالیف[۱] میں بالکل اسی خیال کو دوسرے لفظوں میں اس طرح دہرایا ہے کہ

" ہمارے لئے ناممکن ہے کہ ہم صرف حقائق میں الجھ کر رہ جائیں۔ جب ہم عملی زندگی کی طرف کوئی قدم آگے بڑھاتے ہیں تو ہم اپنی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے اپنے بنیادی تصورات کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں "[۱]

چنانچہ مشہور زمانہ "معروضی علوم" یعنی حیاتیات، طبیعات اور تاریخ کا پچھلی صدی سے خاصا غلغلہ ہے مگر ماہرین کے غور وفکر اور تحقیق جدید کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ علوم بھی اپنی "معقدیت اور آئیڈیلزم" سے اپنا پنڈ نہ چھڑا سکے۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاروِن کا نظریہ ارتقا " بھی تجربات و مشاہدات کے ساتھ ہی ساتھ مغربی اوہام اور ڈارون کے ملحدانہ تصورات کا نتیجہ ثابت ہوا ورنہ نمو، حرکت ارادی، احساس، شعور، ضمیر اور وجدان کی جملہ تحقیقی صورتوں میں مادی تاویل کی مطلق گنجائش نہیں تھی۔ آرنلڈلن (Arnold Lunn) نے اپنی ہنگامہ خیز تصنیف " تعقل کے خلاف بغاوت[۲] " میں اس کا پول اس طرح کھولا ہے۔" ڈاروینیت سائینس نہیں بلکہ ایک مذہب ہے، اس میں جس منطقی ربط کا دعویٰ کیا گیا ہے اسے ٹھوس حقائق کی مدد سے نہیں بلکہ تمناؤں اور آرزوؤں کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ نظریہ درحقیقت خدا ناشناس انسان کے اس عزم کا اظہار ہے جس کے تحت وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ کائنات کسی اعلیٰ اور ارفع مدبر کی حسن تدبیر کا نتیجہ نہیں بلکہ بخت و اتفاق کا کرشمہ ہے۔ یہ ہے وہ طرز فکر جس کے مطابق اس نظریے نے ایک مقدس اعتقاد کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایک ایسا اعتقاد جو اگرچہ بڑا خوش آئند ہے اور اسے غیر معمولی قبولیت بھی حاصل ہے مگر جس کی تائید ٹھوس حقائق سے نہیں کی جا سکتی "

اس تفصیل سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ اولاً یہ کہ نام نہاد " معروضیت اور بے معقدیت " محض خیالی باتیں ہیں اور دوسری یہ کہ ملحدانہ و مادی معقدیت دراصل جدید جاہلیت کی پیداوار ہے۔

۱۔ Symbolism and belief ۲۔ Revolt against Reason - P-176

لہذا ادب اور وہ بھی اعلیٰ ادب کی تخلیق، بلند نصب العین اور خدا پرستانہ فکر سے حقیقی وابستگی کے بغیر ممکن نہیں۔ ان حقائق کے باوجود خدا سے باغی مارکسی ادب کو "ترقی پسندی" کا اور اوہام و خرافات سے پر اساطیری ادب کو "جدیدیت" کا لیبل لگا کر اسطرح پیش کیا جا رہا ہے کہ جیسے دنیا کے ادب میں اب ان سے بڑھکر کسی ادبی صداقت کا کوئی وجود ہی نہیں۔

احمد سجاد

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

حسن رضوی کی غزل

چند برس پہلے تک میں حسن رضوی کے نام اور کلام سے آشنا نہیں تھا۔ ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء میں انجمن ساداتِ امروہہ پاکستان کے زیر اہتمام کراچی میں دو مشاعرے منعقد ہوئے۔ اول الذکر حضرت جوش ملیح آبادی کی یاد میں اور ثانی الذکر سید غلام ہمدانی مصحفی کی یاد میں۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے لیکن ان دو میں سے ایک مشاعرے میں حسن رضوی کا کلام سننے کا مجھے اتفاق ہوا۔ مشاعرے کی واہ واہ میں بالعموم غزل کے حقیقی محاسن تک پہنچنا قدرے دشوار ہوتا ہے اور مجھے اس وقت یاد بھی نہیں کہ حسن رضوی نے کونسی غزل پڑھی تھی لیکن اتنا یاد ہے کہ حسن رضوی کی غزل نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا اور مشاعرے کے بعد یہی غزل ہماری باہمی ملاقات اور بات چیت کا سبب بنی۔ اس وقت سے لے کر آج تک میں نے حسن رضوی کی متعدد غزلیں سنی ہیں اور پڑھی ہیں اور مجھے اس کی غزل کا انوکھا پن، عصری حسیت کا شعر میں پیرایۂ اظہار اور خوش سلیقگی کے ساتھ لفظوں کو شعر میں برتنے کا ڈھنگ ہمیشہ پسند آیا ہے۔

آج ہمارے ادب میں جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع بھی کہا جا رہا ہے اور ترقی پسندی کا تضاد بھی۔ میں جدیدیت کو ہمیشہ ترقی پسندی کی توسیع ہی سمجھا ہے۔ شعوری سطح پر مسائل حیات کو پرکھے بغیر عصری حسیت کا کوئی مفہوم نہیں۔ ترقی پسند شاعری میں تو کوتاہی ان شعراء کی بدولت آئی تھی جنہوں نے اپنا ما فی الضمیر ضرورت سے زیادہ براہ راست انداز میں قاری تک پہنچانا چاہا۔ جہاں تک عصر حاضر کے مسائل کو دیکھنے کا تعلق ہے ترقی پسند شعراء اور جدید شعراء میں بحیثیت مجموعی کوئی فرق نہیں۔ نمایاں فرق سلیقۂ اظہار کا ہے۔ جدید شعراء جب ترقی پسند شعراء کی شاعری کو ہدفِ طعن و تشنیع بناتے ہیں تو فیض احمد فیض کا نام نہیں لیتے کیونکہ فیض کو وہ اپنے قبیلے ہی کا شاعر سمجھتے ہیں۔ یہاں میں فیض کے علاوہ دو اور

شاعروں کا بھی ذکر کروں گا جنہیں پہلے دور کی شاعری اگر ترقی پسند شاعری کی ذیل میں آتی تھی تو آج کے دور کی شاعری پر وہ چھاپ نظر آتی ہے جسے ہم جدیدیت کا نام دیتے ہیں مثلاً وہ ہیں سردار جعفری اور قتیل شفائی اور جب میں جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع کہتا ہوں تو اس کا سبب یہی ہے کہ ہماری شاعری میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے اتصال کی مثالیں جابجا نظر آتی ہے اور ان ہی مثالوں میں ایک تابناک مثال حسن رضوی کی شاعری کی ہے۔

جدیدیت کے علمبردار ہزار کہیں کہ ترقی پسند شاعری سیاست کے تابع ہے، اس لئے سچی اور کھری شاعری نہیں ہے لیکن اگر مسائل حیات میں یا مسائل عصر حاضر میں ایک مسئلہ سیاسی بھی ہے تو احقر کہنا ممکن ہے دراصل ترقی پسند شاعروں پر "الزام" یہ نہیں تھا کہ وہ سیاست سے وابستہ ہیں بلکہ معترضین کا واضح طور پر یا دبے الفاظ میں الزام یہ تھا کہ وہ کمیونزم سے وابستہ ہیں ورنہ اسلامی ادب، پاکستانی ادب یا انڈین لٹریچر کی چھوٹی بڑی تحریکیں اگر سیاسی نہیں تھیں تو غیر سیاسی بھی نہیں تھیں۔

حسن رضوی کی شاعری جو غم ذات اور غم کائنات کی شاعری ہے اسی معیار کے پیش نظر ترقی پسند شاعری بھی ہے اور جدید شاعری بھی لیکن چونکہ یہ نئی قسم کی ترقی پسند شاعری اور کھرے انداز کی جدید شاعری ہے اس لئے قاری کو نہ تو اس میں "بزن بزن بکش بکش" کا لہجہ نظر آئے گا اور نہ ہی ریت، سورج، سمندر، تنہائی، کنواں، جھاگ، ایسی علامتیں انبوہ در انبوہ نظر آئیں گی جو اصطلاحی جدید شعراء کے ہاتھوں میں آکر اپنے مفہوم سے عاری ہو چکی ہیں [1]

موضوع سیاسی ہو یا تہذیبی، اخلاقی ہو یا مذہبی، اس کا تعلق سائنس سے ہو یا آرٹ سے شعر میں اس کی پرکھ کا معیار صرف اس کا شاعرانہ اظہار ہے اور شاعرانہ انداز بیان کو دیکھتے وقت یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ یہ انداز بیان محض نقالی ہے۔ یا نئے پن کی مثال ہے۔ اس معیار کے پیش نظر جب ہم حسن رضوی کی غزلوں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں غم جاناں اور غم ذات کے ساتھ ہی ساتھ غم روزگار بھی جس کا تصور سیاسی مذہبی، اقتصادی، تہذیبی اور معاشرتی مسائل کی نفی کر کے نہیں ہو سکتا علامتی شاعری کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

---

[1] ہر شاعر کو ترقی پسندی یا جدیدیت کے عنوان میں فٹ کرنا ضروری نہیں ہے۔

ظلم کی یہ رسم آخر بھی ادا ہو جائے گی — لوگ کہتے ہیں حسن اس کو سزا ہو جائے گی۔

مصر کے بازار میں یوسف کو بکتے دیکھ لو — سوچتا ہوں پھول سے خوشبو جدا ہو جائے گی

پہلا شعر بظاہر براہ راست شاعری کی مثال ہے لیکن یہ وہ براہ راست شاعری نہیں ہے جو تہ در تہ معنویت سے خالی ہو۔ اسی لئے میں نے اسے بظاہر براہ راست شاعری کہا ہے کیونکہ یہ شعر براہ راست شاعری نظر آتا ہوا بھی کئی معنوی جہتوں کا حامل ہے اور یہی سچی غزل کی معراج ہے۔ دوسرے شعر میں مصر، یوسف، پھول، خوشبو یہ سب علامتیں ہیں جنھوں نے شعر میں بہ یک وقت کئی سطح کے مفہوم پیدا کر دیئے ہیں اور ہر مفہوم اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہے۔

اب اسی نوع کے چند اور شعر ملاحظہ کیجئے۔

آدمی ہی آدمی کے سائے سے گھبرائے گا — ہم نہ کہتے تھے حسن ایسا زمانہ آئے گا

خون ساون کی طرح برسے گا تپتی ریت پر — اور پھر یہ پیاس کا صحرا ہرا ہو جائے گا

اس پیڑ کی مٹی میں کوئی زہر ملا دے — جس پیڑ کی مٹی میں مری خاک ملی ہے

سنا ہے شہر میں پھر آج اسکا چرچا ہے — ہر ایک شخص کی آنکھوں میں خون اترا ہے

شجر شجر نے اٹھائے ہیں ہاتھ میں پتھر — ہر ایک شاخ کے چہرے کا رنگ بدلا ہے

مرا دشمن عجیب دشمن ہے — سامنے ہے دکھائی دیتا نہیں

چھڑک کے تیل خود اپنے ہی گھر جلاتے ہیں — ہم اپنے شہر میں جشن طرب مناتے ہیں

چند سکوں کے عوض وہ بک گیا بازار میں — اب بھروسا کیا کریں رضوی کسی کی بات کا

یہ حسن رضوی کی غزل کا ایک پہلو ہے جس میں قدم قدم پر عصری حسیت کے نو بہ نو ابعاد ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں ایسے اشعار کا ذکر میں خاص طور سے کرنا چاہوں گا جن میں حسن رضوی نے کسی علامت یا کسی تشبیہ یا کسی استعارے کا سہارا نہیں لیا۔ سامنے کی بات بہت سیدھے سادے لفظوں میں بیان کر دی ہے۔ لیکن ایسے اشعار کو ہم محض بیانیہ شاعری کہہ کے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بیانیہ شاعری کے اکثر نمونے ہمارے ادب میں اپنے بے ساختہ پن اور صوتی آہنگ کی بدولت انتہائی بلندیوں تک پہنچے ہیں۔ اقبال، میر اور

انیس کی شاعری میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ۔ ایسی بیانیہ شاعری کی مثالیں حسن رضوی کے یہاں بھی خالص غنائی شاعری کی صورت میں موجود ہیں ۔

چہروں سے بھی پڑھ لے کبھی گھر گھر کا فسانہ — آنگن میں ملکتے ہوئے بچوں کی صدا دیکھ

پڑھے لکھوں سے ان پڑھ بھلے حسن رضوی — سند کو پھاڑ کے تو مل میں نوکری کر لے

حسن رضوی نے کلاسیکی شاعری سے بغاوت نہیں کی بلکہ کلاسیکی روایت کو اپنا کر اسے اور آگے بڑھایا ہے اس کی شاعری جدت اور کلاسیکیت کا ایک خوبصورت سنگم بن گئی ہے ۔

محبوب کا ذکر یا غم جاناں ہماری غزل کا ایک خوبصورت روایت ہے اور یہ وہ روایت ہے جس کی بنیاد زندگی کی اٹل حقیقتوں پر ہے ۔ غزل میں اس روایت کی چمک دمک ہر دور میں لفظ کے تخلیقی استعمال کا مرہون منت رہی ہے ۔ کچھ مدت کے استعمال کے بعد لفظ کا تخلیقی استعمال اپنے رموز و علائم کے باوجود جب اپنا نیا پن کھو بیٹھتا ہے تو اس انداز کی ساری شاعری نقالی کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ داغ کے یہاں بھی رموز و علائم اپنی انتہا کو پہنچے لیکن انجام کار ان کے استعمال کا طلسم ٹوٹ گیا اور بے خود دہلوی ، نوح ناروی اور جوش ملیانی تک پہنچتے پہنچتے ان کی حیثیت محض ایک **لفظی تماشا** کی رہ گئی تھی ۔ داغ کے بعد اقبال نے ان ہی رموز و علائم اور تشبیہات اور استعارات کو ہاتھ میں لیا اور انہیں ایک بار پھر آسمان تک پہنچا دیا ۔ اقبال تو خیر بہت بڑا نام ہے ۔ ہر ادبی بحث میں اس کے کمالات کی مثال دینا ضروری بھی نہیں ، اختر شیرانی ، فراق اور فیض نے ان ہی رموز و علائم کے سہارے اردو شاعری کی کایا پلیٹ دی اور گویا فلابیئر کے اس مقولے پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ یہ فن کار کا قلم ہے جو لفظ کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے ۔ داغ اور اس کے بعد کی ساری ادبی روایت جو احسن مارہروی ، جلیل مانک پوری ، رسا رام پوری ، اصغر ، حسرت ، فانی ، یگانہ ، جگر اور فراق سے ہوتی ہوئی ہمارے دور تک پہنچی ، حسن رضوی کے سامنے تھی اس نے اسی روایت کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا اور اپنی غزل میں رموز و کنایات کی نئی چمک دمک اور نئی بو باس پیدا کی اور اس طرح کے اشعار ہمیں دیئے ۔

اسی کی چاندنی اب کھیل رہی ہے سینے میں
وہ میرا چاند جو نکلا تھا اس مہینے میں

ہوا کا بھیس بدل کر اسے تلاش کروں
وہ بادباں جو مرے ساتھ تھا سفینے میں

آج ہوا نے اس دھرتی پر جتنے رنگ بکھیرے ہیں
زردی مائل رنگ ہے میرا باقی سارے تیرے ہیں

گلشن ہے وہ گل ہے کہ محبت کی کلی ہے
چاندی کا وہ زیور ہے کہ سونے کی ڈلی ہے

جس شخص کی فرقت نے بنایا مجھے شاعر
اس شخص کو محبوب کوئی اور گلی ہے

میرے نزدیک تغزل روحِ شعر کا نام ہے ضروری نہیں کہ یہ شعری حسن صرف غزل ہی تک محدود ہو۔ تغزل نظم کی بھی جان ہے۔ اقبال بحیثیت مجموعی ایک نظم نگار شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی نظمیں تغزل کی کیفیت میں شرابور ہیں۔ اپنی بات کی وضاحت کیلئے میں اسطرح کی مثال بھی دے سکتا ہوں کہ "شمع اور شاعر" میں ایسے اشعار موجود ہیں۔

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے

لیکن میں یہاں بالخصوص تعقیبہ شاعری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی ایک نہایت خوبصورت مثال "ذوق و شوق" ہے اور جس میں اس طرح کے اشعار آتے ہیں۔

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

گاہ بحیلہ می برد گاہ بزور می کشد
عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب

دیدارِ عام، ساقیا، بسمل، بام، لیلیٰ، وصل، فراق، ہجر، لذت، وصال، نظر، بہانہ اور بے ادب ایسے الفاظ جب داغ کی شاعری میں آئے تو سوقیانہ اور عیاشانہ رنگ

اختیار کیا' وہ ہوس کی اور رندی کی شاعری کہلائی۔ اسے اخلاقی اعتبار سے ساقط المعیار قرار دیا گیا لیکن یہی تشبیہیں' استعارے' علامتیں رموز اور علائم جب اقبال کے یہاں آئے تو انہوں نے ساری شاعری کو جس میں نعتیہ شاعری بھی شامل ہے نئے ابعاد سے آشنا کیا۔ معلوم نہیں مجھے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے یا نہیں کہ اکثر نعتیں ایسی بھی میری نظر سے گزری ہیں جن میں رسول اکرمؐ کے تعلق سے زلفوں اور چہرے کا ذکر اس طرح سے آیا ہے کہ احترام کے عوض ان میں سوئے ادب کا پہلو نمایاں ہو گیا ہے۔ میں ایسی نعتیں لکھنے والے شعرا کے خلوص' عقیدت اور پختگی ایمان کو شک کی نظر سے نہیں دیکھتا لیکن ان کا پیرایہ بیان یا سلیقۂ اظہار میری نظر میں مشتبہ اور مشکوک ہے۔ اس کیفیت کی موجودگی میں جب حسن رضوی کا نعتیہ کلام میری نظر سے گزرا تو مجھے یک گونہ مسرت ہوئی۔ ان کے نعتیہ کلام میں اظہار عقیدت اور اظہار خلوص تو ہے ہی ' شاعرانہ اعتبار سے بھی یہ کلام تغزل میں رچا ہوا ہے اور ایک ایسے انوکھے انداز کا حامل ہے جس سے خالص شاعری میں ایک خوبصورت جہت کا اضافہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر حسن رضوی کی یہ نعت دیکھئے۔

کبھی خیال میں کچھ اسطرح سے ڈھلتا ہے
کہ چاندنی کے وہ ہر شام کو نکلتا ہے

ہر ایک صبح مجھے صبح نو کا مژدہ ہے
کہ شب کو نام لوں تیرا تو دن نکلتا ہے

درود اس کے لئے ہے سلام اسکے لئے
کہ جس کے نور سے گھر گھر چراغ جلتا ہے

اداسیوں کا سمندر ہے اور تنہائی
میں تیرا نام نہ لوں یاں تو دم نکلتا ہے

ملی ہیں مجھ کو وہ کرنیں حضور کے در سے
کہ جن کو دیکھ لے سورج تو رخ بدلتا ہے

میں پنجتن کی گلی کا فقیر ہوں رضوی
مری صدا پہ زمانہ روش بدلتا ہے۔

ایک تعارف

جناب حکیم افتخار فخر

تابش مہدی

نوٹ:۔ یہ مقالہ پاکستان کے نامور شاعر جناب افتخار فخر کی دیوبند تشریف آوری کے موقع پر ادارۂ ادب اسلامی ہند کی طرف سے منعقدہ اعزازی و استقبالیہ اجتماع میں پڑھا گیا — تابش مہدی

ادب کا سماج اور معاشرے سے بڑا گہرا ربط ہے ۔ اب یہ بحث دم توڑ چکی ہے کہ ادب برائے ادب ہونا چاہیے یا برائے زندگی ۔؟

یہ حقیقت سورج کی طرح روشن ہو چکی ہے کہ ادب کی تخلیق زندگی اور اس کے مسائل کے لئے ہونی چاہیے اور ادب کو محض ایک شغل یا تفریح کے لئے بے مقصد تخلیق کرنا تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں ۔

البتہ اب یہ بحث خاصا زور پکڑ چکی ہے کہ ادب کو کس قسم کے مسائل زندگی کے لئے تخلیق کیا جائے روٹی کپڑا اور مکان بھی انسانی زندگی کے اہم مسائل ہیں اور انسانوں کی خیر و فلاح اور عروج و ارتقا بھی ایک گروہ پوری قوت کے ساتھ اس بات کا مدعی ہے کہ ادب کو انسان کی معاشی زندگی کے مسائل کیلئے ہی تخلیق کیا جائے ۔ اس لئے کہ یہ انسانی زندگی کا اہم و ناگزیر ضرورت ہے ۔

اگرچہ یہ دعویٰ کافی حد تک دلیل و برہان کی دولت سے محروم ہے ۔ تاہم اس کی ظاہری کشش کی وجہ سے انسانوں کا ایک بڑا طبقہ اسی گروہِ ادب سے اپنا رشتہ جوڑ چکا ہے اور آج کے سماج اور معاشرے پر کافی حد تک اثر انداز بھی ہے ۔

دوسرا گروہ اپنے دامن میں ٹھوس دلائل و براہین رکھتا ہے ۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ادب کی تخلیق انسانی زندگی کے اعلیٰ اور بلند مقاصد کے حصول کے لئے ہونی چاہیے ۔ محض انسانی زندگی کے معاشی و اقتصادی مسائل کیلئے ادب کی تخلیق کرنا انسانیت کی عظمت و رفعت کے منافی ہے اس سے بہتر تو یہ ہے کہ آدمی اینٹ اور گارے کا کام کرنے لگے ۔ بقول ماہر القادری کہ

کہیں روٹی کہیں پیسہ خدا ہے نہ جانے آدمی کیا ہو گیا ہے ۔

ادب کا صحیح اور حقیقی مصرف یہ ہے کہ اسے انسانوں کی خیر و فلاح اور عروج و ارتقاء کے لئے تخلیق کیا جائے۔

میں ادب کے اسی ثانی الذکر گروہ سے تعلق رکھتا ہوں، اور اسی سے وابستگی میں اپنی اور پوری انسانی دنیا کی معراج تصور کرتا ہوں۔ ادب نے ملت کی فلاح اور معاشرے کی ذہنی و فکری اصلاح و تطہیر میں ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور دنیا میں بڑے بڑے انقلابی کارنامے انجام دیئے ہیں۔

انسانی زندگی کے حقیقی عروج و ارتقا سے ادب کا رشتہ استوار کرنے والے شاعروں میں خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

اس سے کچھ ادھر آجایئے تو اس منزل کی رہروؤں میں شفیق جونپوری، ماہر القادری، عامر عثمانی، انور اعظمی، فاروق بانسپاروی، نعیم صدیقی، حفیظ میرٹھی، ابوالمجاہد زاہد اور ابن فریدآبادی بھی نظر آئیں گے۔ یہ وہ خوش نصیب شعراء ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کو انسانوں کے عروج و ترقی کیلئے وقف کر دیا ہے۔ پاکستان کی شعری فضا میں ادب کا یہ رجحان کافی حد تک بیدار اور متحرک ہے

جناب اعجاز رحمانی، رحمانی کیانی، پروفیسر فروغ احمد اور اقبال عظیم وغیرہ کے نام بڑی ذمہ داری کے ساتھ پیش کئے جاسکتے ہیں۔ پاکستان کے مشہور شاعر جناب حکیم افتخار فخر بھی شاعروں کے اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے اپنی شعری اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعہ سماج میں تہذیب و تمدن اور اخلاق و کردار کی قندیلیں روشن کی ہیں۔

آج کی صحبت میں میں جناب حکیم افتخار فخر کے تعلق سے گفتگو کروں گا۔

جناب افتخار فخر عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں آدمی نہ تو بوڑھا کہلوانا پسند کرتا ہے اور نہ نوجوان۔ مگر ان کے اشعار میں بلا کی جوانی اور توانائی پائی جاتی ہے اور یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جناب افتخار فخر جیسے صالح فکر و خوش اطوار شعراء جس ملک اور معاشرے میں بھی موجود ہوں گے وہ ملک یا معاشرہ عروج و ارتقا اور تہذیب و تمدن کی بلندیوں کو چھوئے بغیر نہیں رہے گا۔

جناب فخر سے میرا کوئی خاندانی یا قرابتی رشتہ نہیں ہے لیکن میں نے جب بھی کبھی کسی رسالہ یا اخبار میں ان کی کوئی غزل پڑھی، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ میرے اپنے ہیں اور ان سے میری شناسائی اور قربت آج سے نہیں برسوں سے ہے۔

یہ راز تو ابھی چند ماہ قبل میرے قابلِ احترام و شفیق رفیق جناب علامہ عنایت اللہ گجراتی کے خط سے ہوا کہ موصوف بھی اقامتِ دین و نظامِ اسلامی کے داعی اس تحریک سے فکری وابستگی رکھتے ہیں۔ جس سے وابستہ ہوکر ہم جیسے لاتعداد مردانِ مصلحت ناشناس نے اپنی دنیا خطرے میں ڈال لی ہے۔ آخرت کا معاملہ تو خدا کے سپرد ہے، بڑے سے بڑا دل و زاہد شب زندہ دار بھی قطعی طور پر اپنے بارے میں نہیں بتا سکتا کہ آخرت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

جناب حکیم افتخار فخر ۱۹۳۲ء میں سڈھوڑہ ضلع انبالہ میں پیدا ہوئے اور تقریباً نو سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کو ہجرت کی۔ موصوف کا خاندانی تعلق سہارنپور سے ہے۔ جناب حکیم افتخار فخر نے اپنے والدِ محترم سے طب پڑھی اور باقاعدہ اے کلاس کی سند حاصل کی۔ اور ۱۹۶۲ء سے منڈی بہاء الدین ضلع گجرات (صوبہ پنجاب) میں ایک کامیاب طبیب کی حیثیت سے مطب کر رہے ہیں۔

فخر صاحب کی شاعری کا آغاز ۲۰ سال کی عمر ۱۹۵۲ء میں ہوا اور منڈی بہاء الدین کے کہنہ مشق شاعر جناب ڈاکٹر امین احمد صاحب شوق مرادآبادی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

موصوف کی تخلیقات ہند و پاک کے کثیر الاشاعت جرائد جیسے بیسویں صدی دہلی، ادبی دہلی، صبح امید بمبئی، اوراق لاہور، اخبار خواتین لاہور، سیارہ لاہور، شام و سحر لاہور، محفل لاہور، افکار کراچی، ایشیا لاہور، آئین لاہور، جسارت کراچی، تکبیر کراچی، مشرق کراچی و لاہور وغیرہ میں بکثرت شائع ہوتی رہی ہیں۔

حکیم صاحب سے جب ان کی تحریکی زندگی کے تعلق سے پوچھا تو بتایا۔

"چونکہ میرے والد صاحب اور دادا محترم دونوں ہی دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور گھر کا ماحول ہمیشہ سے ہی تحریکِ اسلامی اور اس کے قائد کے حق میں معاندانہ

رہا ہے اس وجہ سے مجھے تحریک اسلامی کا لٹریچر پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا نتیجتہً میں بھی کافی حد تک تحریک اسلامی اور اس کے قائد کا معاند و مخالف رہا ہوں لیکن والد محترم کے بعد جب گھر کا ماحول کس قدر "آزاد" ہوا اور میں نے مولانا مودودیؒ کی کتابیں پڑھیں تو ساری غلط فہمیاں ختم ہوگئیں اور معاندت معاونت میں بدل گئی اور پھر یہ بھی ہوا کہ ۱۹۶۳ء میں میں متفق کا فارم پُر کر کے عملی طور پر بھی اقامتِ دین و نظامِ اسلامی کے جد و جہد میں لگ گیا ۔

یوں تو فخر صاحب نظم کے بھی شاعر ہیں اور نعت و منقبت کے بھی مگر وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں غزل کے معنی لغت والوں نے "بہ محبوب گفتن" (یعنی محبوب سے باتیں کرنا) لکھا ہے ۔ فخر صاحب نے بھی دوسرے شعرا کی طرح غزل کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے ۔ مگر فرق یہ ہے کہ انہوں نے اپنے نصب العین اور مقصدِ زندگی کو اپنا محبوب تصور کیا ہے اور اسی کے زلف و گیسو سنوارنے کی کوشش کی ہے اور ان کا نصب العین یہ ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں صرف اور صرف خدا ہی کا قانون چلے ، اس کی غلامی اختیار کی جائے ۔ نیک چلنی ، خوش اطواری عام ہو اور باہمی محبت و مواخات کے جذبہ کو فروغ دیا جائے اور گندی یا باطل سیاست کے بجائے صالح سیاست کو ہر مسلمان اپنا قیمتی لباس تصور کرنے لگے ۔

میں اپنے اس دعوے کی تائید کے لئے ان کے مندرجہ ذیل اشعار کا سہارا لوں گا ۔

- تیرا ہی عمل حشر میں کام آئے گا تیرے ۔۔۔ بھائی بھی تجھے اپنی کمائی نہیں دے گا ۔
- ہر ایک شخص کو راس آ گیا لہو کا لباس ۔۔۔ جسے بھی دیکھئے مصروف اپنے قتل میں ہے
- آسماں کی سمت پھینکے تھے زمیں سے بھی گئے ۔۔۔ آدمیت کو بہت یہ انتقا مہنگا ۔۔۔ پڑا
- وہ ترکِ تعلق پہ بضد ہونے لگے ہیں ۔۔۔ میں چاہتا ہوں حلقۂ احباب نہ ٹوٹے
- یہاں ہر پل مسافت اور ویرانی کا دھڑکا ہے ۔۔۔ فضاؤں میں لفظ ہجرت سرخیوں سے لکھا گیا

بلا شبہ افتخار فخر تعمیر پسند شعراء میں اہم اور نمایاں مقام و مرتبہ کے شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں وہی کیفیت و لذت ہے جو ایک ایسے شاعر کی شاعری کے لئے ضروری ہے

جو شاعری میں اصلاح دلتیر کا عنصر غالب ہونے کے ساتھ ساتھ شعریت، گیرائی اور علمی و فنی رکھ رکھاؤ کا بھی مدعی ہو۔

ان کے کلام کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل نہیں ہے کہ وہ حال کے بھی شاعر ہیں اور مستقبل کے بھی۔

بقول انہیں کے : ؎ میں اپنے شعر کے پردے میں اب بھی زندہ ہوں
یہ اور بات کہ مرحوم ہو گیا ہوں میں

غزل

نعمان شوق

ویسے تو مسافر کو لگی پیاس بہت ہے
دریا بھی ملے گا کہیں یہ آس بہت ہے

چھوٹے سے اک آنگن میں کھلے پھول مرے بچے
اس گھر کی فضاؤں کو مرے راس بہت ہے

یہ بات الگ ہیکہ نظر دیکھ نہ پائے
تم دور سمجھتے ہو جسے پاس بہت ہے

افسوس اسے کم نہیں کچھ اپنے کئے پر
مجھکو بھی رہی بھول کا احساس بہت ہے

مانگی تھی جہاں پھولنے پھلنے کی دعائیں
اس گھر کے دریچوں پہ جمی گھاس بہت ہے

ہر شئے میں ترا حسن ہے ہر شئے میں ترا عکس
اس گاؤں کی ہر چیز مجھے راس بہت ہے

تم اپنے حسیں ہونٹ پہ مہریں نہ لگاؤ
کانوں کو مرے ان کی صدا راس بہت ہے

ممکن ہیکہ تو لوٹ کے آجائے کسی روز
جینے کیلئے دل کو یہی آس بہت ہے

تم کچھ نہیں پاؤ گے بڑے لوگوں سے مل کر
دیوار ہے اونچی مگر افلاس بہت ہے

شمیم نصرتی

گتھیوں کا سوداگر

مجتبیٰ حسین کے نام کے ساتھ ہی اکثر لوگوں کے لبوں پر تبسم بکھر جاتا ہے۔ جو مجتبیٰ حسین کے پسندیدہ مزاح نگار و طنز نگار ہونے کا مظہر ہے۔ مجتبیٰ اردو ادب کے بلند پایہ فنکار اور عظیم مزاح نگار ہیں۔ وہ دنیائے ادب میں ایک ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ان کے فن اور شخصیت کو عالمی سطح پر روشناس ہونے کیلئے قطعی کسی سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہی البتہ ان پر قلم اٹھانے والے مجتبیٰ حسین کا سہارا لے کر دنیا ادب سے متعارف ہو سکتے ہیں۔ جب فنکار فن کی حدود کو چھو لیتا ہے تو اس کے قلم سے نکلا ہوا یہ لفظ اس کے مداحوں کے لئے باعث فخر و مسرت ہونے کے ساتھ ساتھ سامانِ فکر بھی مہیا کرتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے اکثر مضامین میں یہی بات پائی جاتی ہے۔ کسی فنکار پر قلم اٹھانے والے اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے پوری طرح باخبر رہتے ہیں اور نتیجتاً ان کے احساسات اور جذبات بہت حد تک اس فنکار کی شخصیت سے متاثر ہونے کے علاوہ تعلقات کی بناء پر اس کی ذات سے عقیدت اور محبت کے جذبہ کے تحت داد تحسین پیش کرتے ہیں لیکن میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ مجتبیٰ حسین سے میرے کسی بھی قسم کے جائز یا ناجائز تعلقات نہیں ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے مضامین میں زندگی کے وہی مسائل و واقعات ملیں گے جو انسان کا مقدر بن چکے ہیں جن کی گتھیوں کو وہ سالہا سال سے سلجھانے کی مسلسل جد و جہد کر رہا ہے لیکن گتھیاں سلجھنے کے بجائے اور الجھتی جا رہی ہیں۔ مجتبیٰ ان ہی گتھیوں کو اپنے طنز و مزاح کا ذریعہ بناتے ہیں اور ایک پراگندہ ذہن۔ قاری بھی، جو کشمکشِ حیات سے تنگ آ چکا ہو

مضمون اور افکار میں برابر کے حصہ دار بن جاتے ہیں۔ مجتبیٰ کی سماج کی ظاہری اور پوشیدہ مصائب پر بڑی گہری نظر ہے وہ سماج کی ظاہری چمک دمک سے قطعی مرعوب نہیں ہوتے بلکہ اپنے ماحول کی گہرائیوں میں ڈوب کر زندگی کے مسائل کو اپنی فکر اور ذہن رساں کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور نتائج کو انتہائی سادگی اور معصومیت سے دلکش انداز میں قارئین کے آگے پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ قاری کے دل و دماغ پر ایک گہرا تاثر چھوڑتا ہے اور قاری کے ذہن میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسی کیفیت دستی قاری عالم میں خود کو مسرور پاتا ہے یا پھر ملول ہو جاتا ہے۔ قاری میں جذبۂ مسرت کا پیدا ہونا مجتبیٰ کے کمال فن اور اعلیٰ مزاح کا جادو ہے۔ قاری کا رنجیدہ خاطر ہونا ان کے تیکھے طنز کا اثر ہے۔ مجتبیٰ جہاں قاری کو ہنسا سکتے ہیں وہیں رُلانا بھی خوب جانتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین پوری محفل اور حاضرین محفل کے دل و دماغ پر چھا گئے پڑھنے کے عادی ہیں۔ جس طرح ایک غزل کو ایک نہایت خوش الحان شاعر اپنے سحر انگیز ترنم میں لہک لہک کر پڑھتا اور دادِ تحسین حاصل کرتا ہے اسی طرح مجتبیٰ اپنے حسین اور جامع مضمون کے حسن کو اپنے منفرد پڑھنے کے انداز سے دوبالا کر دیتے ہیں اور اپنے طنز و مزاح سے بھرپور شگفتہ و برجستہ جملوں کو ایک انوکھے انداز میں رول رول کر پڑھتے اور سامعین سے دادِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔ جب وہ مضمون پڑھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شاعر اپنی گمبھیر اور مچی تلی آواز میں نظم آزاد سنا رہا ہو۔ ایک مرتبہ میں احباب کے ساتھ بیٹھ کر پروگرام سن رہا تھا جوں ہی اناونسر نے یہ اعلان کیا کہ مجتبیٰ حسین اپنا تازہ مضمون سنائیں گے میرے ایک ساتھی نے فوری ہنسنا شروع کر دیا اور مسلسل ہنسنے لگے۔ ہنسی کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے کہ "کمبخت" اس انداز سے مضمون شروع کرتا ہے کہ پہلے ہی جملے پر ہنسی پھوٹ پڑتی ہے۔ اس لئے میں ہنسنے کا ریہرسل کر رہا ہوں تاکہ اس "ظالم" کے مضمون کا پوری طرح ساتھ دے سکوں اور میرا تو یہ خیال ہے کہ اس شخص کا نام بجائے "مجتبیٰ حسین" کے "قہقہہ" رکھ دینا چاہئے۔ لفظ کمبخت اور ظالم

کوئی شریف آدمی کسی شریف آدمی کے لئے خواہ مخواہ استعمال نہیں کرتا۔ مجتبیٰ حسین یقیناً قصوروار ہیں اور ان کا قصور یہ ہے کہ وہ خود روتے ہیں اور دوسروں کیلئے سامان مسرت مہیا کرتے ہیں وہ خود خون کے گھونٹ پیتے ہیں اور دوسروں کو اپنے چنندہ اور موزوں الفاظ کے پاکیزہ پیالوں میں اپنے مزاح کی دلکشی، طبیعت کی شگفتگی، محاوروں کی برجستگی، طنز کی تلخی زبان و بیان کی شیرینی مشاہدات و محسوسات کی عکاسی کے آمیزش سے تیار کردہ شراب پلا دیتے ہیں جس کو پینے کے بعد حساس قاری عالم کیف و سرور میں مدہوش غموں کو بھول کر قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مجتبیٰ حسین انتہائی کم عمری میں ایک عظیم فن کار بن چکے ہیں۔ ۵۰ یا ۶۰ سال کی عمر ایک عظیم فنکار یا تخلیق کار کے لئے نہایت ہی مختصر ہوتی ہے۔ معدودے چند فنکاروں کو اس قدر قلیل عرصہ میں یہ اعلیٰ و ارفع مقام ملا ہے۔ آپ نے مشہور ضرب المثل ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ضرور سنی ہوگی۔ مجتبیٰ حسین کی ابتدائی تخلیقات ہی سے اس امر کا اندازہ ہو چکا تھا چنانچہ ان ہی چکنے پات کی طرف اردو زبان کے شہرۂ آفاق ادیب کرشن چندر نے عثمانیہ میڈیکل کالج کے ادبی اجلاس میں اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجتبیٰ حسین میں ایک عظیم فن کار پل رہا ہے اور ان کے قلم سے اردو زبان کو بہت زیادہ توقعات وابستہ ہیں۔ اگر کرشن چندر کے حسب بالا بیان کی روشنی میں مجتبیٰ کے مختلف تخلیقات میں اس عظیم فن کار کو تلاش کیا جائے

تو مجتبیٰ کا مقام اپنے ہمعصروں میں اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔

جب کرشن چندر نے انہیں اپنا پہلا مجموعہ "تکلف برطرف" چھپوانے کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے کرشن چندر ہی سے تعارف لکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر کرشن چندر عارضۂ قلب میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے تعارف نہ لکھ سکے۔ اور مجتبیٰ حسین کو کوئی ایسی شخصیت نہ مل سکی جو ان کا مکمل طور پر تعارف کروا سکے۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنا تعارف "مجھ سے ملیے" کے عنوان سے اس طرح کروایا ہے"

" ان میں سے بعض مجھے ایک میل کی دوری سے جانتے تھے اور بعض ایک فٹ کی قربت سے لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو مجھے اچھی طرح جانتا ہو۔ لیکن

ایک شخص مجھ سے اچھی طرح واقف ہے اور اتفاق سے یہ شخص میں ہی ہوں۔ اگر اپنے تعارف کے سلسلے میں کسی درمیانی شخصیت کا وسیلہ ڈھونڈتا تو مجھے یقین ہے کہ یہ شخص مرنے کے بعد دوزخ میں جاتا کیونکہ یہ شخص میری ایسی صفات کا ذکر کرتا جو مجھ میں قطعاً نہیں ہیں"

مجتبیٰ حسین نے اس مضمون میں اپنا تفصیلی تعارف نہایت ہی جامع الفاظ میں کر دیا ہے اور اپنی ذات سے ذرہ برابر بھی رعایت نہیں کی ہے۔ نوعمری کے دلچسپ واقعات اسکول اور کالج کے ہنگاموں کے تذکرے سے مجتبیٰ حسین کی لاابالی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ کالج کے اساتذہ مجتبیٰ حسین کی شرارتوں سے تنگ آ کر خفیہ طور پر ہر سال ان سے اس بات کا معاہدہ کر لیتے تھے کہ وہ حتی الامکان اس بات کی کوشش کریں کہ کلاس روم میں داخل نہ ہوں لیکن ان اساتذہ کو کبھی اس بات کا گمان نہ ہوا ہوگا کہ کلاس روم میں پٹاخے چھوڑنے والا کتے بلیوں اور بندروں کی آوازیں نکالنے والا مجتبیٰ اپنے وقت کا بڑا نباض اور سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھنے والا ایک عظیم مزاح نگار و طنز نگار بن جائے گا۔

انسان کا جذبۂ غم جس قدر معتبر ہوتا ہے جذبۂ خوشی اس قدر معتبر نہیں ہوتا۔ لیکن اس جذبۂ مسرت میں بہت زیادہ کیف و سرور پایا جاتا ہے جس کی بنیاد جذبۂ غم پر ہوتی ہے۔ اگر انسان کو طنز کی تلخیوں کا اندازہ نہ ہو تو وہ مزاح کی چاشنی بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ مجتبیٰ بھی اسی نظریہ کے حامل ہیں اور وہ اپنے مزاح کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"میرے نزدیک مزاح انسان کے پیمانۂ وجود کے لبریز ہو کر چھلک پڑنے کا نام ہے۔ جب انسان کے وجود کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے تو وہ قہقہوں کی شکل میں چھلکنے لگتا ہے۔ لوگ مزاح کی کیفیت کو معمولی کیفیت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سچا مزاح وہی ہے جس کی حدیں سچے غم کی حدوں کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ زندگی کی ساری تلخیوں اور اس کی تیزابیت کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد جو آدمی قہقہہ کی طرف جست لگاتا ہے وہی سچا اور باشعور قہقہہ لگا سکتا ہے۔ ہنسنے کے لئے جس قدر گہرے شعور اور ادراک کی ضرورت ہوتی ہے اتنے گہرے شعور کی ضرورت شاید رونے کے لئے درکار نہیں ہوتی"[۱]

مجتبیٰ حسین نے اپنے مزاح کی جن جامع الفاظ میں تعریف کی ہے اگر ہم اس پر سنجیدگی سے غور کریں تو ہمیں اس بات کا پتہ چلے گا کہ وہی شخص زندگی میں قہقہے لگا سکتا ہے جو اپنی مختصر سی زندگی میں پیش آنے والے تلخ و تند واقعات زمانے کی شاطرانہ چالوں، احباب کے طعنوں، سماج کی پستیوں اور زندگی کی تلخیوں کے ساتھ بالکل اسی طرح سمجھوتہ کر لے جس طرح اپنے وقت کے عظیم مزاح نگار و طنز نگار مرزا غالب نے

"بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

کہہ کر زندگی کے تمام تلخ حقائق سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

مجتبیٰ حسین نے بھی زندگی کی تمام تلخیوں سے مکمل مفاہمت کر لی ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی مختصر سی زندگی کو قہقہوں سے مالامال کر لیا ہے اور وہ ان ہی قہقہوں کو دنیا کے کئی غمزدہ انسان کی خدمت میں اپنے خوبصورت مضامین کی شکل میں بطور تحفہ پیش کر دیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے مضامین کی معیار کے لحاظ سے درجہ بندی کرنا نہایت مشکل ہے۔ ان کا ہر مضمون خوب سے خوب تر ہوتا ہے۔ میرے محدود مطالعے میں جو مضامین آئے ہیں ان میں سندباد جہازی کا سفرنامہ "ریلوے منتری مسافر بن گئے" "میں اور میرا مزاح" "پر کٹے والے" "مجھ سے ملئے" "ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے" "ڈاکٹروں کے مہمان" "اس دور میں ہوتے حاتم طائی" طنز و مزاح کی اچھی مثالیں ہیں۔ مجتبیٰ نے اپنی شخصیت میں پائے جانے والے طنز و مزاح کے جراثیم کو ان مضامین میں نہایت ہی خوبصورت انداز میں منتقل کر دیا ہے۔ سندباد جہازی کا سفرنامہ "ہمارے قومی مزاج اور ان سفید پوش لیڈروں پر گہرا طنز جو رہنماؤں کے روپ میں رہزنوں کا کردار ادا کرتے ہیں اور جن کی ہوسناکی نے ہندوستانیوں کو ہزاروں ہولناک فسادات کی آگ میں جھونک دیا۔ اور جن کے ایک شیطانی اشارہ پر ہزاروں انسانوں کے سروں کی فصلیں کاٹ لی جاتی ہیں۔ ہزاروں معصوم شیر خوار یتیم و یسیر کر دیئے جاتے ہیں اور سیتا کی اس مقدس سرزمین پر سینکڑوں ماؤں اور بہنوں کی بڑے ہی اہتمام سے برسرِ عام عصمتیں لوٹ لی جاتی ہیں۔ یہ قتل عام کس قدر منظم پیمانے

اور کسقدر اہتمام سے کئے جاتے ہیں آپ مجتبیٰ حسین ہی سے سنیئے۔
"اس پر لیڈر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا " مسٹر سندباد آپ کس قسم کا فساد دیکھنا پسند کریں گے"۔ میں نے پوچھا " آپ کے پاس فساد کی کتنی قسمیں ہیں"؟ وہ بولا اے کلاس سے لے کر زیڈ کلاس تک (فساد کی کئی قسمیں ہیں) افواہی فساد، تباہی فساد، خواہی نخواہی فساد، واہی تباہی فساد، ایک قسم ہو تو گناؤں بھی۔ یہ بتائیے آپ سیدھا سادہ فساد دیکھنا پسند کریں گے یا ایکدم ہنگامہ خیز"! میں نے پوچھا۔ ان دونوں فسادات میں کیا فرق ہے"؟ وہ بولا" سیدھا سادہ فساد دراصل ہنگامہ خیز فساد کا ٹریلر ہوتا ہے اسمیں صرف دوکانات اور مکانات جلائے جانے کے علاوہ انسانوں کا خون بھی بہایا جاتا ہے۔ ان کی پیٹھوں میں چھرے گھونپے جاتے ہیں۔ بچوں کو ذبح کیا جاتا ہے۔ عورتوں کی عصمتیں بڑے ہی اہتمام سے لوٹی جاتی ہیں اور یہ فساد (Only for Adults) ہوتا ہے"۔ اسی مضمون میں وہ آگے لکھتے ہیں کہ اچانک سڑک پر ایک اسکوٹر کی دوسری اسکوٹر سے ٹکر ہوگئی۔ کسی نے چیخ کر کہا " جس اسکوٹر نے ٹکر دی وہ مسلمان اسکوٹر ہے۔ کسی نے کہا" جی نہیں یہ ساری کارستانی ہندو اسکوٹر کی ہے"۔ ہم اپنے مذہب پر اتنے بڑے حملے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ حالانکہ میں نے کلاک ٹاور پر سے دیکھا دونوں اسکوٹروں پر لیڈروں کے آدمی ہی تھے۔ میں کلاک ٹاور پر سے چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ میں دھوکہ دہی کے ذریعہ ہونے والا فساد دیکھنا نہیں چاہتا۔ اسی اثنا میں ایک چاقو فضا میں چمک اٹھا۔ پھر آن کی آن میں فضا میں چاقو لہرانے لگے۔ برچھے بھالے بھی فضا میں بلند ہوئے۔ ہندو چاقو مسلمان کی گردن تلاش کرنے لگے۔ اور مسلمان چاقو ہندو کی گردن تلاش کرنے لگے۔ حسب بالا جملوں میں طنز کی گہرائی اور تلخی مجتبیٰ حسین کے عظیم طنز نگار ہونے کا مظہر ہے۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے دور کو خوب پہچانا ہے ، اور مصلحتاً انہوں نے سماج کی پستیوں سے مفاہمت بھی کرلی ہے۔ اس لئے سماج نے انہیں اپنا سمجھا اور انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے ماحول کی گہرائیوں میں ڈوب کر قوم اور سماج

کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے طنز کے تیر و نشتر سے اور مزاح کی چاشنی سے انتہائی ہلکے پھلکے انداز میں اپنے پورے ماحول کی پوشیدہ گندگیوں اور برائیوں کو عوام پر ظاہر کر کے انہیں سماج دشمن عناصر سے پوری طرح باخبر کردیا اس کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ "میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ مزاح کا مقصد قوم کی اصلاح ہونا چاہئے" ایک حساس ذہن رکھنے والے قاری کو فوری قہقہے لگانے پر مجبور کردیتا ہے۔

جینوا کانفرنس

مقبول فاروقی

تم تو دونوں مسخرے ہو
ایک سرکس کے
تماشہ دیکھنے والوں کی دلچسپی کی خاطر
کیسے کیسے سوانگ بھرتے ہو۔
کبھی اک دوسرے سے پیار کرتے ہو۔
کبھی ایک دوسرے پر وار کرتے ہو۔
تمہاری دوستی جھوٹی۔
تمہاری دشمنی بھی ایک ناٹک ہے۔
تمہارے ہاتھ میں یہ جو چھڑی ہے۔
جس سے تم اک دوسرے کو مارتے ہو۔
وہ بہت آواز کرتی ہے۔
تمہیں اس سے ذرا سی چوٹ بھی آتی نہیں لیکن
تماشہ دیکھنے والے۔
خصوصاً چھوٹے بچے۔
چونک پڑتے ہیں۔
تمہارا کام ہی ہے سب کو چونکانا۔

ادھر جب بھی
تماشائی
کوئی سنجیدہ منظر دیکھنے میں محو ہوتے ہیں۔
تو تم دونوں
وہاں سے بھاگ جاتے ہو۔
کہیں پردے کے پیچھے بیٹھ کر
آپس میں شاید مشورہ کرتے ہو۔
"اسکے بعد جاکر کونسا کرتب دکھائیں؟
کسطرح لوگوں کو چونکائیں؟
تمسخر اور حیرت کے سمندر میں ڈبو دیں؟"
پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے
ہاتھوں میں تلواریں لئے
آتے ہو تم دونوں
ذرا سے سبب کی خاطر
الجھ جاتے ہو
پھر اک دوسرے پر وار کرتے ہو۔
نہایت الٹے سیدھے ہاتھ دکھلاتے ہو۔
ویسے یہ تماشہ ٹھیک ہے لیکن
کہیں ایسا نہ ہو
اس مسخرے پن میں
کوئی وار ایسا کر بیٹھو
کہ اس سرکس کے عالیشان خیمے کی طنابیں ہی نہ کٹ جائیں!
بہت سے لوگ بیٹھے ہیں ۔۔۔!!

محسن جبلکانوی

جارج برنارڈ شا

جارج برنارڈ شا آئرلینڈ کا باشندہ تھا لیکن اس کی شخصیت کسی ایک قوم، ملک یا سرحد میں محصور نہ تھی۔ برنارڈ شا اپنے فن اور فکر و نظر میں بہت پرخلوص تھا۔ اس نے تھیٹر کی تر… قدروں میں اپنے فلسفہ کو بڑے ہی سلیقہ سے سمودیا اور اسٹیج کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اس کا یہ جذبہ اس کی تمام تحریروں میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ برنارڈ شا نے نت نئے تجربے کئے ہیں اور ڈرامہ کے فن کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ تھیٹر، اسٹیج اور ڈرامہ نگاری کو اس نے جن اچھوتی قدروں سے روشناس کیا انہیں آخری لمحوں تک اپنے کلیجہ سے لگائے رکھا برنارڈ شا مذہبی جنونیوں رجعت پسندوں کا سخت مخالف تھا۔ اس کے فن میں نفرت، حقارت اور تشدد کے جذبوں کیلئے کوئی جگہ نہ تھی۔ شا کی طبیعت میں بے باکی، نڈرپن اور اعلیٰ حوصلگی بدرجہ اتم موجود تھی، یہی وجہ تھی کہ اس نے فرسودہ رجحانات رکھنے والی قوتوں، فاشسٹ تنظیموں اور بورژوا تحریکوں کی بغیر کسی جھجھک کے مذمت کی اور جہاں کہیں تسلط، زیادتی اور استحصال نظر آیا اس نے مخالفت میں آواز اٹھائی اور اپنے دانشورانہ تدبیر پر کبھی آنچ نہ آنے دی۔

جارج برنارڈ شا کے ابتدائی ڈراموں میں ARMS AND THE MAN ایک ایسا ڈرامہ تھا جو عوام کی تنقید و تعریض کا نشانہ بن گیا تھا اور خواص نے بھی اسے مسترد کر دیا تھا۔ لیکن برنارڈ شا نے اپنے ناقدین کی قطعی پرواہ نہ کی کیوں کہ وہ اپنے فلسفہ اور نظریہ کی ترویج میں بیرونی اثرات سے خائف ہونے کا سخت مخالف تھا۔ باوجود نقادوں کے اصرار کے اس نے اس ڈرامہ میں رد و بدل کی تمام تجاویز کو ٹھکرا دیا۔ ایک طویل عرصہ گذرنے کے بعد جارج برنارڈ شا کا یہی ڈرامہ اس کی فنکارانہ خوبیوں اور تفہیم کی عمدگی کی وجہ سے اسٹیج کے

لئے ایک سنگ میل اختیار کر گیا اور شا کو یورپ کا سب سے قد آور ڈرامہ نگار قرار دیا گیا۔ جارج برنارڈ شا کے ابتدائی ڈراموں میں GHOST بھی ایک ایسا ڈرامہ رہا ہے جو تنقید کی دنیا میں عرصۂ دراز تک موضوعِ بحث بنا رہا۔ GHOST میں برنارڈ شا نے جس تھیم اور VISION کو پیش کرنے کی کوشش کی تھی وہ بطورِ خاص تنقید نگاروں کا نشانہ بنتے رہے لیکن اسی زمانہ میں شا کا لکھا ایک اور ڈرامہ WIDOWER'S HOUSE کو بے انتہا مقبولیت ملی۔ اس ڈرامہ میں برنارڈ شا نے جس قسم کی کامیڈی کو پیش کرنے کا تجربہ کیا تھا اس میں وہ کامیاب رہا اور عوام نے شا کو ایک کامیاب کامیڈی رائٹر کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی سانحہ نے برنارڈ شا کو ٹریجڈی کی بجائے کامیڈی کی جانب راغب کر دیا لیکن مزاح نگاری کا یہ راستہ پھولوں کی سیج نہ تھا۔ اس لئے برنارڈ شا کو اپنے ابتدائی ڈراموں پر تلخ تبصروں اور تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا۔ برنارڈ شا نے اپنے تبدیل شدہ فنی رویہ پر شدید عوامی ردِ عمل کا استقلال اور بلند حوصلگی سے مقابلہ کیا اور لوگوں کی تنقید و تنقیص کی قطعی پرواہ نہ کی۔ برنارڈ شا نے ادب، فن، ڈرامہ، اسٹیج اور آرٹ کے مختلف شعبوں میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایک حیران کر دینے والے مزاح نگار اور مقبول ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ادب کے افق پر ایک ناقابلِ تردید شخصیت بن کر ابھرا۔

جارج برنارڈ شا کے ابتدائی ڈراموں GETTING MARRIED کو بہت اہمیت حاصل ہے اس ڈرامہ میں برنارڈ شا کی فنکارانہ صلاحیتیں اور فنکارانہ چابکدستی کا بہترین نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ WIDOWER'S HOUSE کی مقبولیت کے بعد برنارڈ شا کا یہی وہ ڈرامہ تھا جس نے اسکو اعتماد سے ہمکنار کیا۔ برنارڈ شا کے ڈراموں کی خاص بات یہ رہی ہے کہ اس کے ڈراموں کے کردار کبھی مجہول اور محیر العقول نہیں رہے۔ اس نے دیگر ڈرامہ نگاروں کی ناقابلِ قیاس تحریروں اور اندازِ اسلوب کو کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور اپنے ڈراموں کے کرداروں کا انتخاب اس نے سماج، زندگی اور اپنے ماحول ہی کے دامن

سے کیا۔ چنانچہ ہم اس کے اکثر ڈراموں میں روزمرّہ کے مسائل، اور اپنے اردگرد گھومتے پھرتے کرداروں ہی کو دیکھتے ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر شا کا مشہور ڈرامہ DOCTOR'S DILEMA کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جس کے کردار ہمیں اپنی زندگی میں جابجا دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ برنارڈ شا کے معروف ڈراموں کی فہرست بہت طویل ہے ان کے بارے میں یا ان کے کرداروں کے بارے تفصیل سے اس مضمون میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ برنارڈ شا کے اس ڈرامہ کا تقابل جسکا ابھی تذکرہ ہوا ہے MOLIRE کے "L AMOUR MEDICINE" سے کیا جاتا ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن نشین کرنی ہوگی کہ MOLIERE کو اپنے ڈرامہ میں محبت کی مبالغہ آمیز جلوہ سامانیوں بدگمانیوں اور مفروضہ شکوک وشبہات کو بنیاد بناکر ہنگامہ آرائی کا سامان فراہم کرتا نظر آتا ہے۔ برنارڈ شا کے ڈراموں میں اس قسم کی مبالغہ آمیزی یا ہنگامہ آرائی نہیں ملتی بلکہ برنارڈ شا اپنے کرداروں سے سنجیدگی کے ساتھ نپٹنا چاہتا ہے۔ لیکن برنارڈ شا اور MOLIERE میں ایک چیز جو مشترک نظر آتی ہے، وہ ان کا صنف نازک سے تعلق خاطر ہے۔ برنارڈ شا کی طرح MOLIERE کی تحریروں میں بھی عورت کیلئے بے پناہ ہمدردی اور پیار ہے۔ MOLIERE نے عورت کو مرد کی جنس تعیش کی بجائے روح کی انفرادیت سے موسوم کیا ہے۔ برنارڈ شا نے جب انہی موضوعات کو اپنے ڈراموں میں برتنا چاہا تو اس نے ان جذبوں کو آفاقیت عطا کردی۔ اور ان موضوعات کو سنجیدہ پن کا پیرہن عطا کرکے پیش کیا۔ جہاں برنارڈ شا کا فن MOLIERE پر سبقت حاصل کرتا ہے شا نے سینٹ ژ۔ جون کے توسط سے ڈراموں کی دنیا کو زندہ جاوید کردار عطا کئے ہیں۔ ان کرداروں میں LADY CECILY، SHOT OVER، "DUBEDAT، WILLIAM THE WAITER، ANDROCELS اور ALFRED DALTE کے علاوہ کئی دوسرے شامل ہیں۔

تمام روح برنارڈ شا طنز و مزاح کا بے تاج بادشاہ تھا اس نے اپنے مزاح اور طنز کے وسیلے سے سماجی اور معاشرے کے غلط نظام اور اس کی فرسودہ روایات، طور و طریق اور

پابندیوں کو ہدفِ تنقید بنایا۔ وہ ہمیشہ ناانصافی، منافرت، استحصال اور طبقہ واریت کے خلاف برسرِ پیکار نظر آتا ہے۔ وہ مخالف کی برائی کو ختم کرانا چاہتا ہے لیکن مخالف کو ختم کرنا اسے پسند نہیں اور اس کی یہی خوبی جارج برنارڈ شا کو اس کے معاصرین اور اس کے بعد کے طنز و مزاح نگاروں سے ممیز کرتی ہے۔ برنارڈ شا کے مزاج میں شعور کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ اگر برنارڈ شا نے ہم کو ہنسنے پر آمادہ نہ کیا ہوتا تو ہم نے تلخ لب و لہجہ میں نہ اس کی بات سنی ہوتی نہ اسکو پسند کیا ہوتا۔ مزاح کے پہلوؤں میں وہ ساری باتیں جو ہم پر گراں گزرتیں بڑی آسانی سے ہم تک پہنچادی گئی ہیں۔ اور مزاح کے پردے میں سچائیوں کی چبھن کو ہم نے خندہ پیشانی سے قبول کرنے پر خود کو آمادہ کرلیا۔

برنارڈ شا کے فن نے جب باطن کے پردے اٹھائے تو ہم نے ان مکروہ چہروں کو بھی دیکھا جن کو دیکھنے کی ہماری آنکھیں کبھی متحمل نہ تھیں، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جارج برنارڈ شا کے مزاج اور فن میں شعور اور مقصدیت دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے۔ نتیجہ میں اس نے سماج کے ناسوروں پر نشتر زنی کی اور فاسد مادہ کو نکال پھینکا۔ جارج برنارڈ شا صرف ایک مشاق ڈرامہ نگار ہی نہ تھا بلکہ ادیب، فلسفی، شاعر، موسیقار، معاشیات کا ماہر اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور نگاہ رکھنے والا دانشور بھی تھا۔ جارج برنارڈ شا نے اپنے عہد کے لوگوں میں سب سے زیادہ شکسپیئر سے متاثر رہا تھا۔ اس لئے اس کی تحریروں میں شکسپیئر سے اکتساب کی جھلک جا بجا ملتی ہے۔ ساتھ ہی وہ ٹالسٹائی، ابسن، میٹرلنک اور روڈرین جیسے ادیبوں اور دانشوروں کے تخلیقی رویہ سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔

جارج برنارڈ شا پروٹسٹنٹ فیملی کا ایک فرد تھا لیکن اس کے یہاں مذہب کی کٹر پسندی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کبھی نہ رہی۔ مذہب کے سلسلہ میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ "مذہب ایسا اثاثہ نہیں کہ جسے پیڑھی در پیڑھی منتقل کیا جائے بلکہ اس کے خیال میں بچہ کو کسی مذہب کے اختیار کرنے کے لئے سن بلوغ تک مکمل ذہنی و شعوری آزادی دی جانی چاہیئے۔ اسے یہ اختیار ملنا چاہیئے کہ وہ اپنی فہم و فراست سے کسی مذہب یا عقیدے کو اختیار کرے۔ اس IRISH

ڈرامالسٹ کی شخصیت پچھلی صدی کے آخری دہے میں اور اس صدی کی ابتدائی پانچ دہائیوں میں سب سے زیادہ زیرِ بحث آنے والی شخصیت رہی ہے۔ اقلیم ادب نے اسے گرانقدر اعزازات سے بھی نوازا۔ ایچ۔جی۔ ویلس نے سچ کہا تھا "فنکارانہ جادوگری کے تذکرہ میں جارج برنارڈ شا کی شخصیت ہمیشہ زندہ وجاوید رہے گی"!

جمیل نظام آبادی

غزل

جب بجائے بھرنے کے زخم ہو گئے گہرے
میرے چارہ سازوں کے زرد پڑ گئے چہرے

احتیاط لازم ہے زندگی کی راہوں میں یہ
وقت نے بٹھائے ہیں موڑ موڑ پر پہرے

دور سے نظر آئے جیسے جانے پہچانے
جب قریب سے دیکھا تھے پرائے سب چہرے

کیوں کسی سے ہم کہتے حالِ زندگی اپنا
کوئی تو بتا دیتا لوگ ہیں یہاں بہرے

بند کر لئے سب نے اپنے گھر کے دروازے
اب جمیل بے چارا شہر میں کہاں ٹھہرے

حفیظ میرٹھی

غزل

لہو سے اپنے زمین لالہ زار دیکھتے تھے
بہار دیکھنے والے بہار دیکھتے تھے

کبھی کبھی ہمیں دنیا حسین لگتی تھی ہم
کبھی کبھی تری آنکھوں میں پیار دیکھتے تھے

سرور ایک جھلک کا تمام عمر رہا
ہوس پرست تھے جو بار بار دیکھتے تھے

چلاؤں دورِ ستم گھر میں چھپ کے بیٹھ گئے
جو ہر صلیب کو مردانہ وار دیکھتے تھے

ملے تھے ملنے کو لیکن جدا جدا ہی رہے
سبب یہ ہے کہ سب اپنا وقار دیکھتے تھے

اگرچہ بستر آسودگی پہ تھے پھر بھی
وطن کے خواب غریب الدیار دیکھتے تھے

نہ دیجئے انہیں الزام قتل کا وہ تو
بس اک ذرا نئے خنجر کی دھار دیکھتے تھے

صبا نے لمس کا مرہم جو زخم گل پہ رکھا
تری طرف ترے سینہ فگار دیکھتے تھے

کس کو درسِ قناعت حفیظ کیا دیتے
خود اپنے گرد ہوس کا حصار دیکھتے تھے

ابن فرید

غزل

کیوں حوادث صبح کے خائف ہیں اپنی شام سے
کیوں وساوس دل کو دھڑکاتے ہیں یوں انجام سے

ہم نکل آئے تو تھے گھر سے مگر سوچا نہ تھا
واپسی کا راستہ ڈھونڈیں گے پھر ناکام سے

ہے عجب صورت کہ اب اس شہر میں آکر کے ہم
لگتے ہیں بے قدر سے، بنتے ہیں کچھ بے نام سے

پوچھتے کیا ہو؟ ہمیں اب یاد کیا ہے، کل جو تھے
حادثے وہ بھی نظر آتے ہیں سب اوہام سے

اس نگر میں وقت کی پہچان ہے سب کو مگر
ہم ابھی تک اجنبی ہیں ساعتوں کے نام سے

اب فصیلیں ہر طرف اونچی اٹھا دی جائیں گی
قافلے ٹھہریں نہ پھر آبادیوں میں شام سے

ہم کبھی بھی کیا، ہماری اب حقیقت کچھ نہیں
زندگی کی کج کلاہی تھی ہمارے نام سے

فاصلے اب درمیاں میں آ گئے ہیں، دوستو!
دولتِ دل ورنہ پھر حاضر کریں اکرام سے

عافیت ابنِ فرید اب جا کے تم کو مل گئی
ناشناسی کے نشیمن میں سو رہو آرام سے

غزلیں

محسن انصاری

قیاس و وہم کا لشکر تلاش کیا کرتے — ہم اپنے آپ کو پاکے تلاش کیا کرتے
یہ ایک جسم کی بھی قید سخت بھاری ہے — علاوہ اس کے کوئی گھر تلاش کیا کرتے
ہمارے سامنے پھیلا ہوا سمندر تھا — ہم اپنی ذات میں جوہر تلاش کیا کرتے
کسی نے ایسے محبت سے ہاتھ تھام لیا — کہ ساتھ چل پڑے رہبر تلاش کیا کرتے
ہمیں تو حسن کی بس اک جھلک ہی کافی تھی — خیال مل گیا پیکر تلاش کیا کرتے
چمن سے لے کے چلے آئے ہم بھی نالہ و آہ — کہ زخمیوں میں نواگر تلاش کیا کرتے

انہیں تو کوئی پلا دیتا اوک سے محسن
جو تشنہ لب تھے سمندر تلاش کیا کرتے

وہ شباب اور وہ دن رات کہاں سے لاؤں — وہ جو اک بات تھی وہ بات کہاں سے لاؤں
میرے اشکوں سے وہ بھیگی ہوئی راتیں ہیں کہاں — وہ سلگتے ہوئے لمحات کہاں سے لاؤں
وہ ابلتا ہوا سرچشمۂ افکار کہاں — وہ امڈتے ہوئے جذبات کہاں سے لاؤں
دل کی گرمی کو ابھی تک لئے بیٹھا ہوں ضرور — وہ ہوا اور وہ برسات کہاں سے لاؤں
چاندنی رات اسی طرح ابھی آتی ہے — حیرت و شوق کے نغمات کہاں سے لاؤں
اپنے ماضی کا کروں روز اعادہ کیسے — روز دلسوز حکایات کہاں سے لاؤں
یہ نہیں ہے کہ پتہ بھول گیا ہوں اس کا — اب مگر شوق ملاقات کہاں سے لاؤں

شاعری کا مجھے دعویٰ نہیں ہرگز محسن
میر و غالب کے کمالات کہاں سے لاؤں

غزلیں

س روحی قادری

نامہرباں تو دوست کو کہنا بجا نہیں
شاید ہمارا دل ہی کرم آشنا نہیں

اب اس کے بعد کہنے کو کچھ بھی بچا نہیں
"تیرے سوا ہمارا کوئی آسرا نہیں"

منزل سے میں ہٹا کے نظر دیکھتا نہیں
قدموں میں ہے نظر میں مری راستا نہیں

میں تیرے اعتبار سے مانا تیرا نہیں
رشتہ وجود کا تو مگر ٹوٹتا نہیں

کیسا نہیں ہے کیسا ہے یہ کیا ہے کیا نہیں
بگڑے کسی سے وقت تو کچھ دیکھتا نہیں

دست خزاں نے سب کو نوازا ہے باغ میں
پھولوں کا ذکر کیا کوئی کانٹا بچا نہیں

میخوار جوش مستی میں کیا بولنے لگے
ہم پارسا نہیں تو کوئی پارسا نہیں

یا شہر کے مزاج سے واقف نہیں ہیں ہم
یا شہر میں ہمیں کوئی پہچانتا نہیں

روحیؔ کا حال دیکھ کے کہنے لگے ہیں لوگ
"پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں"

اپنی محبتوں کا کسی سے صلہ نہ مانگ
تو دل کا خوں بہا دے مگر خوں بہا نہ مانگ

دیوانہ وار کون چلے گا پھر اس طرح
ہے راہ آرزو تو مرا نقش پا نہ مانگ

آئینہ خیال کی تنہائی مر نہ جائے
آئینۂ خیال سے عکس نوا نہ مانگ

ہوتا ہے خود سوال ہی سائل کا حوصلہ
جب اس سے مانگنا ہے تو اسکے سوا نہ مانگ

ذوق سفر کی موت ہے منزل اسی کی بات
جس کی تجھے تلاش ہے اس کا پتہ نہ مانگ

جو درد کو شفا نہ دے ایسی دوا نہ کر
جو عرش کو ہلا نہ دے ایسی دعا نہ مانگ

نالہ صدائے "لا" "ہو" "اللہ" اٹھائے آہ
یہ حوصلہ نہ ہو تو غم کربلا نہ مانگ

راتیں تو آفتاب سے کرتی ہیں مجھ کو دور
راتوں سے آفتاب کا روحیؔ پتہ نہ مانگ

غزلیں

کلیم سرونجی

راستہ ہم نے نکالا ہے، بہر کار نیا
اب نہ اٹھیگا کوئی مسئلہ دار نیا

فکرِ تازہ سے سخن کا ہوا گلزار نیا
ہم نئے ہیں تو ادب کا بھی ہے معیار نیا

اک کرن بھی نئے سورج کی نہیں ہے لیکن
ایسا لگتا ہے کہ ہے سایۂ دیوار نیا

فکر پہلے سے مماثل ہے مگر فرق ہے یہ
آج کے دور کے انساں کا ہے کردار نیا

اس نئے عہد کا ہم سے یہ تقاضہ ہے کہ ہم
لفظ و معنی کا تراشیں کوئی شہکار نیا

دھوپ بے سایہ سہی پھر بھی یہ امید تو ہے
موسم آئیگا تو کھل اٹھیگا گلزار نیا

خوب ہوتی رہی جذبوں کی نمائش بھی کلیمؔ
خوب ہوتا رہا ہنگامۂ بازار نیا

محمد ادریس ضیاؔ

خلوص پا کے خوشی ایسا بھی بے حساب نہ ہو
سنبھل کے دیکھو یہ سکہ کہیں خراب نہ ہو

وہ دل بھی کیا ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو آباد
وہ آنکھ کچھ بھی نہیں جس میں تیرا خواب نہ ہو

کبھی کبھی تو اس انداز سے بھی بولا جائے
ہر ایک شخص سنے اور کوئی خطاب نہ ہو

برا وہ لاکھ سہی پھر بھی میرا اپنا ہے
خدا کرے کہ مرا تیر کامیاب نہ ہو

وہ آدمی تو اندھیرے ہی بانٹ سکتا ہے
کہ جس کا قلب صداقت کا آفتاب نہ ہو

خوش رہنا پڑا جاہلوں کے مجمع میں
ہمارے ذہن میں ایسا نہیں جواب نہ ہو

اب ایسا کون سا گوشہ ہے زندگانی کا
جہاں کہ اے ضیاؔ تنہائی کا عذاب نہ ہو

روشنی

نجم السحر صدف

سائمہ ابھی ابھی بازار سے لوٹی تھی تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ ڈھیر ساری چیزیں جو وہ خرید لائی تھی اس نے ایکطرف اس طرح ڈالدیں جیسے اب ان چیزوں کی حقیقت اس کی نظروں میں کچھ نہ رہی ہو۔ تکان دور کرنے کیلئے وہ غسل خانے میں جاگھسی۔ جب وہ باہر نکلی تو ترو تازہ ہوگئی تھی۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد وہ سامان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

دھیرے دھیرے وہ ایک ایک پیکٹ کھولنے لگی جیسے جیسے وہ ان دھاگوں کو کھولتی گئی ویسے ویسے اس کے ذہن کے دریچے بھی کھلتے گئے۔

"بھیا کو لوٹنے میں کچھ ہی ماہ تو رہ گئے ہیں"

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ بھیا جو تین چار سال قبل اپنے خاندان کی خوشحالی کی خاطر اپنے سکھ چین کو تج دے کر غیر ملک کو چلے گئے۔ وہاں انہوں نے خوب محنت کی اوور ٹائمز بھی کئے تعلیم اور صلاحیت کی بناپر انہیں اچھی سروس مل گئی تھی وہ چند ہی ماہ میں اس قابل ہوگئے کہ ہمارے گھر کی حالت یکسر بدل ڈالیں۔

ہر پرانی چیز کی جگہ نئی اور ماڈرن شئے نے لے لی۔ ڈرائنگ روم جو آپا کی زندگی میں کتب خانہ بنا رہتا تھا اب قیمتی صوفہ سیٹس، بیش قیمت قالین اور نفیس پردوں سے جگمگا رہا تھا۔ سائمہ نے اپنے اردگرد کا تفصیلی جائزہ لیا۔

بے شمار قیمتی نمائشی اشیاء جگہ جگہ سجی ہوئی تھیں۔ کئی اعلیٰ قسم کی پینٹنگز جو مشہور آرٹسٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ خوبصورت رنگین سلیقے سے آویزاں تھیں۔ واڈروب جس کا کبھی مناسب استعمال نہیں کیا گیا تھا اب بھابی کی بے شمار قیمتی ساڑیوں سے سجا کھڑا تھا اس کی سوچ کا دھارا خود اپنی جانب مڑ گیا۔

"میری تو دنیا ہی بدل گئی تھی" خود کو ہواؤں کے دوش پر اڑتا محسوس کرنے لگی۔ ہمیشہ

بھی ہوئی سی بزدل لڑکی اب اک شوخ و کھلنڈری لڑکی نظر آنے لگی ۔
اور یہ حقیقت بھی تھی کہ بھیا نے ہم سب کی زندگی کا رخ اپنی محنت و مشقت سے موڑ دیا تھا
کہیں اس ظاہری حالات اور بہترین لباسوں نے ہمارے ذہن و دل تو نہیں بدل ڈالے ؟
ہم بھی ان نمائشی چیزوں کے درمیان خود بھی نمائشی شئے بن کر تو نہیں رہ گئے "؟
اس نے انصاف و سنجیدگی سے بھرپور تجزیہ کیا ۔ اس کی سوچوں اور خیالات کا سلسلہ جانے کہاں پہنچتا کہ ماں نے پکارا۔

" کچھ دیر آرام کر لو سائرہ ، پھر کام دیکھ لینا "۔

" اچھا ماں ! اس نے دھیرے سے کہا اور اک اک چیز ان کو دکھانے لگی ۔ آج کی شوپنگ بھی تو بھیا کی آمد کے سلسلے میں کی گئی تھی ۔ وہ بھیا کے لئے کچھ ضروری چیزیں اور گھر کے لئے مناسب سامان خرید لائی تھی تاکہ بھیا جب گھر آئیں تو انہیں اپنی محنت کا پھل سکون کی صورت میں ملے۔ ماں نے تمام چیزیں دیکھ کر نہ خوشی کا اظہار کیا اور نہ ہی کوئی تعریفی جملہ کہا۔ فقط ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں ۔

۔ اُس نے دیکھا ماں کی آنکھوں میں آنسو تڑپ رہے ہیں۔ وہ پریشان ہو اٹھی " کیا ہوا ماں آپ رو کیوں رہی ہیں "؟

" سائرہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے بیٹی جیسے میں یہ خوشیاں نہ دیکھ سکوں گی "۔

" ایسا مت سوچئے ماں آپ بے کار کے وہم کرتی ہیں " اس نے ماں کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا ۔

" نہیں سائرہ "۔ تم نہیں سمجھو گی "۔ ماں نے بے یقینی سے کہا میری طبیعت خراب رہنے لگی ہے ۔ رات میں نے خواب دیکھا کہ سالم اور میں ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر کھڑے ہیں ۔ سالم جتنا میرے قریب آنا چاہتا ہے کوئی طاقت مجھے اس سے اتنا ہی دور کئے جا رہی ہے وہ مجھ سے بہت دور رہ گیا "۔

" آپ خوابوں کو اتنی اہمیت نہ دیا کریں"۔ خواب تو ہمارے دن بھر کے خیالات کا

عکس ہوتے ہیں ۔" دیکھئے نا اب سالم بھائی کو آنے میں تھوڑے ہی دن کا عرصہ رہ گیا ہے"۔
سائلہ نے ماں کا ذہن بٹانے کی کوششیں کی ۔

"سالم بھائی کے آنے کے بعد دیکھئے گا کیسی خوشیاں ہوں گی اس گھر میں"۔ سائلہ ماں کو بہلانے کے لئے نت نئے پروگرام بنانے لگی ۔ مگر اس بے چاری کو کیا پتہ تھا کہ ماں اس دن کے بعد ہی سچ مچ بستر پکڑ لیں گی ۔

ماں کی حالت روز بروز بگڑنے لگی سائلہ اور فائزہ نے کئی ڈاکٹرز دیکھلائے لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا ۔ ماں کی بیماری دونوں کے لئے ایک چیلنج بن گئی ۔ سائلہ اور فائزہ کی خدمت کوئی اثر نہ دکھا رہی تھی ۔ آخر کار ماں کا کہا سچ ہوا ۔

سائلہ کی تسلیاں بہلاوے سب جھوٹے ثابت ہوئے اور ماں اسے بھائی بھاوج کے سہارے چھوڑ کر چلی گئیں ۔

سائلہ کے لئے یہ غم سہنا ممکن نہ تھا ۔ وہ کئی بار بے ہوش ہوئی ۔ اس کے غم میں فائزہ برابر کی شریک تھی ۔ اسے بھی تو ماں نے ایک بیٹی کی طرح چاہا تھا اور وہ بھی ماں کی خدمت سائلہ سے زیادہ کیا کرتی تھی ۔ سائلہ اور فائزہ دونوں ایک دوسرے کی غم گسار تھیں ۔ دونوں کو بس سالم کا انتظار تھا ۔

سالم مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی آگیا ۔ اسے ماں کے انتقال کی اطلاع مل چکی تھی ۔ لیکن وہ بروقت نہ آسکا تھا ۔

سائلہ بھائی سے لپٹ گئی فائزہ کو بھی سکون اور تسلی ملی ورنہ دونوں اس ویران سے ماحول میں گھٹ کے رہ گئی تھیں سالم کے آجانے سے زندگی جیسے پھر معمول پر آگئی تھی ۔ تھوڑی سی چہل پہل ہوگئی ۔ سائلہ نے بھی کالج کو چھٹی لگا دی تاکہ بھائی کے ساتھ کچھ وقت گذارا جائے ۔ جیسے جیسے دن گذرتے جارہے تھے سائلہ کے دل میں یہ بات جاگزیں ہوتی جارہی تھی کہ سالم کچھ اکھڑا اکھڑا سا الگ رہا ہے ۔ اس کا موڈ آف رہنے لگا ہے ۔ وہ سوچتی پتہ نہیں بھیا کو کونسی الجھنیں ہیں جو پریشان کر رہی ہیں ؟

دھیرے دھیرے اسے یہ احساس ستانے لگا کہ بھابی اور بھیا کے درمیان شائد وہی الجھن کا سبب بنی ہوئی ہے۔ وہ اپنی اندیشوں میں گھری کوئی فیصلہ نہ کرپائی۔

ایک روز وہ تینوں بیٹھے ناشتہ کررہے تھے موسم کافی خوشگوار ہوچلا تھا۔ سبھی کا موڈ اچھا تھا۔ ایسے میں سالم پردیس کے واقعات کچھ خوشگوار اور کچھ غمگین انداز میں سنا رہا تھا۔ "وہاں سب سے زیادہ نروس کرنے والی چیز تنہائی ہے۔ انسان چاہے کتنا ہی جیالا کیوں نہ ہو تنہائی کے آگے بے بس ہوجاتا ہے۔ دفتر سے جب آدمی تھکا ماندہ گھر لوٹتا ہے تو کیا چاہتا ہوگا" وہ براہ راست سائلہ سے مخاطب تھا۔

سائلہ اس حملہ کے لئے تیار نہیں تھی بوکھلاسی گئی اور سالم کا منہ تکنے لگی۔

"میں نے فائزہ کو ساتھ لے جانے کی کارروائی مکمل کرلی تھی مگر اب ــــ" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پھر کیا ہوا بھیا"؟ سائلہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"کاغذات تمام مکمل ہیں مگر اب پرابلم یہ ہے کہ تمہیں تنہا کیسے چھوڑا جائے" سالم نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ سائلہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ ان لوگوں کے لئے مسئلہ بن گئی ہے۔

آج اسے رہ رہ کر ماں کی یاد آرہی تھی۔ ماں کی کمی نے اسے شدت سے تڑپا دیا۔

فائزہ اس درمیان خاموش تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا ہو۔ وہ سائلہ کا بہت خیال رکھا کرتی تھی۔ مگر سالم کی معقول وجہ کے آگے شائد وہ بھی خاموش ہوگئی تھی۔ سائلہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسے کچھ سوجھائی نہ دے رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟

وہ خود کو بوجھ بنتا دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ اس کی تعلیم بھی تو مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اب بھیا کی چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے ویسے ویسے سائلہ کی الجھنیں عروج پر تھیں۔

آخر کار سالم کی روانگی کو صرف دو دن رہ گئے اور یہ دو دن اس کے لئے قیامت

سے کم نہیں تھے۔ اسے بھیا کو کوئی نہ کوئی جواب دینا تھا۔ ساری رات اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ وہ بھابی بھیا کی دوری کا سبب بن رہی ہے۔ یہی احساس اسے مار ڈال رہا تھا بہت سوچ بچار کے بعد اسے ایک ہی حل دکھائی دیا

"کالج کے ہوسٹل میں اپنا انتظام کر لینا چاہیے" وہ اپنے متعلق یہ فیصلہ کر کے کچھ مطمئن سی ہو گئی۔ اب وہ ان لوگوں کیلئے کوئی پرابلم نہیں بنے گی۔ یہی سکون پر درد احساس لئے وہ سالم کے پاس پہنچی اور اس کے سامنے اپنی تجویز رکھی تو وہ کچھ پشیمان سا ہو گیا۔

"نہیں سائلہ ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ نادم نادم سا لگ رہا تھا۔

"نہیں بھیا میں نے فیصلہ کر لیا ہے" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"سائلہ پاگل نہ بنو تم لوگوں نے تو میری رائے جاننا مناسب ہی نہیں سمجھی" فائزہ جو جانے کب سے ان لوگوں کی گفتگو خاموشی سے سن رہی تھی بول پڑی۔ اسے سائلہ کے اسقدر انتہائی اقدام پر بے حد ملال ہو رہا تھا۔

"بھابی" معذرت کے ساتھ کہہ رہی ہوں اب میرے فیصلے کو اٹل ہی سمجھئے یہ تینوں کے حق میں بہتر ہے" وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر چلی گئی۔

فائزہ دل سے یہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسا ہو۔ وہ لاجواب سی ہو کر رہ گئی۔ پھر فائزہ نے بھی تیاری مکمل کر لی۔ وہ تینوں اپنی اپنی منزل کے لئے تیار کھڑے تھے۔ سائلہ بھی اپنا سامان ہوسٹل میں رکھ آئی تھی۔ اس نے اپنی ساری ہمت کو مجتمع کیا اور آہنی عزم لئے ہوائی اڈہ پہنچی۔

فائزہ سائلہ سے لپٹ گئی۔ "تم نے اچھا نہیں کیا سائلہ" کوئی اس طرح سے گریز کرتا ہے کیا"۔ "بھابی آپ کیوں سمجھ رہی ہیں۔ یہی خوشی میرے لئے کیا کم ہے کہ آپ بھیا کے ساتھ رہینگی"!

وہ فائزہ کو سمجھانے لگی۔ سالم بھی ایک طرف کھڑا کچھ عجیب انداز میں یہ منظر دیکھ رہا تھا اس کے پاس جیسے الفاظ نہیں تھے کچھ کہنے۔

"اچھا بھیا خدا حافظ! وہ دیکھئے جہاز تیار کھڑا ہے" وہ زبردستی مسکرائی۔
"سائمہ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ میں جلد ہی تمہارے لئے کوئی مناسب انتظام کروں گا۔ تم فکر مت کرو اپنا خیال رکھو" سالم رو دینے کو تھا۔
"بھیا آپ میری فکر نہ کریں میں ایسے ہی ٹھیک ہوں"
اناؤنسر کی آواز پر وہ چونکے۔

اس نے جلدی سے دونوں کو خدا حافظ کہا۔ جہاز میں سوار ہونے تک اپنا اداس اور بے رنگ رومال لہراتی رہی۔

چند لمحے بعد ہی اس کی نظریں فضاؤں میں پرواز کرتے جہاز پر مرکوز ہوگئیں۔ جو پوری روشنی میں خوشبو بانٹے مزید اجالوں کی جانب رواں تھا۔

وہ آہستہ قدموں سے چلتی نیچے چلی آئی۔ اس کی نظر میں اب اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ تنہائی کا اندھیرا۔ غیر یقینی حالات کا اندھیرا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری جی کڑا کر کے ہوسٹل روانہ ہوگئی۔ ہوسٹل میں ابتداً اسے گھٹن تنہائی اور پچھلی کرناک یادوں نے بہت ستایا۔ ماں کا پیار اسے رلاتا رہا۔ مگر ارادے کی مضبوطی اور سب سے بڑے سہارے کی طرف پیش قدمی نے اس کے اندر زندگی کی نئی جوت جگا دی۔ اب اسے دوسروں کی خوشی کے لئے غم اٹھانے کا فن آگیا تھا۔

اب اس نے اندھیروں میں پھر روشنی پیدا کرلی تھی۔ یہ روشنی بڑی سکون بخش تھی کیف آگیں تھی ختم نہ ہونے والی تھی۔ اس روشنی کے مقابلے میں جو گھر میں آرام دہ فرنیچر اور چمکتے ملبوسات کی شکل میں آئی تھی۔ جو عارضی تھی کسی کو خوش اور کسی کو غمگین بنانے والی تھی۔

دیوان ارشاد بن نظام
مبرہ تیرا - آرہ - ۸۰۲۳۰۱

اندھا سفر

وہ انانیت کے تیغ کوہ پر بیٹھا عالم ناسوت کے چادر آب پر سنگ ملامت پھینکتا رہا اور پھر انہیں ایک مخصوص چرخاب میں گردش کرتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا رہا ـــــ اگرچہ اس کی اپنی حقیقت بلبلۂ آب سے زیادہ کچھ نہ تھی اور تودہ خاک اس کی زندگی کا ضامن تھا پھر بھی وہ طلسم زیست کے چرخاب میں گردش کرتا رہا ـــــــ وہ یہ بھی فراموش کر بیٹھا تھا کہ ایک دن اسے اپنے زیخ بستہ جا ملنا ہے ـــــ ہاں اسی مٹی کے ڈھیر سے!

پھر یہ گورچی رنگت ختم ہوجائے گی ـــــ یہ تبسم کناں چہرہ باقی نہ رہیگا اور اعضائے رئیسہ جنکے سہارے وہ اب تک ترقی کی منزلیں سر کرتا آرہا تھا ـ سبھی مٹی کے کھلونے میں منتقل ہوکر رہ جائینگے وہ احسن تقویم کی اس منزل سے واقف تو ضرور تھا پھر بھی وہ تنازع للبقا کی خاطر خزانہ عاملانہ کے پیچھے بھاگتا رہا تھا ـــــ مسلسل ــــ لگاتار ـــ!

مسجدوں کی اونچی اونچی میناروں سے حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃِ اور حَیَّ عَلَی الفَلَاح۔۔۔۔ کی منادی ہوتی رہی مگر وہ دوسری سمت بھاگتا رہا ـــــ مسلسل ـــــ ولگاتار ـــــ!

مندروں کی برج سے گھنٹوں کی ٹن ٹن کی آوازیں بھی اسکے پیروں میں بیڑیاں نہ حائل کرسکی اور وہ بھاگتا رہا ـــــ مسلسل ـــ لگاتار ـــ!

بھاگ دوڑ کے اس سفر پر مکمل وہ تنہا نکلا تھا ـــ مگر اب وہ تنہا نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک قافلہ چل رہا تھا اور وہ قافلہ سالار بنا اسپ کثیر العلائق کے پشت پر سوار ہوکر بھاگ رہا تھا اور لوگ اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے ـــــ اور بھاگ دوڑ کا یہ کھیل صدیوں سے جاری تھا ـ اسکی مسلسل اس علاعل حکمی اور جرأت افزوختی کو دیکھ کر ستمتہ مینا کے

کے مکینوں میں ناشکیبی بڑھتی گئی ـــــ زمین کے فرشتوں نے احکم الحاکمین کو تمام حالات سے آگاہ کیا
" لوگوں کے عقیدے فاسد ہو چکے ہیں ـــــ نوید جانفزا کے بجائے لوگ کتاب زر کی تلاش میں
میں لگے ہوئے ہیں۔ سبھوں پر شیاطین کا افسوں اثر انداز ہو چکا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ لوگ افواف والشیاطین بن چکے ہیں ـــ پھر ایسے میں بھلا ان سے کیا امید صالح کی جاسکتی ہے"
قابض ارواح نے بھی خداوند قدوس سے انتزرع جہاں کی فریاد کی ۔

" ہاں ـــ میرے آقا ! اب باغ جہاں کے کہنہ سال درختوں کو اکھاڑ پھینکا جائے اور
اس کی جگہ نوعروسان چمن سے گلشن جہاں کو آراستہ کیا جائے ۔ ! "

" کیا بکتے ہو ـــ ! عِلمُ بذات الصدور ــــ مجھ سے بہتر تم نہیں جانتے !" عرش
اعظم پر ایک خارا شکن آواز ابھری اور ملائکہ سکتے میں آگئے ۔

کیا میں نے صرف اپنی عبادت کی خاطر ہی دنیا بسائی ہے ـــ نہیں نہیں ـــ اس کام کیلئے
تو تم لوگ ہی کافی تھے ۔ تم کیا جانو ـــ جب میرا بندہ خطا کرکے بحالت کسر نفسی میرے سامنے اشک
ملامت سے اپنا چہرہ دھوتا ہے تو میں کتنا خوش ہوتا ہوں ـــ ! احکم الحاکمین نے کہا اور سارے
فرشتے سجدے میں گر پڑے ـــ

ـــــ مگر وہ تھا کہ اب بھی بھاگتا ہی چلا جا رہا تھا ۔ مسلسل ـــ لگاتار ـــ !

اپنی اکھڑی سانسوں پر قابو پانے کے لئے وہ ایک سنگلاخ وادی میں پل بھر کے لئے رکا اور اپنے
حواس کو مجتمع کرتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ـــــ وہ دور ـــــ بہت دور نکل آیا
تھا ۔ اسے اب اپنے آپ میں ایک عجیب سی تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا ۔ سفر کے ابتدائی
مراحل میں اس کے بال آبنوس کی طرح سیاہ اور کالے تھے ـــ مگر اب وہ بھی کوہ البیس کی
برفانی چوٹیوں کی مانند سفید براق ہو چکے تھے ــــــ اس کے چہرے کی سرخ رنگت پر آزنگ
کی مہر لگ چکی تھی ـــــ اس کی شاہین نما آنکھیں اپنی کوٹھری سے دور ہوتی جا رہی تھیں
پھر بھی اسکا سفر نامکمل تھا اور وہ ابھی بھاگ رہا تھا ـــ ایک آکھوئے رم خوردہ کی طرح
مسلسل ـــ لگاتار ـــ !

"— آخر ہماری منزل کہاں ہے !" تھکان سے چور ایک کہنہ سال قافلہ سالار نے پژمردہ رنگ ہوتے ہوئے اس سے سوال کیا، در جواب میں اپنے گرد و پیش کا بڑی محتاط نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا! ورنہ دوبارہ وہ برق رفتاری کے ساتھ چلا گیا لگا اور لوگ اس کے نقش پا کو تلاش کرتے ہوئے دھیرے دھیرے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

جمال صفی

سہارا

حسب معمول آج وہ پھر آدھمکا ۔ ہاتھ میں ایک ادھ کھلی کتاب اور ایک میلی سی کاپی
ہ جب بھی آتا یہ چیزیں اس کے پاس ہوتیں ۔ وہ بڑے دعوے کے ساتھ ہمارے کمرے میں
اخل ہوتا تھا ——— " باؤجی یہ سوال حل کر دو " پہلے دن جب وہ آیا تھا تو میرے ساتھی
ال پر بہت اچھا اثر چھوڑ گیا تھا تعلیم سے اشتیاق اور بلا کی خود اعتمادی کی وجہ سے
ال نے اس کی طرف پوری توجہ دی ۔

" کہاں پڑھتے ہو " ؟

" جی سامنے ہی ایک سکول ہے نا ہائیر سکنڈری اسکول ...."

" کون سے درجے میں پڑھتے ہو ؟ "

" جی نویں درجے میں ۔ اگلے سال ہی میٹرک لکھوں گا "

آخر الذکر جملے میں قدرے فخر کا شائبہ تھا ۔ کچھ دیر تک وہ کمال کے مختلف سوالوں کے
واب دیتا رہا ۔ مجھے تو وہ پہلی ہی نظر میں یونہی سا لگا ۔ مگر کمال نے اس کی خوب
پذیرائی کی ۔

" اچھا میاں آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے ۔ اگر چاہو تو کل سے کچھ پوچھنے کے لئے آ سکتے
ہو ۔ سات بجے کے بعد میں یہاں پر ہوتا ہوں "

" اچھا جی " ۔

وہ بغیر کسی تمہید یا تکلف کے دھڑاک سے کمرے سے باہر نکل گیا ۔

اور تب سے وہ شام کے سات بجے کا ایک لازمی جزبن گیا تھا ۔ " باؤجی یہ سوال
حل کر دو " کبھی کبھی تو کمال کو بہت کوفت ہوتی ۔ مگر بعد کو اس کی قابل رحم شخصیت

کمال کی جھنجھلاہٹ کو ہمدردی میں بدل دیتی تھی۔ پہلے پہل وہ ایک نہایت ہی کمزور طالب علم نظر آیا۔ پھر لفظ کمزور بھی اس کے لیے بہت بھاری معلوم ہونے لگا کمزور طالب علم کا لقب تو ان کو دیا جاتا ہے جو کچھ جانتے بھی ہیں۔ ریاضی، انگریزی، سماجیات غرض کہ کوئی بھی مضمون ہو ان میں اس کی بنیاد اتنی ناکارہ تھی کہ اس کے جواب سن کر ہماری خاصی تفریح ہو جاتی۔ ریاضی میں تو وہ بڑا جاہل تھا۔ "یاؤجی یہ حساب بنا دو"۔ اس سے اس کا یہ مقصد نہ ہوتا تھا کہ وہ حساب سیکھنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس کا پس پردہ یہ مطالبہ ہوتا تھا کہ وہ حساب اس کی کاپی پر حل کر دیئے جائیں۔ کمال کو بھی اس میں اپنی خیریت نظر آتی۔ مگر اکثر انسانی جذبے کے تحت کمال اسے کچھ سکھانے کی بھی کوشش کرتا۔ سب سے پہلے وہ اسے "بوڈماس" کا فارمولا ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتا۔ مگر بیچ میں وہ اپنی معلومات کا کوئی ایسا ثبوت پیش کر دیتا کہ کمال کے سارے نیک جذبے سرد پڑ جاتے

"اعشاریہ سمجھتے ہو"؟

"وہ جواب دیتا ـــــ" ہاں جی یہ تقسیم میں آتی ہے"!

"تقسیم کیا ہوتی ہے؟"

"بارہ نواں بہتر کو بانٹنے کی ہوتی ہے جی"

"ضرب جانتے ہو"؟

"ہاں جی بیس تک جانتا ہوں جی"!

اور وہ فٹا فٹ پہاڑے سنانا شروع کر دیتا۔ کمال اسے منع کر کے سمجھاتا۔

"دیکھو میاں پہلے تقسیم سیکھ لو۔ بوڈماس کا فارمولا جان لو۔ تب ہی یہ سارے حساب تم بنا سکو گے۔

"ہاں جی"!

وہ بڑا خود اعتمادی سے اقرار کرتا۔ اور یہی خود اعتمادی کمال کے اوپر جھنجھلاہٹ طاری کر دیتی تھی ـــ وہ قدرے سختی سے کہتا۔

"کیا ہاں جی"

"پہلے تقسیم وغیرہ سیکھ لو"

"میں نہیں تم سیکھ لو!"

اور اس طرح کمال اسے کسی بہانے سے وہاں سے کھسکا دیتا ۔ اس لڑکے کو کمال سے کچھ فائدے پہونچے یا نہیں یہ تو نہیں کہا جاسکتا مگر کمال کو اس لڑکے سے پہونچنے والے فائدے نمایاں تھے ۔ کمال مصلحتاً اس محلے کے لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہنے کے اصولوں پر کاربند تھا ۔ وہ محلے کے لوگوں کو نفرت کی حد تک نظر انداز کرتا تھا ۔ مگر اس لڑکے سے تعلقات نے کمال کے اندر چھپے ہوئے سماجی انسان کو باہر لا دیا تھا اب دفتر جاتے ہوئے وہ اپنے زینے سے اترتے ہی بوڑھے بھنگی کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ لیتا اور کبھی کبھی کچھ پوچھ بھی لیتا تھا ۔ چند مکانوں کے بعد ایک ڈھلیے میں بھی اس کی نگاہیں ضرور جھٹک جاتی تھیں جہاں ایک دبلی پتلی سی لڑکی بیڑی بناتی رہتی تھی اور اس کے پاس ہی ایک ادھیڑ عمر کا مرد بڑے آرام سے چارپائی پر بیٹھا حقے پیتا رہتا یا کسی کے ساتھ شطرنج کھیلتا رہتا تھا ۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ مرد ہی دراصل اس لڑکے کا باپ اور محلے کا نورا بھائی ہے ۔ اور وہ دبلی پتلی لڑکی اس لڑکے کی بہن تھی ــــ نورا بھائی کو اپنے محلے کی برادری میں اس بات پر فخر تھا کہ اس کا لڑکا زیر تعلیم ہے ۔ کبھی نورا بھائی شراب پی کر آدھی رات کو خوب شور مچاتا اور اپنے لڑکے کو میٹرک پاس کرانے کے عزم کے ساتھ ساتھ دوسروں کو مغلظات سناتا ۔ ان باتوں کو جاننے کے بعد ہمارے دلوں میں اس لڑکے کے تئیں مزید ہمدردی پیدا ہونا لازمی تھا ۔

سالانہ امتحانات قریب آچکے تھے ۔ اس لئے اس لڑکے کی تیاریاں بڑے زور و شور سے چل رہی تھیں ۔ اب وہ پہلے سے جلدی ہمارے کمرے میں پہونچ جاتا اور دیر سے جاتا تھا ۔ میرے مشورے پر کمال نے اسے پڑھانے کا طریقہ بدل دیا تھا ۔

وہ اسے کچھ متوقع سوالوں کے جواب نوٹ کراتا جارہا تھا کہ امتحان کے موقع پر وہ کسی بھی طرح انھیں کے کام آسکیں۔ لڑکا بھی امتحان کے سلسلے میں کافی سنجیدہ تھا۔ اس لئے وہ پہلے کی بہ نسبت لاغر ہوگیا تھا۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ظاہر ہوگئے تھے۔ شاید نورا بھائی نے اسے خبردار کردیا تھا کہ اس درجہ میں پاس ہونے کی صورت میں ہی وہ میٹرک کرنے کی سوچ سکتا ہے۔

امتحانات شروع ہوچکے تھے۔ کمال کو انتظار ہی رہا کہ وہ حسب معمول ستانے شام کو پرچے کی روداد سنانے آئے گا۔ پورے دس دن گزر گئے۔ مگر وہ نہ آیا۔ اس دوران غالباً امتحانات ختم ہوچکے تھے۔ کمال کو بہت مایوسی ہوئی اور اس کی احسان فراموشی پر مجھے بہت غصہ آیا۔ مگر ایک شام اچانک وہ سوالوں کے گچھے کے ساتھ ہمارے اڈے میں آدھمکا۔ "سلام علیکم باوجی"۔ حسب معمول وہ صرف کمال سے مخاطب تھا۔ اب وہ قدرے صاف ستھرا نظر آرہا تھا۔ بالوں میں تیل لگا ہوا تھا آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اب غائب ہوچکے تھے۔ ان کی جگہ اب اس کی آنکھوں میں سپنے نے لے لی تھیں۔ ناک پھنگی چمک رہی تھی۔ اور چہرے پر اطمینان کے آثار نمایاں تھے۔ کمال نے ٹھوکا لگایا۔

"کیوں میاں آج ادھر کا رخ کیسے کرلیا"؟

"وہ باوجی امتحانات چل رہے تھے نا؟"

اس نے اس لہجے میں جواب دیا جیسے کمال کا وہ سوال احمقانہ تھا۔

"وہ تو جانتا ہوں بھئی کہ امتحانات چل رہے تھے۔ مگر شام کے وقت تو امتحان نہیں ہوتے"؟

"وہ ایسا ہے جی کہ فرصت نہیں ملی۔ اسکول سے آتے ہی بابا کے ساتھ درگاہ چلے جاتے تھے۔ وہاں سے آنے کے بعد مشق کرنے کو بیٹھ جاتے تھے اس لئے فرصت نہیں ملی ......"

"اچھا اچھا۔ پرچے کیسے ہوئے؟"

کمال نے اپنے موڈ کو بہتر بناتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھے جی"

پھر وہ سوالات کے گچھے سے ایک ایک سوال نکال کر کمال کو دکھانے لگا۔ درمیان میں وہ کمال کے کچھ سوالوں کے جواب بھی دیتا جاتا۔ جو جواب اس سے نہیں بن پڑتے ان پر وہ پہلو بدل کر مسکرا دیتا اور ایسا اظہار کرتا کہ اس نے وہ سوال امتحان گاہ میں کسی بھی طرح حل کر دیئے ہوں۔ ریاضی کے سوال کو کمال نے تو دیکھا تک نہیں۔ انگریزی کی جب باری آئی تو کمال نے کچھ سوالات دہرائے۔

"سوال ۸ کا جواب لکھا تھا؟"

"ہاں جی وہ لکھا تھا!"

"اس میں کیا لکھا تھا؟"

"گڈ، ہیپی، آوٹ سائیڈ اور تو کے اپوزٹ ورڈ لکھنے تھے نا جی"

کمال نے استفسار چاہا۔

"مائی نیم از اسکول ویری گڈ۔ کلاس ٹیچر مائی ویری ہیپی د ہچ wall اٹ از گارڈن آوٹ سائیڈ۔ آئی اسکول مائی لو...."

وہ فراٹے کے ساتھ سنانے لگا۔ وہی بلا کی خود اعتمادی۔ مگر اس لمحے کمال اس کے دل کو توڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لئے اس نے اسے منع کر کے دوسرے سوالوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ یونہی مختلف سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ پھر کمال نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ نورا بھائی کے تذکرے پر ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک فرمانبردار بیٹا ہے۔ اسے اپنے باپ پر بڑا فخر تھا۔ وہ نورا بھائی کی بہت عزت کرتا تھا اور پڑھ لکھ کر اپنے باپ کی عزت میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ اپنے باپ کے تئیں لڑکے کی عقیدت مندی اور خدمت کے جذبے نے ہمیں

بہت متاثر کیا۔ مگر وہ افسوسناک کیفیت جو اس کے پرچوں کے بارے میں جان کر ہمارے دلوں میں پیدا ہوئی تھی، کسی بھی طرح کم نہ ہو سکی۔ اگلے ہفتہ نتیجہ نکلنا مقرر تھا۔ اس دوران وہ ہمارے کمرے میں آتا رہا اور ہمیں اپنی باتوں سے محظوظ کرتا رہا۔

ایک دن میں اپنے دفتر سے واپس آرہا تھا کہ رات کے سناٹے میں بابا کلہاڑی شاہ کی درگاہ کے اندر سے مجھے کچھ مانوس سی آواز سنائی دی۔ میں رک گیا اور جھاڑیوں کے پیچھے سے جھانک کر اندر کی طرف دیکھا۔ سامنے مزار پر نورا بھائی کا لڑکا جھک کر سسکیوں کے درمیان دعائیں مانگ رہا تھا۔ "بابا مجھے پاس کر دو، بابا تمہارا ہی سہارا ہے آقاؤں کے آقا۔ تمہارے سوا اور کون سہارا ہے۔ میں بالکل بے سہارا ہوں بابا۔۔۔۔"

نہ جانے وہ کتنی دیر تک یوں ہی سسکتا رہا۔ اس کی درد بھری آواز سن کر میں تو پگھل چکا تھا۔ میں بے تاب ہو کر وہاں سے ہٹ گیا۔ میں اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر میں سوچنے لگا۔ "ایک بے سہارا کا سہارا کیا کوئی ہے؟" ملا

محمد وفاء اللہ وفاؔ

عزم

یہ زندگی کے راستے
نشیب اور فراز سے
بھرے پڑے ہیں اسقدر
کہ آدمی کے پاؤں لڑکھڑا کے رک سے
جاتے ہیں
کہیں ہمالیہ کے لب ہیں طنزیہ ہنسی لئے
کہیں عمیق کھائیاں
کہیں مہیب آندھیاں

قدم قدم رکاوٹیں
مگر جو دل میں عزم ہو
ترا مقابلہ نہیں
اٹھے جو تو
تو آسماں کی رفعتیں ترے قدم پہ آگریں
تری نگاہِ کرم سے پگھل پڑے ہمالیہ
جلا چراغ عزم تو
ان آندھیوں کے نزد یہ تو
قدم بڑھا قدم بڑھا
وہ دیکھ سامنے رہی وہ منزل مراد دل

سلیم اقبال
تعلقہ کوڑنگل ضلع محبوب نگر

ان دیکھی عبارت

دھندلکا ابھی چھٹا نہ تھا ۔ ابھی گلیوں سے ہوکر گذرنا مشکل ہی نظر آرہا تھا ۔ پتہ نہیں اس شہر
اسی گلی کہاں ختم ہو! اس دن میں اپنے اکلوتے بیٹے کی جان بچانا چاہتا تھا ۔ مجھے اپنی کوئی فکر
ی میرا چھوٹا اکلوتا بیٹا میری زندگی کی سب سے بڑی تکمیل بن جائے ۔ یہی ایک نامکمل سپنا
آنکھوں میں بسائے رہ حیات کی دھول پھانکتا رہتا ہوں۔

صدیوں پہلے پتھروں میں جان ڈالنے کیلئے سنگ تراشوں نے اپنے خاندانوں کا بلیدان دیا تھا
کے نامکمل مجسمے کو بیٹے نے اور بیٹے کے نامکمل مجسّے کو اس کے پوتے نے پورا کیا اور نہ جانے کتنے
رخاندان تکمیل کی اس آرزو میں ناتمام گذرتے رہے ۔ میں نے بھی حیوانیت کی اس بڑی چٹان پر
انیت کے مجسمے کی تکمیل کی خاطر ظلم اور تشدد کی گرد اپنے چہرے پر سجائے برسوں پہلے امید کا پہلا
وڑا اٹھایا تھا تو میرا بیٹا اپنی ماں کی کوکھ سے باہر نکلنے کو بے تاب تھا ۔ سرکاری دواخانہ کو
تے ہوئے اس کی ماں کو فسادیوں نے برچھی گھونپی تو اس کی انی میرے بیٹے کے سینے پر جا کر رکی تھی
اس دن سے مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس کا مقدر اس برچھی کی انی سے لکھا گیا ہے ۔ اس
سینے پر ایک ان دیکھی عبارت آج بھی کندہ ہے ۔

فنکار کے بیٹے بھی بڑے فنکارانہ انداز میں جنم لیتے ہیں۔ اس کی ماں کو لاوارث گردان کر
وگاڑی تین دن بعد لے گئی تو میں اپنے ہی بیٹے کو یتیم خانے سے پال پوس کر اور خوب پڑھا کر
بڑا آدمی بنانے کا وعدہ کر کے اپنے گھر لے آیا تھا
مجھے اپنے اس اکلوتے بیٹے کو بچانے کی بڑی فکر تھی ۔ !

رات کچھرے کے مٹ میں گذارنے کے بعد ہم باہر نکلے تو راستہ صاف تھا ۔ سنتری لولا کے پہرے ول
ساتھ خموشی کا بھی پہرا تھا ۔ کتے اور گدھوں کو آزادی تھی انسانوں کو سنتری قید کر کے چلاتے

تھے ۔ میں نے اپنے بیٹے کو اٹھالیا تو میری سیدھی ٹانگ نے چلنے سے انکار کرنے لگی ۔ رات بھر میری اس ٹانگ پر دو اور نئی لاشوں کا بوجھ آن پڑا تھا ۔ رات اس کچرے کے ٹب کے آگے دو سائے لہرائے تھے ۔ ان دونوں نے ہم دونوں کو بھی مردہ سمجھا اور دو لاشوں کو ہماری جانب پھینکتے ہوئے ایک نے کہا ۔

"جملہ چار ـــ چار ہزار کب ملیگا"؟

" ان دونوں کو تم نے کب مارا "

" انہیں مارنے کی ضرورت نہیں پڑی ـــ یہ دونوں تو خود ہی مر گئے تھے ۔

" پھر چار ہزار کیسے ملیگا تمہیں تو صرف دو ہزار ملیگا ۔ دو لاشوں کا دو ہزار ۔

" نہیں چار ہزار"

" نہیں دو"

انکی اس تکرار میں کسی سنتری نے سیٹی بجائی تو یہ لوگ بھاگ نکلے ۔ میں نے بائیں ٹانگ پر زور لگا کر اپنا اور اپنے بیٹے کا بوجھ اٹھایا تو نیند کی گولیوں کا خمار اس کی آنکھوں سے چھٹنے لگا " بابا مجھے ڈر لگ رہا ہے ۔ یہاں کوئی آدمی تک نہیں ہے ۔ کہیں یہ آوارہ کتے ہمیں کاٹ نہ لیں "

اس کی بات ۔ اس کے اس خوف کو دور کرنے کیلئے میں کہنے ہی والا تھا کہ سامنے نکڑ پر جہاں شہر کے تمام راستے ملتے ہیں وہیں دو آدمی ایک تیسرے آدمی کی گردن اس کے تن سے جدا کرنے کیلئے برچھیاں چلا رہے تھے اور وہ پاگل آدمی چلا رہا تھا مجھے بچاؤ ۔ مجھے بچاؤ ۔ سنتریوں کے جوتوں کی ٹاپوں نے اس کی ان چیخوں کو بھی کچل ڈالا ۔

میرے بیٹے نے دوبارہ کہا ـــ

" بابا یہاں سے بھاگ نکلو ـــ یہ سب انسان ہی ہیں ۔ مجھے ان سے ڈر لگ رہا ہے "

میں اس کے اس دوسرے خوف کو بھی دور کرنا چاہتا تھا لیکن کسی نے مجھے زندہ سمجھ کر میری پیٹھ میں تیز چمکتی ہوئی برچھی پیوست کر دی یہ برچھی میرے سینے سے پار نکل گئی جہاں میرا بیٹا چمٹا ہوا

تھا۔ اس کے سینے پر جب یہ آکر رک گئی تو میں نے اس سے کہا۔

"ایک دن ... ... ایک نہ ایک دن وہ سورج .... ضرور نکلے گا۔ اسی دن کیلئے میں نے تجھے اپنے میں چھپائے رکھا تھا۔

جانے وہ سورج کون دھرتی جنے۔ کون آکاش اس کی پرورش کرے"

میرا بیٹا میری لاش پر لوٹتا رہا ۔ کہتے ہیں آج بھی وہ رلتا ہے۔ کہیں کسی ٹرک پر۔ اکیلا سہما ہوا کوئی بچہ تمہیں نظر آئے تو اسے گود میں اٹھا لینا ۔ اس کے سینے پر لکھی عبارت کو مٹا دینا۔!

جلال الدین کلکتہ

آدمی آدمی سے ڈرتا ہے

آج آدمی آدمی سے ڈرتا ہے۔ موجودہ تاریک روشنی سے خوف کھاتا ہے۔ جدید تصورات سے لرزاں ہے۔ اپنے من گھڑت نظریات کے نتائج سے سہما رہتا ہے۔ اپنی حالیہ بے کراں کامیابی سے دل برداشتہ ہے۔ دور حاضر کی سیاسی کارستانیوں سے خوفزدہ ہے۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے ششدر ہے۔ اس حسین منافقت سے پناہ مانگتا ہے جسے ڈپلومیسی کا خوبصورت نام دیا گیا ہے۔ کھوکھلے وعدوں کا شکار ہے۔ حکام حاضر کی چرب زبانی کا مارا ہے۔ جدید ایجادات و انکشافات کے بھیانک انجام سے نالاں ہے۔ حید جو سرمایہ داری سے کوسوں دور بھاگنا چاہتا ہے موجودہ سامراجی اشتراکیت سے دامن چھڑانا چاہتا ہے۔ بے عملی سے بے زار ہے تن آسانی سے بھی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ گویا وہ ہر چیز سے لرزہ بر اندام ہے۔ مگر! مگر! اسے اپنے آپ سے بھی ڈرنا چاہیئے کیونکہ اس سے مفر نہیں کیونکہ وہ خود اپنے خلاف گواہ ہے۔



عشرت بیتاب

پچھلے مہینے کی وہ سب سے اندھیری رات تھی ـــ یہ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں ـــ کہ وہ رات واقعی بہت اندھیری تھی ـــ تاریک ـــ سیاہی کی انتہا ـ

لیکن اس شخص سے ملنے کی خواہش نے میرے قدموں میں ایک نئی قوت پیدا کردی تھی ـــ اور میں ہر قدم ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھاتا آگے بڑھتا رہا ـــ اس شخص کی تلاش میں ـــ

یہ جگہ میرے لئے بالکل نئی تھی ـــ میرا وجود اس اجنبیت کے ماحول سے ہی کانپ کانپ اٹھا تھا ـــ

اجنبی ماحول، اجنبی مقام ـــ

یہاں کی اوبڑ کھابڑ بے مرمت سڑکیں ـــ سڑکوں کے کنارے چھوٹے بڑے درخت ـــ اور درختوں کے دور تک پھیلے ہوئے گھنے سائے ـــ جیسے رات کی کالی ڈائن نگل گئی تھی ـــ دن کے اجالے میں ان درختوں کے سائے ضرور گھنے ہوں گے ـــ اور نہیں بھی ہوں گے ـــ سائے تو اپنے مقدر سے جیتے مرتے ہیں ـ

ایک طرف اوبڑ کھابڑ سڑک پر لوگ آتے نظر آتے ہیں تو دوسری سمت جاتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں ـ

لیکن ـــ میں اپنے آپ کو ان آنے جانے والوں کے بیچ ایک صلیب کی طرح لٹکا محسوس کر رہا تھا ۔ شاید اسی لئے میں نے صلیب کو اتار کر بائیں جانب والی اوپری جیب میں رکھ لی ہے ـــ شاید نہیں بھی رکھی ـ

لیکن آخر کب تک صلیب پر یوں لٹکا رہتا ـــ سامنے سے آتا ہوا ایک سفید

پوش نظر آیا ۔ اچانک اس کا تاریکی میں اس طرح نکل آنا اسی طرح لگ رہا تھا جیسے کالے سیاہ
بالوں میں چند سفیدیاں نکل آئے ہوں ۔

وہ اپنی دو نحیف ٹانگوں کے سبب میری مصنوعی ٹانگ کے سہارے میری جانب آرہا تھا
شاید وہ اپنی سمت کھو چکا تھا ـــ

ممکن ہے انہیں بھی کھویا ہو ـــ ۔

میں لپک کر سلام بجالایا ـــ

" وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ـــ

ان کی نحیف و کمزور ہونٹوں پر پھر لرزہ جنبش ہوئی

میں نے مطلوبہ شخص کے بارے میں اس سن رسیدہ سفید پوش سے دریافت کیا ۔

" کیا آپ ـــ اس شخص کا مکان بتا سکتے ہیں ـــ "

" اچھا ـــ وہ ـــ " سفید پوش نے خیالی گھوڑے دوڑائے اور گھوڑے کی واپسی پر فرمایا ۔

" آپ اس راستے سے سیدھے چلے جائیں ۔

آگے جاکر ایک راستہ دائیں مڑ جائے گا ـــ سامنے آپ کو سرکاری ہاسپٹل ملے گا ۔
وہاں سے آپ بائیں مڑ جائیں گے ۔ نکڑ پر آپ کو ایک مسجد اور دوسری طرف مندر نظر آئیگا
جس کے بیچ میں کچی سڑک گئی ہے ـــ اسے آپ پکڑ لیں گے تھوڑی دور ہی ہی آپ کو
مدرسہ دینیہ اسلامیہ کی تختی نظر آئے گی ـــ وہاں پہنچ کر آپ کسی سے پوچھیں گے کہ فلاں حاجی
صاحب کا مکان کونسا ہے ـــ ؟ مجھے ان کے صاحبزادے سے ملنا ہے ـــ "

" شکریہ جناب ـــ " میں سفید پوش کو لفظوں کا ہلکا پھلکا معاوضہ دیتا ہوا آگے بڑھ گیا ۔

ادھر ادھر کھا کر سیدھی سڑک کو چھوڑ کر دائیں والی متصل سڑک پر آہی رہا تھا کہ میونسپل
کے اسٹریٹ لیمپ نے ایبسٹریکٹ آرٹ میں ملبوس ایک نوجوان سے متعارف کرایا ۔ اس کے
ملبوسات کی چمک نے میری توجہ مبذول کرالی ـــ یا پھر یہ میرا حسن ظن ہو ـــ

لیکن میں اس کے قریب پہنچ گیا ـــ اور سفید پوش کی رہبری کی تصدیق چاہی ـــ

کیا فلاں شخص تک پہونچنے کا یہی راستہ ہے"

"جی ہاں —"

آگے جاکر بائیں مڑ جائیں گے — سامنے آپ کو گرلس ہوسٹل ملے گا۔ وہاں سے آپ بائیں جانب والی کچی سڑک پکڑلیں گے — جہاں آپ کو سیتا ہال ملے گا۔ وہاں سے تھوڑی دور چل کر بائیں مڑ جائیں گے تو سامنے نکڑ پر ہی آپ کو نیو میوزیکل کلب کی تختی نظر آئے گی — وہاں پر آپ کسی سے دریافت کرلیں — کہ فلاں بجو ماسٹر کہاں رہتا ہے — مجھے ان کے والد محترم سے ملنا ہے —"

مسعود جاوید ہاشمی

عشق بلاخیز کا قافلۂ تیز گام

میں ۲۷ر مارچ ساڑھے نو بجے صبح بذریعہ ٹرین ناگپور پہونچا۔ مومن پورہ میں واقع ڈاکٹر
[س]راج الحسن سراج کے گھر جا کر پتہ چلا ادارہ ادب اسلامی کے صدر ڈاکٹر احمد سجاد آچکے ہیں۔ دن بھر
[ار]کان مجلس اعلیٰ کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ رحمت اللہ رحمت رانچی سے، حفیظ میرٹھی اور مسعود
[ا]ختر میرٹھ سے، عزیز بگھروی اور کوثر زیدی دہلی سے، یوسف رانا کوٹہ راجستھان سے، ڈاکٹر
شبنم سبحانی سلطان پور سے، ڈاکٹر سہیل زیدی اور عبدالحمید ساگر الہ آباد سے اور
[ا]بوالمجاہد زاہد رام پور سے تشریف لا چکے تھے۔ کیف نوگانوی ہمارے میزبانوں میں شامل تھے
[ر]ات ایک شاندار مشاعرہ میں شرکت رہی۔ ۲۸ر مارچ کو دن بھر ادارہ ادب اسلامی کے بنیادی
[ا]رکان اور پھر مجلس اعلیٰ کا اجلاس منعقد ہوا۔ رات شہر کامٹی میں مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔
[ج]س میں مہمان شعراء کے علاوہ میزبانوں نے اپنی غزلیں اور نظمیں پیش کیں۔ بلگام (کرناٹک)
[کے] عزیز الدین عزیز بھی موجود تھے۔ ۲۹ر مارچ کامٹی سے بذریعہ ٹرین کولہ پہنچے اور رات ایک
[س]مپوزیم میں حصہ لیا جس میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں بھی شریک رہے جس کا عنوان تھا "موجودہ ادب
زوال پذیر ہے"۔ ۳۰ر مارچ کو دن بھر مجلس اعلیٰ کا اجلاس ہوتا رہا۔ اس میں سر ملک
[ح]یدرآباد اور محترم رشید عثمانی امیر حلقہ جماعت اسلامی مہاراشٹر شریک رہے۔ رات مشاعرہ منعقد
ہوا جس میں ہزاروں شائقین نے شرکت کی۔ ۳۱ر مارچ کی صبح نثری نشست ہوئی جس میں جناب
[م]سعود اختر میرٹھ، ڈاکٹر سہیل زیدی الہ آباد کے علاوہ مقامی نوجوان نثر نگار محمد ابراہیم خاں شوق وغیرہ
[نے] بھی حصہ لیا ——— ڈاکٹر احمد سجاد کو آئندہ چار سال کیلئے ادارہ کا صدر چنا گیا۔ احقر کے سپرد
[فن]کار کی اشاعت کا کام کیا گیا۔ فنکار کی مجلس مشاورت میں حذف و اضافہ ہوا۔ گٹ اپ کو شاندار
[ب]نانے اور مواد کو معیاری بنانے کی ذمہ داری مجلس مشاورت کے ذمہ کی گئی۔ ادارہ کے بنیادی ارکان میں ڈاکٹر سہیل زیدی کو شامل کیا گیا۔ مجلس اعلیٰ کے ارکان میں عمر حیات خاں غوری اور یوسف رانا اور شاہد شاداب
کا اضافہ کیا گیا۔ اسطرح یہ رنگا رنگ پروگرام نئے عزائم اور نئی منزلوں کی سمت ایک جست ثابت
ہوا۔ پورے پروگرام کی میزبانی چودھری مبین الحق نے پرخلوص انداز میں کی۔

ابوالفاروق شعور
حیدرآباد

نعت رسول صلعم

سرورِ عالم سا بھیجا ہے پیمبر دیکھنا
کیا عظیم الشان ہے احسان ہم پر دیکھنا

اس نظر کو مل گئی معراج جسکو ہو نصیب
رحمتہ اللعالمین کا روئے انور دیکھنا

ہے جوامع الکلم ارشاد ہر اک آپ کا
بند گویا ایک کوزے میں سمندر دیکھنا

آپ کی اطاعت ہے عین اطاعت ربنا العلیٰ
آپ کی الفت ہو جان و دل سے بڑھکر دیکھنا

آؤ مسجد سے کریں جاری پیام انقلاب
ہے خدا کا گھر نبیؐ کا ہے یہ منبر دیکھنا

اہلِ دانش کہہ رہے ہیں دیکھ کر ناکامیاں
پھر رسول اللہؐ کی حکمت پہ چل کر دیکھنا
کر کے سنت پر عمل امید رکھنا اے شعور
شافعِ محشر ملیں گے روزِ محشر دیکھنا

عزیز مراد آبادی
محلہ قاضیان، بسی کرتپور ضلع بجنور "یوپی"

اندھیر نگری

امام صاحب کی بے داغ ساکھ برسوں سے قائم تھی، لیکن کرفیو میں ڈھیل دیئے جانے کے فوراً بعد ان کی سنسنی خیز گرفتاری نے بہت سے معتقدین کو ان سے بدظن کر دیا۔

امام صاحب گذشتہ کئی سال سے جس مسجد میں مامور رہ کر خدمتِ دین اور خدمتِ خلق میں مصروف تھے، اس کے بالکل سامنے غیر مسلم بھائیوں کے چند مکانات واقع تھے، اور گرد اور لیشت پر دور تک مسلمانوں کی ٹھوس آبادی پھیلی ہوئی تھی ـــــ اکثریتی اور اقلیتی فرقوں میں امام صاحب تقریباً یکساں مقبول تھے۔ ان کا سبھی کے ساتھ انسانوں جیسا برتاؤ تھا کسی بھی بنیاد پر بھید بھاؤ کا مذموم جذبہ ان کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ وہ سب کے تھے ان کے سب تھے۔

جب یکایک فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکی تو مسجد کے سامنے والے غیر مسلم بھائی اپنے گھر چھوڑ کر راتوں رات دوسرے مقامات پر منتقل ہو گئے۔ فسادات کی آگ بھڑکتی رہی، شعلے لپکتے رہے! کتنے ہی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ بے دردی کے ساتھ اتارا گیا۔ کتنے ہی بے گھر ہوئے ...... ! لوٹ مار اور آتشزنی کے اس خوفناک دورِ بربریت میں انسانیت کو بھی قتل کر ڈالا گیا۔ نتیجتہً غیر معینہ مدت کیلئے کرفیو نافذ کر دیا گیا ـــــ غیر قانونی اسلحہ برآمد کرنے کیلئے خانہ تلاشی کا طویل سلسلہ شروع ہوا ـــــ گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کے عمل نے جیلوں کو تنگ کر دیا ـــــ اور ـــــ اور غریبوں کی زندگی کا قافیہ بھی تنگ ہو گیا۔ بہت سوں کو جیلوں کی مضبوط چہار دیواری میں پناہ نصیب ہوئی۔

کئی روز بعد جزوی طور پر کرفیو اٹھایا گیا تو چند پولیس والے مالک مکان کے ہمراہ، مذکورہ مسجد کے بالمقابل مکان کا جائزہ لینے آ گئے۔ مکان کو کوئی نقصان نہیں پہونچا تھا لیکن اس کے مکین لا پتہ تھے۔

مالک مکان کا امام صاحب سے سامنا ہوا تو دونوں گرمجوشی کے ساتھ ملے۔ مخلصانہ دوستانہ گفتگو کے دوران امام صاحب نے انکشاف کیا "آپ کے سب گھر والے بحفاظت وبخیریت ہیں میں نے انہیں اپنے حجرے میں پناہ دے رکھی ہے کہ یہ میرا فرض تھا۔ پڑوسی کا ہر طرح خیال رکھنا یوں بھی اہم فرائض میں داخل ہے۔۔۔۔۔!!"

پولیس کی نگرانی میں پناہ گزینوں کو حجرے سے ان کے گھر بھیج دیا گیا ــــ اس خوش گوار عمل کے فوراً بعد غیر متوقع طور پر، پناہ گزینوں کی غیر موجودگی میں، پولیس انسپکٹر نے امام موصوف کو دو الزامات کے تحت حراست میں لے لیا ایک یہ کہ ــــ امام صاحب نے اس محلے کے اقلیتی فرقے کے افراد کو اغوا کیا اور دوسرے یہ کہ انہیں کئی دن تک اپنے تنگ وتاریک حجرے میں یرغمال بنائے رکھا۔

غزل

رفیع الدین، حیدرآباد

جو تم دل پہ بجلی گرانے چلے ہو　　میں سمجھا کہ کعبے کو ڈھانے چلے ہو
بڑی آرزو سے بنایا نشیمن　　کہاں تم یہ بجلی گراتے چلے ہو
جفا کو بھی اپنی ذرا یاد رکھنا　　وفا جب مری آزماتے چلے ہو
چلا جب نہ جادو زمانے پہ اپنا　　مقدر پہ آنسو بہاتے چلے ہو
یہ منظر بھی ہوگا رفیع دیکھنے کا　　تم ان کو غمِ دل سنانے چلے ہو

کسوٹی

کلیم سرونجی

(۱) ورق ورق

نوٹ : تبصرے کیلئے دو کتابوں کا وصول ہونا ضروری ہے

مشاعروں کی روایت بہت قدیم ہے لیکن آزادی کے بعد مشاعرے جہاں تفریح کا ذریعہ بنے ہیں مشاعروں نے اردو کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کلیم سرونجی کے بارے میں ساغر چشتی لکھتے ہیں کہ انہوں نے کلیم سرونجی کو پہلی مرتبہ ۱۹۶۸ء میں سیہور کے مشاعرے میں سنا۔ ساغر چشتی صہبا قریشی کے استاد رہے ہیں اور کلیم سرونجی صہبا قریشی کے شاگرد۔ یعنی کلیم سرونجی کا سلسلۂ تلمذ حضرت ساغر چشتی سے جا ملتا ہے۔

پولیس کی ملازمت کے باوجود کلیم سرونجی کا ذوق شعر کافی ستھرا اور سلجھا ہوا ہے اور یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔ ورنہ پولیس اور شاعری میں تو بعد المشرقین ہے۔ عمر حیات خاں غوری نے بجا کہا ہے کہ پولیس کے غیر شاعرانہ ماحول میں زندگی گذارنے والے کلیم سرونجی محض اپنی فطرت صلاحیت کی وجہ ہی سے اپنے ذوق لطیف کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہو سکے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک صالح فکر بہت نمایاں ہے جو آج کے تجدید پسندانہ دور میں خالی خالی ہی نظر آتی ہے۔ خصوصاً ان کی رباعیوں میں یہ عنصر بہت غالب ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ امجد حیدرآبادی کے بعد جن شعرا نے رباعی کے فن کے ساتھ انصاف کیا ہے ان میں سے کلیم سرونجی بھی ایک ہیں۔ وہی سیدھا سادا سا انداز وہی دل میں اتر جانے والے لفظی پیکر۔ ان کا شعری مجموعہ ورق ورق ایسے ہی پیکروں سے مزین ہے

جینا ہو تو بے خوف جیو دنیا میں   مرنا ہے تو اک شیر کی مانند مرو

کلیم سرونجی صرف ذات باری سے ڈرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ خدا نے بزرگ و برتر کا خوف جس دل میں جاگزیں ہوگا۔ اس کا دنیا کی کوئی طاقت کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ جنون کے قائل ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ راہ عشق میں جنون ہی کام آتا ہے ہوشمندی تو گمراہ کر دیتی ہے۔ کہتے ہیں۔

جنونِ شوق جب تک رہبرِ منزل نہیں ہوتا — کوئی رہرو تمہاری راہ کے قابل نہیں ہوتا

کلیم سرونجی کی ایک اور خصوصیت ان کی مشکل پسندی کا ہے جس کا خود انہیں احساس بھی ہے اور وہ اس پر نازاں بھی ہیں۔

مری مشکل پسندی سے زمانہ کیوں گریزاں ہے — رہیں گے بدگماں مجھ سے خرد مندا جہاں کب تک

وہ مشکل پسندی اور ادق گوئی کو اس لئے روا سمجھتے ہیں کہ حقایات بہ آواز بلند نہیں جا سکتی ان کی ایک رباعی ہے۔

کہدوں جو بہ آواز بلند بات ہیں حق — چہروں سے نمایاں ہوا بھی رنگ شفق
اے اہل خرد آپ نہ سمجھیں گے کبھی — افسانۂ دنیا کا ہے مضمون ادق

کلیم سرونجی کے پاس روایت کی پاسداری بھی ہے اور کلاسکیت کا رچاؤ بھی۔ وہ زندگی کے تجربات سے کچھ سیکھتے ہیں اور کچھ سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مسلسل تلاش کے قائل ہیں مگر ذوق جستجو کے ساتھ مگر

ڈھونڈنے میں کچھ اور لطف آئے — دل میں گر ذوق جستجو بھی ہو۔

ان کی شاعری پڑھتے ہوئے جذب دل کی کیفیات کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ زبان و بیان پر توجہ دینے کے بجائے یہ سوچنا ہوگا کہ فراز طور پر جا کر جلووں کو بے نقاب کرنے کی تمنا نے کلیم محدود ہونے سے بچالیا ہے۔

جا کر فراز طور پہ ایک بار پھر کلیم — جلووں کو بے نقاب اگر ہو سکے تو کر

۱۲۸ صفحات پر مشتمل کراؤن سائز کے اس مجموعہ " ورق ورق " کے آخری سات صفحات پر جو تاریخیں درج ہیں ان سے کلیم سرونجی کی جدت طبع اور فن تاریخ گوئی پر مہارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے عیسوی، ہجری، سمت بکرمی اور کئی دوسرے کلینڈروں کی تواریخ نکالی ہیں۔ اس مجموعہ میں کلیم سرونجی کا ۱۹۷۱ء سے ۱۹۶۰ء تک کا کلام شامل ہے۔ دوسرا مجموعہ " لفظ لفظ " آئے تو معلوم ہو کہ ۱۹۶۰ء کے بعد کلیم کے فن میں کسی قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ۔ اردو اکیڈمی مدھیہ پردیش کے اشتراک سے

ئع ہونے والے اس مجموعہ کی قیمت ۱۵ روپیہ ہے جسے انجمن حسن ادب ہند جہانگیر آباد
پال سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کتابت وطباعت کمزور ہونے کے باوجود شناسا حلقوں
یہ کتاب مقبول ہوسکتی ہے۔

ذکر خیر البشر

قاضی محمد تاج الدین تاج اورنگ آبادی

نعتیہ کلام پر مشتمل زیر نظر مجموعہ "ذکر خیر البشر" عشق رسول عربی میں سرشار
ج اورنگ آبادی کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ جہاں محمدؐ کا نام آئے وہاں جبیں جھک ہی جاتی
ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس کی شعری قدر و قیمت کیا ہے۔ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ
شاعر نے عشق رسول میں کتنا مخمور ہے۔ اور بلا شک و شبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ
عقیدت کی بے پناہ قوت ہی نے تاج اورنگ آبادی کی زبان پر یہ شعر جاری کر دیئے ہونگے،
جو انہوں نے سپرد قرطاس کر دیئے ابتداء میں فہرست نہیں ہے۔ جملہ ۵۹ نظمیں ہیں۔ جن
میں پانچ حمدیہ، تین نظمیں فضیلت قرآن پر، منقبت امام حسینؓ و حضرت علیؓ دو نظمیں فلسفہ
عید رمضان و عید الضحیٰ پر ایک نظم دعائے نیم شبی اور ایک نظم پندرہویں صدی ہجری
کے استقبال پر ہے۔ باقی تمام نظمیں حضور رسالت مآب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان
اقدس میں نذرانہ عقیدت ہیں۔ جن میں ایک فارسی تخمیس اور ایک فارسی پر اردو تضمین بھی
شامل ہے۔ کتاب سبز رنگ کے ڈسٹ کور سے مزین ہے جس پر گنبد خضرا کی تصویر جلوہ
افروز ہے اور ہر نظم کے عنوان کے ساتھ ڈسٹ کور کا مختصر بلاک بھی نظر آتا ہے جو
تاج اورنگ آبادی کی گہری عقیدت کا غماز ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اذان صبح اذن لا الٰہ الا اللہ — شعور صدق عمل لا الٰہ الا اللہ
مرے افکار کی تاسیس میں تیرا یقین شامل — مری کوتاہیوں کا پردہ دار و مہرباں تو ہے

فکر و نظر میں ایک نیا انقلاب سا ہے ـــــ دل میں یقین کی شمع فروزاں تمہیں سے ہے

بظاہر اثر مانگت ہوں دعا میں ـــــ بہ باطن دلی مدعا مانگتا ہوں

یہ واقعی خدا کا کرم ہے کہ زبانِ تاج سے نعت رسول جاری ہے جو ان کی نجات کا سبب ہے

وہ خود لکھتے ہیں سہ

من گنہ گارم و لے نازم کہ گویم نعت پاک ـــــ ایں سعادت تاج مدحت سینہ نہادم بالیقیں

"ذکر خیر البشر" نعتیہ ادب میں ایک اہم اضافہ ہو یا نہ ہو ـ تاج اورنگ آبادی عاشق رسول کی حیثیت سے ضرور جانے اور مانے جائیں گے ۔ ڈیمائی سائز کے ۸۰ صفحات پر مشتمل اس نعتیہ مجموعہ کو ۱۰ روپیہ میں اورنگ آباد ٹائمز اورنگ آباد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

متاعِ فکر ـ عروج زیدی

اقبال نے ایک عرصہ پہلے کہہ دیا تھا کہ سہ

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب

لیکن آج تک بھی ذہن اس قدر محکوم ہیں کہ جب کبھی دلیل و برہان کی بات آتی ہے نظریں مغرب کی طرف ہی اٹھتی ہیں ۔ مشرقی اقدار اور مشرقی تہذیب سے کنارہ کشی اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ نگاہیں مغرب کی چمک دمک سے خیرہ ہوگئی ہیں ۔ اور اگر کوئی ایسے میں مغربی افکار و تصورات سے درگزر کر کے مشرق کی روایات کو سینے سے لگاتا ہے تو رجعت پسند کہلاتا ہے لیکن ایسے لوگ بھی معدودے چند ہی ہیں ۔ انہیں میں سے ایک عروج زیدی بھی ہیں جنہوں نے مغرب کی نقالی کو اپنا شیوہ بنانے کے بجائے صحت مند مشرقی اقدار کو گلے لگایا ہے ۔ دیباچہ میں انہوں نے خود لکھا ہے ۔

"میں پرانی قدروں کو ہیچ در ہیچ نئی اقدار کے مقابلے میں زیادہ عزیز رکھتا ہوں الا

بیگانوں کے نقشِ قدم پر چلنے کو "تدبیرِ منزل نہیں سمجھتا۔ میری طرزِ احساس" میں مغربی افکار و تصورات کی نہیں مشرقی تہذیب و اقدار کی قوسِ قزح ہے"

لیکن عروج زیدی کی شاعری میں "پرانی اقدار" کا وہ فرسودہ تصور نہیں ملتا جو ایک زوال پذیر معاشرے کی پیداوار ہوتا ہے۔

شعورِ فکر و بصیرت کی شرط لازم ہے — کہاں کہاں ترے جلووں کا اہتمام نہیں

عظمتِ آدم کی حقیقتوں سے عروج زیدی واقف ہیں۔ بڑے مضبوط لہجہ میں کہتے ہیں

وقارِ آدمِ خاکی محیطِ کون و مکاں — زمیں بھی زیرِ نگیں آسماں بھی زیرِ نگیں

فلک بھی جھک کے زمیں کو سلام کرتا ہے — فرازِ عرش سے اونچے ہیں تیرے خاک نشین

عروج زیدی نے شعر و ادب کو وجہِ عزت نہیں قرار دیا۔ وہ شاعری کے افادی پہلو کو سامنے رکھتے ہیں۔ شاعری کو فیشن نہیں سمجھتے بقول ڈاکٹر احمد سجاد عروج زیدی نے نہ آنکھ بند کر کے روایت کی تقلید کی ہے اور نہ جدت کو بطور فیشن اختیار کیا ہے۔ عروج زیدی کے پاس جدید رنگ بھی نظر آئے گا لیکن بڑے صالح انداز میں۔

ذیل کے اشعار دیکھئے۔ کس قدر جدید لب و لہجہ ہے لیکن اس میں روایت کی ہلکی آنچ نے ایک عجیب آہنگ پیدا کر دیا ہے۔

پتھروں کے شہر میں آئینہ گر ہو جائیے — ہر نفس پر اک چھناکے سے پڑے گا واسطہ

یہ بات الگ ہے کہ قد سے طویل سایہ ہے — ہمارے پاؤں رہیں گے حدودِ چادر میں

خود ساختہ ہے گرمیٔ بازار کا عالم — جلتا ہوا احساس ہے تپتے ہوئے حالات

اس کا چہرا کبھی دوسرا دیکھا۔ — جب دوبارہ کوئی ملا ہم سے

ہاں مری شیشہ گری کے واسطے پتھر ہیں لوگ — دور سے دیکھو تو کیسے آئینہ پیکر ہیں لوگ

مشرقی شعری اقدار کا رنگ عروج زیدی کے کلام کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے روایت سے گریز نہیں کیا بلکہ اس میں سے وہ سارے پھول چن لئے جن کی آج ضرورت ہے۔ صداقت مروت محبت خلوص کے لطیف جذبات سے ہمکو عروج زیدی کی غزلیں ایک مسرت آمیز سکون کا

[illegible] پیاسا میری عادت ___ [illegible] سے

[illegible] کی چیز ہے موجوں کا رنگِ اشتعال ___ سیر حاصل کرنے والے آئیں طوفاں کے قریب

بے حقیقت تھا ہر ایک قطرہ عروج ___ ربطِ باہم سے سمندر بن گیا۔

میری جانب سنگباری وہ بھی سمتِ خاص سے ___ دینے والا آج دادِ آشنائی دے گیا

اب کیا بتائیں کون سی منزل نظر میں تھی ___ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم سر کے بل گئے

پیرانہ سالی کے باوجود عروج زیدی کی خود آگہی نے انہیں صالح فکر کا نمائندہ شاعر بنا دیا ہے اور اسرارِ کائنات کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش نے اردو غزل میں رس گھول دیا ہے۔ ان کی شاعری دل کی شاعری ہے۔

اس تجربہ کے واسطے اک عمر چاہیے ___ الفاظ ساتھ چھوڑ دیں دل بولنے لگے

"متاعِ فکر" خوبصورت دسٹ کور سے مزین ہے۔ طباعت و کتابت گوارہ ہے۔ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ کی قیمت بیس روپیہ ہے جو مواد کے اعتبار سے کچھ زیادہ نہیں۔ مذاقِ سلیم رکھنے والوں کو یہ مجموعہ یقیناً پسند آئے گا جسے ملک کے اہم مراکز کتب سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اعلان ہم یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں کہ "فنکار" آئندہ سے انشاء اللہ بہترین گٹ اپ نئی آن بان اور معیاری تخلیقات کے ساتھ منظرِ عام پہ آ رہا ہے۔
سائز میں بھی مناسب اضافہ پیشِ نظر ہے۔ اس کے ساتھ قیمت میں بھی تبدیلی کے لئے قارئین تیار رہیں۔

(ادارہ)

تعمیری اور فلاحی ادب کا نقیب

ماہنامہ

فنکار

حیدرآباد

جلد ۳ ——— شمارہ (۶، ۷، ۸)

جون، جولائی، اگست ۱۹۸۶ء

فی شمارہ	۳/۵۰ روپے
سالانہ	۴۰/= روپے
معاونین سے	۱۰۰/= روپے
دیگر ممالک	۱۵۰/= روپے

رابطہ

ڈاکٹر احمد سجاد
طارق منزل، ہرمو ہاؤزنگ کالونی، رانچی، بہار

دفتر "فنکار"
لکڑ کوٹ، حیدرآباد۔ ۲

مسعود جاوید ہاشمی نے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر، دفتر "فنکار" لکڑ کوٹ حیدرآباد۔ ۲ سے شائع کیا

نقوش

ماہنامہ [illegible] جلد ۳۳ شمارہ ۸
جون جولائی اگست ۱۹۸۶
ص ۸ - ۱۱

باسمہٖ تعالیٰ

ڈاکٹر احمد سجاد

نقشِ اول

تخلیق و تنقید کی بحث کے دوران فنکاروں کی جانب سے بسا اوقات یہ اعتراض بھی ہوتا ہے کہ ناقدین کلام تخلیق کی جگہ کاوی کو سمجھے بوجھے بغیر بس کیڑے نکالنے بیٹھ جاتے ہیں مگر معاملہ تخلیق ادب کا ہو یا نقد ادب کا ان دونوں کے لیے ذوق اور فطری صلاحیت کا اس تکرار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے کہ جیسے ان کے لیے کسی اور شئے کی کوئی ضرورت ہی نہیں سوال یہ ہے کہ اگر ذوق ہی کافی ہے تو بہت سے ادیب اور ناقدین ذوق ادب و تنقید اور عمر بھر کی ادبی کاوشوں کے باوجود گمنام کیوں رہ جاتے ہیں یا بہت ہوا تو ایک ادنیٰ یا اوسط سطح سے اوپر کیوں نہیں اٹھ پاتے فنکاروں کی شانِ بے نیازی کا لیبل لگا کر یا ادبی گروہ بندی کی پھبتی کس کر گمنامی اور سطحیت کے اس سوال پر . . پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔

اگر غور کیجیے تو تخلیق و تنقید کی بعض بہترین صلاحیتیں مطالعہ و تحقیق کی کمی کے باعث تقریباً رائیگاں ہو جاتی ہیں۔ جس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا سرور، وسائل کی کمی، احساسِ کمتری یا فرصت کی کمی وغیرہ ظاہر ہے کہ ان پر قابو پائے بغیر تخلیق کار ہو یا تنقید نگار اپنی نگارشات کو نکھارنے کے لیے وقت نکال ہی نہیں سکتا علم و دانش کی موجودہ سطح تک پہنچنا اور آج کی دانشوری کو جزو تخلیق بنانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لیے سخت محنت اور تلاش و جستجو کی ضرورت ہے کیونکہ ادب و فن کا عمل احساسات و جذبات سے آگے بڑھ کر فکر و ادراک کو بھی منور کرنے کا عمل ہے۔ مشاہیر ادب کی تلاش میں بطور استثنیٰ [illegible] کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی کہ کسی نے عصری دانشوری پر علمی و تحقیقی یا عملی و تجرباتی انداز میں عبور حاصل کر کے اس میں جزب دیگر [illegible] بغیر کوئی اعلیٰ ادب پیش کیا ہو۔ آج بھی غالبیات و اقبالیات کی دھوم اس لیے ہے کہ ان دونوں نے نہ صرف یہ کہ عصری دانشوری پر عبور حاصل کیا بلکہ انہیں جزو تخلیق بنایا۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ کئی اعتبار سے اقبال کی تخلیقی صلاحیت غالب سے کمتر ہونے کے باوجود بحیثیت مجموعی اقبال کا پلہ صرف اس لیے بھاری ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تہذیبی [illegible] کی بازیافت اور عصری دانشوری کے حصول میں غیر معمولی محنت و کاوش سے کام لے کر اپنے ادب کو ثمر بار کیا۔

اس سے قدرے مختلف ایک اور مثال کبیر داس اور نظیر اکبر آبادی کی ہے ان دو عظیم تخلیق کاروں نے اپنے عہد کے دل و دماغ کو علمی و کتابی سے زیادہ عملی و تجرباتی طریقے سے اپنے قابو میں کیا اور انہیں نہایت [illegible] تخلیقی انداز میں پیش کیا۔

لہٰذا وہ فنکار اور ناقد جو ادب میں تعمیر اور انقلاب کے دعویدار ہیں، ان کی ذمہ داریاں دوگنی ہو جاتی ہیں [illegible] نظریات سے بلند تر فکر و نظر کی دریافت ہو سے اس دریافت کو ایسے پیرایۂ ادب میں پیش کرنا جو عصری ادبی سطح کو نئی بلندیاں عطا کر سکے۔

سماج کی تشکیل و تعمیر میں ادب کا کردار

پروفیسر عمر حیات خان غوری
صدر شعبۂ اردو، انجمن کالج، بھٹکل

انسانی سماج افراد کے مجموعہ سے وجود میں آتا ہے ۔ مگر چونکہ سماج میں سارے افراد بہر طور یکساں ذہن و فکر اور کردار کے حامل نہیں ہوتے اسی لئے ان مختلف النوع افراد کے کردار سے بننے والی اجتماعی شکل سماجی کردار کہلاتا ہے افراد کے ذہن و فکر اور ان کے کردار کی تشکیل نو تعمیر میں لاتعداد عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے ۔ ان عوامل میں زبان و ادب کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔

زبان انسانی سماج میں اہم ترین ذریعہ اظہار و ابلاغ ہے ۔ یہ ایک سماجی پس منظر میں وجود میں آتی ہے ۔ اسی سماج سے جذبہ اور فکر حاصل کرتی ہے ۔ اسی کی ضرورت پوری کرنے کیلئے الفاظ تراشتی، اصطلاحات وضع کرتی اور تلمیحات کا خزانہ جمع کرتی ہے ۔ اور اس طرح اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرلیتی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے سماج کی ساری ضرورتوں کی تکمیل ہوسکے ۔ یہی زبان جب ارتقاء کی منزلیں طے کرکے ادبی حیثیت حاصل کرلیتی ہے تو اس زبان کے ادیب بھی اسی سماجی پس منظر میں اپنے ذہن و فکر کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں اور اسی سماج کے تناظر میں ادب کی تشکیل و تخلیق کا فریضہ ادا کرتے ہیں اسی وجہ سے کسی سماج کے تناظر میں تخلیق کردہ ادب اس سماج کے جذبات و احساسات ہی نہیں بلکہ اس کی عملی زندگی کے ہر گوشہ کو اپنی جلو میں سمیٹ لیتا ہے اور پھر وہ ادب اس کی تہذیب و تمدن، اسکے رسوم و رواج، اس کے عقائد و نظریات اور اس کے جذبات و احساسات کا امین بن جاتا ہے اور اس طرح ادب اپنے سماج کی امتیازی خصوصیات کو موجودہ نسل میں پیدا کرنے اور آنے والی نسلوں تک انہیں منتقل کرنے کا سبب بن جاتا ہے ۔ اسی لئے کسی قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ادب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔

انسان نے اپنی سماجی ضرورت کے پیش نظر جہاں ذریعۂ ترسیل و ابلاغ کے لئے زبان و ادب کو ایجاد کیا ہے وہیں اس نے انسانی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کے لئے دوسرے اور بھی بہت سے علوم ایجاد کرلئے ہیں ۔ یہ سارے علوم انسانی زندگی کی اکائی کو ختم کرکے اس کے مختلف گوشوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور ان موضوعات کا اس خالی انداز میں مطالعہ کرتے ہیں کہ انسان صرف اس مخصوص شعبہ حیات کا نام ہو کر رہ جاتا ہے ۔ ان سارے علوم کو ایک جگہ جمع کرکے اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو آدمی یہ سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتا کہ وہ انسان کو کیا سمجھے ۔ ایک علم کے ماہرین اسے محض معاشی وجود قرار دیتے ہیں تو دوسرے محض سماجی وجود، ایک کے نزدیک انسان صرف جنس کا نام ہے تو دوسرے اسے محض نفسیاتی

وجود قرار دے دیا اور اگر ایک نے روح ہی کو وجود مانا ہے تو بجائے اس کے انفرادی وجود کو یہ اجتماعیت بنا کر نظر آتا ہے۔ الغرض انسان واقعتاً کیا ہے کہیں بھی نہیں ملتا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان میں سے کسی شعبۂ علم کے پیش نظر انسان کا مطالعہ بحیثیت انسان اور وہ بھی مکمل انسان کے نہیں ہے بلکہ وہ محض اس کی زندگی کے ایک شعبہ یا اس عضو پر مطالعہ ہے کہ دوسرے سارے شعبے نظروں سے اوجھل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر ان سارے علوم کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی اندھوں کی بستی میں آ گیا ہے اور ہر اندھے کا ہاتھ ہاتھی کے جسم کے جس عضو پر پڑ گیا ہے اس نے اسی عضو کو ہاتھی قرار دے لیا ہے اور اپنے اس خیال کو ثابت کرنے کیلئے طاقت لسانی کو پوری قوت سے استعمال کرنے میں لگا ہوا ہے۔ یا پھر ایسا محسوس ہوتا ہے علوم کا یہ اجتماع دراصل قصاب کی دکان ہے جس پر انسانی جسم کے سارے اعضاء بکھرے پڑے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو جو حصہ مل گیا ہے اس نے اسی کو پورا انسان ثابت کرنے میں اپنی ساری قوتیں صرف کر دی ہیں۔ ان سارے علوم کی اس نوعیت ہی کے سبب سے علامہ اقبال کو کہنا پڑا۔

"In fact, The various natural Sceinces are like so many Vultures falling on the dead body of nature and each running away with a peice of its flesh.

(The reconstruction of Religions Thoughts in Islam p-42)

(ترجمہ: دراصل مختلف نیچرل سائنس ان گدھوں کی مانند ہیں جو نیچر کی لاش پر ٹوٹ پڑ رہی ہیں اور ہر ایک گوشت کا ایک ٹکڑا لے کر بھاگ رہی ہے)

یہی وجہ ہے کہ ان علوم کا مطالعہ جس تیزی اور وسعت سے بڑھتا جا رہا ہے انسان اسی تیزی سے اعتدال و توازن سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور اب نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ انسان خود اپنی معرفت سے محروم ہو کر رہ گیا ہے۔ البتہ انسان اپنی تاریخ میں جتنے علوم سے واقف ہوا ہے ان میں صرف دو علوم ایسے ہیں جن کا موضوع انسان من حیثیت الانسان اور مکمل انسان ہے۔ ان میں سے ایک علم دین ہے اور دوسرا علم ادب۔ ان دونوں علوم کے دائرہ میں ہر وہ چیز آ جاتی ہے جس کا کسی بھی نوعیت کا کوئی تعلق انسان یا اس کی زندگی سے ہے۔

علم دین کے پیش نظر چونکہ مکمل انسان کے مسائل ہیں اور اسے مکمل انسان ہی کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے اس لئے سب سے پہلے قدم پر تو وہ انسان کو جسم اور روح کا مجموعہ قرار دیتا ہے اور پھر چونکہ انسان کائنات ہست و بود کا ایک جزو ہے اس لئے وہ انسان کا مطالعہ کائنات کے پس منظر میں کرتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کو ایک کل تسلیم کرتا ہے اس لئے اس کے مختلف شعبوں میں اعتدال و توازن اسی نوعیت کا برقرار رکھتا ہے جو نوعیت کہ واقعتاً اس کو انسانی زندگی

کے کل میں حاصل ہے۔ اور پھر وہ انسانی زندگی کی رہنمائی کی جو راہ اختیار کرتا ہے وہ نہ صرف اس کے ذہن کو مطمئن کرتی ہے بلکہ اس کے جذبات و رجحانات کی تہذیب کر کے ان میں اعتدال پیدا کرتا ہے اور اس کے جذبہ عبودیت و عقیدت کو مرکزیت عطا کر کے اس کی روح کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔

اس لئے علم دین سب سے پہلے انسان کو خالق کائنات کی معرفت عطا کرتا ہے اس کے بعد وہ کائنات کی نوعیت سے بحث کر کے کائنات اور خالق کائنات سے اس کے تعلق کی نوعیت بتا کر اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ انسان بلا کسی ریب و شک کے اس پر عمل کرتا ہے۔ وہ انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیکر ساری کائنات میں اس کے سر کو بلند کر دیتا ہے اور کبر و غرور سے نجات دلانے کے لئے اس کے سر کو خالق کائنات کے سامنے جھکا دیتا ہے۔ وہ انسان کے سامنے زندگی کا بلند ترین نصب العین رضائے الٰہی کو رکھ کر اسے لامرکزیت اور انتشار سے نجات دیتا ہے اور زندگی کی حقیقت سمجھا کر حیات بعد الممات کی کامیابی کے لئے فکر مند کر کے اس کی زندگی کے ایک ایک عمل کو با مقصد بنا دیتا ہے گویا کہ مذہب انسان کو ایک ایسی سرچ لائٹ عطا کر دیتا ہے جس سے وہ حیات و کائنات کے سارے ہی مسائل کو چشم زدن میں حل کر کے رکھ دیتا ہے۔

مذہب کی اس رہنمائی کے بعد ادب کی کارروائی شروع ہوتی ہے ادب زندگی کی تنقید ہے۔ اسی لئے ادیب جب تخلیق ادب کے دوران زندگی کی تنقید کریگا تو لازمی طور پر اس کے سامنے زندگی کے وہ اصول رہیں گے جن پر انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کا دعویٰ کیا گیا ہوگا اور وہ بتائے گا کہ ان بنیادی اصولوں پر کتنا عمل کیا گیا ہے اور کتنے معاملات میں ان سے روگردانی کی گئی ہے۔ معاشرہ کے تشکیلی اصولوں کو سامنے رکھے بغیر تنقید ممکن ہی نہیں ہے پھر چونکہ ادب ماضی کا محاسب حال کا آئینہ دار اور مستقبل کا اشاریہ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے ادیب ماضی کا محاسبہ کر کے بتاتا ہے کہ جن اصولوں پر معاشرہ کو تشکیل کیا گیا تھا ان میں سے جن پر عمل ہو سکا ہے ان کے کتنے شیریں اور خوش ذائقہ پھل معاشرہ کو میسر آرہے ہیں اور کن کن اصولوں سے روگردانی کرنے کے نتیجہ میں معاشرہ کن خاردار جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گیا ہے اس سے کیسے کڑوے کسیلے پھل حاصل ہو رہے ہیں۔ اور اگر مستقبل میں ان کڑوے کسیلے پھلوں اور خاردار جھاڑیوں سے نجات پانا ہے تو کن اصولوں پر مزید عمل کرنا ہے اور کون کون سے غلط اصولوں کو ترک کرنا ضروری ہے۔

ادب کا موضوع چونکہ مکمل انسان کا مطالعہ ہے اسی لئے اس کے دائرہ میں کائنات کے معمولی ذرہ سے لیکر خالق کائنات تک اور روز ازل سے لیکر یوم ابد تک اور اس کے بعد تک کے سارے معاملات اسی حد اور اسی نوعیت تک شامل ہیں جس حد اور جس نوعیت تک ان کا تعلق انسان اور اسکی زندگی سے ہے۔

ان دونوں علوم کی باہمی وسعت و ہمہ گیری اور باہمی تعلق ہے جس کی وجہ سے دنیا کی ساری زبانوں کے ابتدائی ادبی نمونے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے دستیاب ہوئے ہیں جو انسانی معاشرہ کی اس ضرورت کو پورا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جہاں تک ادب کے اصلاحی طریق کار کا تعلق ہے تو وہ اپنی ذات میں بڑا ہی منفرد ہے۔ ادب نہ مذہبی رہنماؤں کی طرح وعظ و نصیحتیں کرتا ہے نہ معاشرتی مصلحین کی مانند محض اخلاقی نصیحتوں پر اکتفا کرتا ہے۔ اس لئے کہ نصیحتیں خواہ کسی مقصد کے تحت کی جائیں ہوتی بہر حال بڑی خشک ہیں اور انسانی طبیعتیں ان سے کم ہی اثر لیتی ہیں۔ اس لئے ادب نصیحتوں اور وعظ و پند کے طریق کار سے کلی طور پر گریز کرتا ہے۔ وہ نظریات اور فلسفوں کی طرح خشک اصولوں سے بھی بحث نہیں کرتا بلکہ ان سب سے ہٹ کر وہ ایک ایسا طریق کار اپناتا ہے جو اپنی ذات میں بڑا غیر محسوس مگر اپنے اندر اثر پذیری کی بڑی غیر معمولی قوت رکھتا ہے۔

سب سے پہلے مرحلہ میں ادب معاشرے کے اس پڑھے لکھے طبقہ کو اپنا مخاطب بناتا ہے جس میں تخلیق ادب کی صلاحیت ہوتی ہے۔ پھر وہ اس گروہ کے سامنے ادبی نظریات اور تنقیدی اصول رکھتا ہے تاکہ ان کے ذہن ان اصولوں کی صداقت پر مطمئن ہو جائیں اور ان پر مبنی ادب کی تخلیق کر سکیں۔ اس طور پر کہ اصول کہیں زیر بحث نہ آئیں مگر پورے تخلیقی ادب میں وہ اصول روح کی طرح سرگرم عمل رہیں۔ اس تخلیق کردہ ادب کے مخاطب معاشرہ کے عوام ہوتے ہیں۔ پھر ادیب اتنی بلندی سے تخلیقی ادب میں قاری کو مخاطب کرتا ہے اور پھر اس اسلوب میں مخاطب کرتا ہے کہ گویا "یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ اسی طرح ادیب قاری کے ذہن کو متاثر کر کے اسے اپنے پیچھے چلنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے اور وہ جن راہوں سے گزار کر جس نتیجہ پر قاری کو لانا چاہتا ہے قاری وہاں پہنچنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قاری کا ذہن تذکرہ کئے بغیر ان اصولوں کی صداقت پر ایمان لاتا چلا جاتا ہے جن کے مطابق ادب تخلیق کیا گیا ہے اور انسانی زندگی کے مسائل کے اس تجزیہ سے مطمئن ہو جاتا ہے جو ادیب انکے سامنے رکھتا ہے۔ گویا کہ ادب کی حیثیت اصلاح معاشرہ کی ریل کی پٹڑی کی مانند ہے جس کے بدل جانے سے مسافر غیر محسوس طور پر اس منزل پر پہنچ کر رہتا ہے جس پر یہ بدلی ہوئی پٹڑی اسکو لے جانا چاہتی ہے۔ ریل کے کنٹرول کیبن کے ملازمین کی طرح ادبی اصول و نظریات بھی قاری کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں لیکن معاشرتی اصلاح کی اس ریل کو کنٹرول بہر حال وہی اصول کرتے ہیں اور اس لئے اس ریل کو بہر حال پہنچنا وہیں پڑتا ہے جہاں یہ اصول اسے لیجانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرہ میں جب ادب کا مقصد تفننِ طبع کو بنایا گیا زندگی لہو و لعب بن کر رہ گئی۔ جب ادب برائے ادب کے اصولوں پر ادب کی تخلیق شروع ہوئی انسانی زندگی نصب العین سے محروم ہو کر انتشار کا شکار ہو گئی۔

جب زندگی کے اس انتشار سے پریشان ہو کر انسان ہمت ہار بیٹھا تو اس نے راہ فرار اختیار کی اور ذہنی و خیالی قلعے تعمیر کر لئے تو زندگی بزدلی، احساس کمتری، غیر ذمہ داری اور تصنع بن کر رہ گئی۔ پھر جب ادب کو ایک مقصد دینے کی کوشش کی گئی تو ترقی پسندی کے نام گروہوں سے در آمد کر کے طبقاتی ادب تخلیق کیا گیا اور معاشرہ طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو کر رہ گیا۔

الغرض زبان و ادب نے معاشرہ کی تعمیر و تخریب میں ہمیشہ بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ ادب کو مذہبی اصلاح کے مقصد کے تحت تخلیق کیا گیا تھا تاکہ مذہب کے ساتھ ساتھ ادب بھی معاشرہ میں صالح اقدار و روایات کو عام کرنے

میں محفوظ رہ سکے مگر بعد کے دور میں یہ چشمۂ صافی اپنی پاکیزگی سے محروم ہوتا چلا گیا۔ خاص طور سے غالب قوموں نے ہمیشہ اپنی مغلوب قوم کے ادب کو متاثر کرنے اور اس پر اپنے ادب کے اثرات کو غالب کرنے کی کوشش کی ہے اسی لئے کہ ماہرین عمرانیات کی رائے ہے۔

"ایک قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کی بقا و فنا میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کو اگر آپ دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اس کی زبان اور رسم الخط کو بدل دیجئے۔ رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔ اس کی آنے والی نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا اور وہ بالکل نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لیکر اٹھے گی۔"

(جنگ آزادی کی نوعیت ۲۶ص)

چنانچہ دنیا میں جن جن لوگوں نے قومیتوں کے بنانے اور بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے ان سب نے زبان و ادب کے اس ہتھیار کو ضرور استعمال کیا ہے۔ زار روس نے اپنے امپریلزم کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے روسی زبان اور رسم الخط کو تمام غیر روسی قوموں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ سب قومیں روسی بن جائیں بعد میں لینن نے اسی مقصد کے پیش نظر مشرقی قوموں کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لئے ان کے رسم الخط کو لاطینی رسم الخط میں بدل دیا۔ جب ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت عثمانیہ کی لاش پر قومی حکومت قائم کی تو اس نے بھی عربی زبان اور اس کے رسم الخط کو ملک بدر کر کے رکھ دیا اور ترکی زبان کے لئے رومن رسم الخط کو رواج دیا۔ یہی پالیسی فرانس نے شمالی افریقہ میں عربوں اور بربریوں کے خلاف اپنا کر وہاں سے عربی زبان اور رسم الخط کو مٹانے کے لئے استعمال کی تاکہ انہیں فرانسیسی قومیت میں تحلیل کیا جا سکے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں جب یوروپ میں نشاۃ ثانیہ کے دور کا آغاز ہوا تو اس کے ساتھ یورپ کی نوآبادیات کے دور کا آغاز بھی ہو گیا۔ چنانچہ یورپ نے بھی اپنی نوآبادیوں میں اسی لسانی پالیسی پر عمل کیا اور مفتوحہ ممالک میں یا تو نئی ابھرتی ہوئی زبانوں کو فروغ دے کر مغربی مرعوبیت کا شکار بنانے کی پالیسی کو اپنایا یا پھر وہاں رائج زبانوں کو انگریزی ادب کے اثرات سے اس حد تک متاثر کر دیا کہ وہ مغربی سامراج کے تحت و تاراج کے لئے استحکام کا باعث ثابت ہونے لگیں۔

جب یوروپ کے نوآبادیاتی نظام نے ہندوستان تک وسعت اختیار کی اور یورپ کی غلامی کا قلادہ ہندوستان کی گردن تک پہنچ گیا تو یہاں بھی مغربی آقاؤں کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ اس ملک میں مسلمانوں کی (جن سے انہوں نے حکومت چھینی تھی) علمی زبان فارسی اور دینی زبان عربی ہے جبکہ اس ملک کی اکثریت کے ایک محدود طبقہ کی علمی اور مذہبی زبان سنسکرت ہے اور عوام کی اپنی کوئی زبان ہے ہی نہیں تو انہوں نے یہاں کے حالات کا غائر مطالعہ کیا اور ملک میں ابھرنے والی ایک نئی زبان جسے ہندوی، ہندی، لشکری، ریختہ اور اردو کہا جاتا تھا کی

سرپرستی شروع کردی۔ اسی مقصد کیلئے انہوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس میں عربی فارسی کے علماء اور سنسکرت کے پنڈتوں کو ملازم رکھکر ان زبانوں کی کتابوں کے آسان اردو اور ہندی زبان میں تراجم کرانا شروع کر دیئے اور اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیکر مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنے ماضی سے منقطع کرکے رکھ دیا۔ دوسری جانب اسی زبان کی دیوناگری رسم الخط میں تحریر کی حوصلہ افزائی کرکے ہندو اکثریت کو علمی اور مذہبی زبان عطا کردی۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے دلوں میں حکومت سے محرومی کا زخم تازہ تھا۔ اسی لئے جب انہوں نے دیکھا کہ انگریز حکمران اسی ملک میں پیدا ہونے والی اس زبان کو اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے استعمال کرکے اسے اپنے اقتدار کی لونڈی بنانا چاہتے ہیں تو انہوں نے اس زبان کو ہاتھوں ہاتھ لے لیا اور پوری قوت سے اس کو اسطرح اپنالیا کہ اسے مسلمانوں کی علمی وادبی اور تہذیبی وثقافتی زبان بناکر رکھ دیا۔ اس لئے انگریز آقا اس زبان سے مایوس ہوگئے۔ انہوں نے انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا اور ہندی اردو کے مسائل کھڑے کرکے ملک کی آبادی میں لسانی نفرت اور ٹکراو پیدا کرنے میں مصروف ہوگئے تو دوسری جانب ہندستان میں یورپ کے ادبی نظریات اور تنقیدی اصول رائج کرکے ملکی ادب کو انگریزی ادب کی ذہنی غلامی میں مبتلا کرکے رکھ دیا اور پے درپے اتنے ادبی نظریات اس ملک میں درآمد کئے کہ ملک کا اردو اور ہندی ادب بری طرح سے بے چہرگی اور بے جہتی کا شکار ہوکر رہ گیا اور ہندوستانی سماج کے تناظر میں ادب کی تخلیق کے بجائے یورپ کے ادبی نظریات کے تتبع میں تخلیق ادب کا عمل ہوتا رہا اور ملک میں ایک طرح کا مصنوعی ادب پیدا ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ ادب کی اس مغربی مرعوبیت نے ہندوستان کو مغرب کی ذہنی وفکری غلامی میں مبتلا کرکے رکھ دیا۔

چنانچہ جہاں ایک جانب اردو زبان و ادب کو مسلم تہذیب اور اسلامی علوم کے خزانہ سے مالا مال کیا جارہا تھا تو دوسری جانب ایک گروہ مغربی افکار ونظریات کی مرعوبیت میں مبتلا ہوتا جارہا تھا وہیں ایک تیسرا گروہ بھی تھا جو احساس زیاں میں شدت سے مبتلا تھا اور ہندوستانی عوام کے دلوں میں احساس زیاں کو ایک زندہ قوت میں بدلنے کے لئے حب الوطنی پر مبنی ادب کی تخلیق میں مصروف تھا ظاہر ہے انگریزی دور اقتدار میں حب الوطنی سے متعلق ادب کی تخلیق کا منشا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا کہ اہل وطن میں آزادی کا عشق اور غلامی سے نفرت کے جذبات اسی طرح پیدا ہوجائیں کہ آزادی کی تڑپ ایک زندہ قوت میں بدل کر رہ جائے۔ علی جواد زیدی جب اردو ادب کے اس خزانہ کی بازیافت کو نکلے تو انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ اردو ادب نے اسی میدان میں اس قدر کام کیا ہے جس کا احاطہ کرنے کیلئے کئی اکیڈمیوں کی ضرورت ہوگی ع۱ چنانچہ حب الوطنی سے متعلق ادب ہی کا کارنامہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ملک میں تحریک آزادی کا قیام عمل میں آگیا اور ادب اس تحریک کو قوت دینے میں مصروف ہوگیا چنانچہ اس سمت میں سب سے زیادہ کام اردو ادب نے کیا۔ تحریک آزادی کے سلسلہ میں سب سے پہلے اسکی

ع۱ ملاحظہ ہو "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" - علی جواد زیدی

تحریر ضبط کی گئی۔ سب سے پہلے اس کا پریس بند کیا گیا اور سب سے پہلے اسی کے اخبار پر پابندی لگائی گئی۔ چنانچہ معاشرہ کی تشکیل و تعمیر کی یہ ادبی کوششیں رنگ لائیں اور ملک کو آزادی کی نعمت سے متمتع ہونے کیلئے صبح آزادی کا نشاۃ افزا چہرہ دیکھنا نصیب ہوا۔

ملک کی آزادی کے بعد پھر لسانی مسئلہ سامنے آیا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی اور ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی رائے تھی کہ ہندستانی کو ملک کی قومی زبان کا مرتبہ دیا جانا چاہیے جس کو دیوناگری اور فارسی رسم الخط میں تحریر کی اجازت ہو۔ اس سلسلہ میں پنڈت جی تحریر کرتے ہیں۔

"I have no doubt whatever that Hindustani is going to the Common language of India...... There is no way out of the script difficulty, for it arouses great heat and passion, except to adopt both (nagri and persian) officially and allow people to use either.

(An Autobiography by Nehru p. 454)

لیکن حکومت کا وہ گروہ جو ملک میں پراچین سنسکرتی کے احیاء کا منصوبہ بنا رہا تھا وزیر اعظم کی اس رائے سے مطمئن نہیں ہوا اور اس نے ہندی کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ قومی زبان کا درجہ دلانے میں پورا زور صرف کر دیا اور اس مقصد میں اسے کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد اردو کے خلاف باقاعدہ ماحول پیدا کیا گیا، اس کی راہ میں دشواریاں پیدا کی گئیں۔ یہاں تک کہ اس کے رسم الخط کو مشکل کہہ کر اسے دیوناگری سے بدلنے کا مطالبہ بھی کر دیا گیا کیونکہ کسی زبان کا رسم الخط اس زبان کے لئے زندگی و موت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ رسم الخط کی اس اہمیت کے بارے میں نہرو جی کہتے ہیں۔

"A change of script is very vital change for any language with a rich past, for a script is a most intimate part of its literature. Change the script and different word picture arise, different sounds different ideas. An almost insurmountable barrier is put up between the old literature and the new, and the former becomes almost a foreign language

(An Autobiography by Nehru - p: 452)

اردو دنیا چونکہ رسم الخط کی اس اہمیت سے واقف تھی اس لئے وہ اس تبدیلی کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں تھی البتہ اس کے کچھ لوگ اردو املے کی اصلاح میں مصروف لگ گئے۔ تاکہ اس پر سے عربی فارسی کے اثرات کو زائل کرکے اسے بھارتی کرنے کے لئے آمادہ کرلیں البتہ ملک کا وہ حصہ جو ہندوستان سے ٹوٹ کر الگ ملک بن گیا ہے اسے چونکہ اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب سے عشق تھا اس لئے اس نے اپنی قومی زبان کا درجہ اس زبان کو دیا جو اس تہذیب کی امین تھی۔ چنانچہ پاکستان نے اردو کو قومی زبان کا درجہ عطا کیا۔

اس مختصر جائزہ سے ثابت ہوجاتا ہے کہ قومی تہذیب کی تشکیل وتعمیر اور اس کی بقا و ترقی میں زبان و ادب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ زبان وادب قومی تہذیب کی ریڑھ کی ہڈی ہے جس کے ٹوٹ جانے سے تہذیب کا پورا ڈھانچہ ہی زمین بوس ہوکر رہ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے غالب قوموں نے مغلوب قوموں اور اکثریت نے اقلیت کی زبان وادب کو ہمیشہ ہدف بنایا ہے اور اسی وجہ سے زندہ قوموں نے اپنی تہذیبی زندگی کیلئے اپنی زبان وادب کی بقا و تحفظ اور اسکے ارتقا کو بنیادی اہمیت دی ہے۔

شاہ رشاد عثمانی
لیکچرر شعبۂ اردو، ورکرس کالج جمشید پور

ادیب اور آئیڈیالوجی

ماہنامہ "کتاب نما دہلی" (ستمبر ۱۹۸۵ء) کا

پہلا مضمون

"ادیب اور گائیڈ لائینز پیش نظر ہے۔ جناب نسیم ستر کھی نے اپنے اس وقیع مضمون کی ابتدا میں ادب کیا ہے؟ ادب کا مقصد کیا ہے؟ ادیب کسے کہتے ہیں؟ کیا ادیب کے لئے خطوط متعین کئے جائیں اور گائیڈ لائینز دی جائیں یا اسے آزاد رکھا جائے؟ جیسے سوالات اٹھائے ہیں اور پھر تھوڑے تجزیہ کے بعد موصوف نے فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ جس طرح خواب میں ہم کسی حد کی پابندی کئے بغیر ایک تصور تیار کر لیتے ہیں۔

اسی طرح

ایک شاعر یا افسانہ نگار کی تخلیق بھی کسی تربیت یا گائیڈ لائینز کی محتاج نہیں" بعد ازاں فاضل مقالہ نگار نے ترقی پسند ادب اور مذہبی ادب دونوں کو ایک ہی کے میں ہدف تنقید بنایا ہے۔

جہاں تک ادیب کے آزادی اظہار و عمل کا تعلق ہے تو یہ ایک فطری امر ہے۔ ادبی صداقت یہ ہے کہ روحانی آزادی کی منزلوں کی نشان دہی کی جائے۔ روح کی حقیقی آزادی اس کا کسی نصب العین سے وابستہ ہونا اور اس کا اظہار کرنا ہے۔ انسان کی تخلیقی صلاحیت کے لئے آزادی درکار ہے۔ خیال کے اظہار کی آزادی روحانی زندگی کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لینا چاہئے کہ آج کی بیکراں آزادی میں اخلاقی پابندی لازمی ہے۔ ان پابندیوں کو توڑنے یا نظر انداز کرنے سے اسی انتشار اور تزاحم سے ہم دوچار ہوں گے جس کا مشاہدہ آئے دن ہم شعر و ادب، تہذیب اور معاشرے میں کر رہے ہیں۔ یہ لا محدود عریاں آزادی ہی ہے جس نے نئی نسلوں کے ذہن کو پراگندہ بنایا ہے اور ادب کے ساتھ ان کی زندگی کو بھی مجروح کیا ہے۔

جناب نسیم ستر کھی کی معروضات پر کسی تبصرہ سے پہلے بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود ادب کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ دراصل ادب کے ذریعہ سے آدمی اپنی ذہنی کیفیات کو لفظوں کی شکل میں مجسم کرتا ہے اور یہی وہ لفظی مجسمہ ہے۔ جس کو دیکھ کر دوسرے لوگ اپنے ذہن میں ان کیفیات کا تعین کرتے ہیں جو فن کار کے ذہن میں پیدا ہوئی تھی اور جنہوں نے لفظوں کی شکل میں ظہور کیا ہے۔ جب ادب نام ہے احساسات کو لفظوں میں ڈھالنے کا جذبات کا ترجمانی

عطا کرنے کا تصورات کو قابلِ فہم اشاروں میں تبدیل کرنے کا تو لامحالہ ادب کا ایک مقصد تو ہوگا ہی۔ زندگی سے اس کا بالواسطہ تعلق ہے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی پرانی بحث اب اس سائنسی دور میں بے کار و بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا تصور اتنا وسیع اور متنوع ہے کہ کوئی ادب اس سے دامن کشاں نہیں ہو سکتا، اس پر ہماری موجودہ زندگی کی پرچھائیاں ضرور پڑیں گی آج کا ادیب و فنکار اپنے سماجی ماحول، معاشی محرکات، سیاسی حالات، مذہبی خیالات اور تہذیبی رجحانات سے علاحدہ نہیں ہو سکتا، اس کے گہرے اثرات ضرور مترتب ہوتے ہیں اور ہمارا ادب بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ترقی پسند اشتراکی حضرات نے ادب کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ قطعاً نامناسب تھا۔ کوئی بھی مقصد ادبی نظریہ اگر سیاسی حکمت عملی اور مصلحت آمیز مفاد پرستانہ نقطہ نظر بن کر رہ جائے تو بے شک وہ ادب کو پروپیگنڈہ و اشتہار بازی کی جولان گاہ میں پہنچا دیگا۔ لہٰذا جب ترقی پسند ادب کے نام پر اشتراکی نظریات کی جارحانہ تبلیغ و تلقین کا طریقہ اپنایا گیا اور مذہب و اخلاق کے بارے میں تضحیک و تذلیل کا انداز اختیار کرنا ترقی پسندی کی علامت بن گیا اور حقیقت نگاری کے نام پر جنسیت و لذتیت کا بازار گرم ہوا تو اس ادبی تحریک سے بیزاری کی ایک عام لہر پیدا ہوئی اور ردعمل میں کچھ لوگ دوسری انتہا تک جا پہنچے، جیسا کہ ہر ردعمل کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک ترقی یافتہ شکل جدیدیت کی تحریک کی صورت میں سامنے آئی۔ ان لوگوں کا غصہ و غضب، نظام و نظریہ اور فکر و عقیدہ، اصولوں اور روایتوں پر اترنے لگا۔ اس طرح ترقی پسندوں کی "نشریاتی مقصد" کے ردعمل میں "جدیدیت" کی لاطائل اور غیر مربوط آوازوں کو شعر و ادب کا نام دیا جانے لگا۔ مقصد سے وابستگی کے برخلاف عقیدہ و افکار کا انکار اور ناوابستگی کا نعرہ رجحان اور تحریک کی صورت اختیار کرنے لگا۔ ناوابستگی کے علم برداروں میں ہمارے یہاں مشرقی تہذیب کے پروردہ مگر مغرب کے زخم خوردہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی ہیں اور اب پاکستان میں جناب نسیم سنتر کھی سامنے آئے ہیں۔ ان حضرات کے خیال میں ادب کا ادیب کے کردار یا اس کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں۔ ادب اور نظریہ کو آگ اور پانی کی طرح ایک دوسرے کی ضد بتایا گیا اور ادیب کو یہ مشورہ دیا جانے لگا کہ وہ فلسفوں اور نظریوں کے صنم کدوں سے سر جھکائے اور تصور و خیال کے کسی بھی حسین جلوہ پر آنکھ اٹھائے بغیر گذر جائے۔ مگر لطف تو یہ ہے کہ اس طرح کے خیالات رکھنے والے نظریات کے منکر حضرات نے خود فلسفہ طرازیاں شروع کردیں اور وجودیت یا اساطیریت اور لاشعوریت کی پُر اسرار وادیوں کی سیر کرانے لگے اور معاشرہ و تہذیب ہی نہیں خود اپنی ذات اور اپنے وجود سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے۔

ادب کی موجودہ اندھیاری میں جبکہ ہمارا ادب یاسیت، قنوطیت، فراریت اور ابہام و انتشار کا شکار ہے، حالیہ چند برسوں میں مسلسل غور کرنے والے کے لئے ادیبوں اور فنکاروں کا ایک نیا طبقہ بتدریج اعتدالی و توازن کی طرف مائل ہوا ہے، جیسے جناب

نسیم سترکھی نے پاکستانی معاشرہ کے پس منظر میں مذہبی ادب کا نام دیا ہے اور اپنے طنز و تعریض کا نشانہ بنایا ہے۔ مذہبی ادب کہہ کر انہوں نے قارئین کو ایک مغالطہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اگر موصوف "مذہبی ادب کے بجائے براہ راست اسلامی ادب" کا نام لیتے تو بات کچھ زیادہ واضح ہو جاتی۔ اسلامی ادب کا مسئلہ صرف پاکستان میں محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے بعد اہل قلم کانفرنس کے ادباء و شعراء کا نہیں، بلکہ برصغیر ہند و پاک کے علاوہ مصر و شام، عرب و ایران اور یورپ و امریکہ کے ہر ملک اور ان کی ہر زبان میں موجود اور موجزن ہے۔ دراصل اس صدی میں باطل نظریات کی ناکامی اور شکست و ریخت کے بعد اسلامی نظریہ و افکار کی عوامی مقبولیت اور عالمی بیداری کا وہ عمل ہے جس کے نتیجہ میں اسلامی انقلاب کا غلغلہ ساری دنیا میں بلند ہو چکا ہے اور اس صدی کو اسلامی صدی بنانے کی بات ایک بڑے حلقے سے شروع ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ عالم اسلام کی اس نئی فکری لہر نے معاشرے اور تہذیب کے ساتھ ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔

ادب کے سلسلہ میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ دنیا کی تمام قدیم مذہبی اور الہامی کتابیں ادب کی بھی شاہکار رہی ہے، خواہ وہ رامائن ہو یا توریت و انجیل یا قرآن۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کچھ عقلمند لوگ ان کتابوں کو مذہبی ادب کہہ کر گویا اپنے گمان میں ادب کے دائرہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ اس غلط ذہنیت کا شاخسانہ اردو ادب میں ادبی نثر اور مذہبی نثر کی تفریق ہے۔ سوال یہ ہے کہ سرسید، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا بادی اور ابوالاعلیٰ مودودی کی نثر اگر ادبی کے بجائے فقط مذہبی ہے تو پھر ادبی نثر کیا ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل دین علماء و دانشور اور ان کی علمی و دینی کتابوں سے بہتر نثر اردو زبان میں لکھی ہی نہیں گئی۔

اردو شاعری پر بحث کرتے ہوئے جناب نسیم سترکھی نے اقبال کا ذکر بڑی تفصیل اور طنطنے سے کیا ہے۔ اردو شاعری میں اقبال کی نظم ایک منفرد صلاحیت کا عظیم الشان اجتہاد ہوتے ہوئے بھی کم از کم دو صدیوں کی شعری روایات کا نقطۂ عروج ہے اور ولی دکنی سے میر، درد، سودا ہوتے ہوئے غالب تک کے تجربوں کی تکمیل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کی شاعری میں جہاں جذبہ حب الوطنی، مناظر فطرت کی منظر کشی، عشق مجازی اور جلوۂ حسن کا اظہار اور مزدوروں، مفلسوں اور کمزوروں کے مسائل کا تذکرہ ملتا ہے وہیں اسی کے ساتھ اقبال نے خودی، لا الہ الا اللہ، نگاہ مسلمان مومن اور قرآن کا پیغام اپنی شاعری میں پوری شدت سے پیش کیا ہے تو یہ کوئی تضاد نہیں، دراصل اقبال کے یہاں ایک فکری ارتقاء ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری فکر و فن کے مختلف ادوار سے گزری ہے جو ایک فطری امر ہے۔ لہٰذا اقبال کے آخری (CHAPTER) کی پیروی کرنے کی تلقین" پر فاضل مقالہ نگار کا اعتراض بالکل بیجا ہے۔

دور اقبال کا ذکر کرتے ہوئے جناب نسیم ستر کھی نے ایک بڑی پُر فریب بات کہی ہے۔

"جس معاشرے میں اقبال نے پرورش پائی اُس معاشرے میں کئی قومیں، کئی مذاہب تھے اور مختلف زبانیں اور بولیاں تھیں، ادیب اس قدر آزاد تھا کہ جس فلسفہ کو چاہے اپنائے اس عہد کے حاکم وقت کی زبان انگریزی تھی، مذہب عیسائیت تھا، ان کی آسمانی کتاب بائبل تھی، اس کے باوجود حاکم وقت نے مذہب کو مذہب ہی رکھا اس کو ادب پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، اگر وہ پابند کر دیتے تو آج اقبال کا تمام کلام بائبل کا ترجمہ یا عیسائیت کی تبلیغ کے سوا کچھ نہ ہوتا"

یہاں موصوف کو اس حقیقت سے گریز نہیں کرنا چاہیے کہ عہد اقبال غلامی کا دور تھا، ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک انگریزوں کے زیر اقتدار تھے ہندوستان بھی اسی انگریزی نو آبادیات (COLONIES) میں سے ایک تھا، جہاں اقبال سانس لے رہے تھے، یہاں انگریزوں کو صرف سیاسی بالادستی حاصل تھی کوئی نظریاتی مشن اور مقصد ان کے پیش نظر نہ تھا۔ پوری ہندوستانی قوم مختلف مذاہب، زبان اور رنگ و نسل سے مرکب تھی اور ان سب کا مقصد انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ اقبال نے اس دور میں جہاں سیاسی آزادی کی بات کی، وہیں ذہنی و فکری آزادی کی روح کو بیدار کیا اور مغرب کی فکری غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی بات کی اور مغربی تہذیب جس کا آشیانہ شاخ نازک پر تھا اس کی ناپائیداری وہ دیکھ رہے تھے، اس کے بالمقابل اسلامی نظام و اقدار کی انہوں نے بات کی یہ کوئی انگریزوں کا فراخدلانہ سیکولر رویہ نہ تھا بلکہ ان کی مجبوری تھی۔ ایک ایسے ملک میں جس کی عظیم اکثریت غیر عیسائی ہو وہ عیسائیت اور بائبل کی بات نہ کر سکتے تھے جبکہ خود یورپ نے مذہب کو گرجوں میں مقید کر رکھا تھا اور زندگی سے مذہب و اخلاق کو نکال دیا تھا۔ چنانچہ انگریزی اقتدار کو مانتے ہوئے ہندوستانیوں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے اور فروغ کی باتیں کرنے کی آزادی تھی جب کہ کمیونسٹ معاشرے یا اسلامی معاشرے میں صورت حال دوسری ہوتی ہے، یہ ایک نظریاتی اسٹیٹ ہوتا ہے، جو کوئی ایسی بات برداشت نہیں کر سکتا جس سے اس نظریے پر آنچ آتی ہو۔ ہاں کمیونسٹ یا اسلامی اسٹیٹ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں زبان بندی نہیں ہوتی، دوسروں کو اپنی بات کہنے کا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نسیم ستر کھی جیسے لوگ آج بھی پاکستان جیسی نیم جمہوری، نیم اسلامی ریاست میں بھی اس طرح کی باتیں کرنے کی پوری آزادی رکھتے ہیں، وہ کسی کمیونسٹ اسٹیٹ میں رہ کر، ماؤ اور مارکس کے نظریات پر کوئی تنقید نہیں کر سکتے۔

اقبال کے سلسلے میں فاضل مقالہ نگار نے ایک بڑی عجیب بات یہ بھی کہی ہے کہ سچائی تو یہ ہے کہ انھیں عشق عطیہ تھا جس کو عشق رسول بنا دیا گیا" اقبال کو عشق عطیہ تھا یا نہیں ایک الگ تاریخی و تحقیقی مسئلہ ہے۔ بیگم عطیہ کے سلسلہ میں یہ بات مشہور عالم دین، ادیب اور مصنف شبلی نعمانی

سے بھی منسوب ہے۔ بہرکیف عشقِ عطیہ کوئی ایسی بات نہیں، اسلامی معاشرے میں فرد سے محبت کا ایک اعلیٰ تصور موجود ہے، ہاں اس کے کچھ حدود ہیں۔ ہر بوالہوس کو حسن پرستی کی کھلے عام اجازت نہیں ہے۔ اقبال کے یہاں بوالہوسی اور فاسقانہ عشق کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ ان کے عشقِ رسول کو عشقِ عطیہ سے ہم آہنگ کرنا، نہ صرف ایک بیجا جسارت ہے بلکہ مجرمانہ حرکت بھی ہے۔

اقبال کے عشقِ رسول کی شہادت وہ لوگ دیتے ہیں جن کی نگاہوں نے مجلسوں میں رسول کرمؐ کے تذکرے پر ان کی آنکھوں کو اشکبار رہتے دیکھا ہے، پھر اقبال کی ایک مکمل کتاب "ارمغانِ حجاز" ان کے عشقِ رسولؐ کا آئینہ ہے۔ اب اقبال کے عشقِ رسول کو عشقِ عطیہ کہنا اقبال کے ساتھ ظلم نہیں تو اور کیا ہے، یہ صرف ظلم نہیں بلکہ ایک ایسا جرم ہے جس کی معافی پاکستان جیسے جمہوری اسلامی معاشرے میں تو ممکن ہے مگر کسی کمیونسٹ اسٹیٹ میں نہیں۔

ادیب اور فنکار معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد ہوتا ہے۔ ہر ادیب و شاعر کی حیثیت اس کے ادیب و شاعر ہونے سے پہلے ایک ذمہ دار انسان کی ہے، میرے نزدیک انسان ایک اکائی ہے اور معاشرہ اس کا میدانِ عمل ہے، فرد معاشرہ ایک دوسرے پر بہت دور رس اثرات مرتب کرتے ہیں۔ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرکے یا انسان کی سالمیت کو مجروح کرکے صحت مند مطالعہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جب بھی حیاتِ انسانی کے کسی شعبہ کی طرف توجہ کی جائے تو دوسرے شعبوں کے ساتھ کامل ہم آہنگی کا لحاظ رکھا جائے۔ ادب چونکہ جذبہ و فکر کا حسین امتزاج ہے اس لئے اس کا تعلق بھی حیاتِ انسانی کے ایک اہم شعبے سے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی بالضرور کا تقاضہ کرتا ہے، اسے بھی سلیقہ مندی اور ذوقِ ترتیب کی ضرورت ہے۔ اسلامی ادب کے پیشِ نظر ادب کا یہی (APPROACH) ہے، وہ ادب کو ذاتی مسئلہ بنانے کا قائل نہیں ہے اور نہ فرد کو اپنی سالمیت سے محروم کرانے کی جارحیت کرتا ہے۔ وہ زندگی کو زیادہ کامل اور کامیاب شکل دینے کا متمنی ہے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلا تقاضہ یہی کرتا ہے کہ فنی تخلیق تو کیجئے لیکن یہ نہ بھولئے کہ آپ اپنے اس عمل سے زندگی کی صورت گری کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں۔ ادب اگر حسنِ ادا اور جذبہ و تاثیر سے عبارت ہے تو اس سوال کا پیدا ہونا بھی بات ہے کہ آخر یہ اہتمام کس لئے؟ حسنِ ادا اور جذبہ و تاثیر کے لئے کوئی محور اور مرکز بھی تو ہونا چاہئے۔ اس مرحلے میں پہنچ کر جنون میں کیا کیا کچھ بکنے کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور اپنی بات دوسروں کو سمجھانے کی ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں کروچے کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ جب تک آپ کا فنی پارہ آپ تک محدود رہتا ہے آپ کو پوری آزادی ہے کہ اسے جو چاہیں بنائیں لیکن جس وقت آپ اسے منظرِ عام

پرلانے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو آپ پر معاشرے کی ذمہ داریاں بھی عائد ہو جاتی ہیں۔ اب آپ کے لئے ناگزیر ہے کہ حسن ادا اور جذبہ و تاثیر کے ساتھ وحدت خیال کا بھی اہتمام کریں۔ ادب کو ادبیت سے محروم کرنے کا تقاضہ کون کر رہا ہے۔ ہمارا دعا تو یہ ہے کہ ادب کی صوت و آہنگ میں کچھ معنی بھی پنہاں ہونے چاہیں، ورنہ نقط آواز اور نقط رنگ میں کتنی ہی جاذبیت ہو، حیات انسانی کے لئے کوئی بڑا (CONTRIBUTION) ثابت نہیں ہوں گے۔ مختصر یہ کہ مروجہ (جدیدیت زدہ) تنقیدی نقطۂ نظر کے برخلاف تبلیغی یا مقصدی ادب ہی درحقیقت اعلیٰ ترین ادب ہوتا ہے، جبکہ بے مقصد اور تفریحی ادب فقط ایک بے جان کھلونا ہوتا ہے بالکل ٹھنڈا اور کھوکھلا زندگی کی حرارت اور فکری تخلیقی جذبے سے خالی۔

غزل

مسعود جاوید ہاشمی

میں جہاں تنہا وفا کی راہ میں سرگرم تھا
ہر قدم پہ مونس و غمخوار میرا عزم تھا

تجزیے بھی یکرخے ہیں نظریے بھی یکرخے
اپنے فن کا تھا ہر اک ماہر مگر یک چشم تھا

لوگ کہتے ہیں کہ میں ہی تھا مگر میں ہی نہ تھا
لمحہ لمحہ ذکر ان کا بھی شریک بزم تھا

مضطرب ہو کر تڑپنا میں نے اور دل کا سکوں
ورنہ میری آنکھ میں دل میں جگر میں زخم تھا

کتنے فرزانے نکل آئے حدوں کو پھاند کر
میں ہی دیوانہ تھا جو پابند راہ و رسم تھا

اس کے دل میں ایک دریا محبت تھا رواں
بات میٹھی تھی زباں پر اور لہجہ نرم تھا

دوست تھا دشمن سب ہوئے جاوید اس کے معترف
اس کی باتوں میں دلیلیں تھیں بلا کا نظم تھا

عظیم سوال

نعیم صدیقی
مدیر "سیارہ" لاہور

میرے اندر سے آواز آتی ہے اور یہ میرا شعور ہے کہ میں ہوں!

میرے قریب بیٹھا ہوا فلسفی مجھے ٹوکتا ہے ۔۔ "کیا یہ واقعی کوئی سچائی ہے کہ تم ہو؟ کیا واقعی تم تمام شعور پر ہو؟ ممکن ہے کہ یہ سب مغالطہ ہو ۔ نہ تمہارا کوئی وجود ہو اور نہ تمہارے اندر سے کوئی آواز آتی ہو!"

"اتنا بڑا شک؟ ۔۔ جب مجھے میرا ہونا پورے شعور کے ساتھ محسوس ہو رہا ہے تو پھر میں اس حقیقت کو جھٹلاؤں کیوں؟"

"اس لئے کہ شک ہی سے سوالوں کی وہ راہیں پیدا ہوتی ہیں جو حقیقت تک لے جاتی ہیں"

"مگر کس حقیقت تک؟ شک تو ہر حقیقت پر کیا جا سکتا ہے، اور کیا جاتا ہے ۔ شک کی اس راہ سے کوئی بھی ایسی صداقت نہیں مل سکتی جس پر آدمی کا شعور، ایمان یا ارادہ استوار ہو سکے یا اس کی عقل ہی ٹیک لگا سکے ۔ ہر شک کے بعد ایک نیا شک ۔ چھوٹے شک کے بعد بڑا شک! ۔۔ حتیٰ کہ تفکر کے سمندر میں شکوک کا ایسا بھنور بن جاتا ہے کہ جس سے نکلنا کسی بھی صورت ممکن نہیں ہوتا ۔۔ میرے سامنے سفر کا دوسرا طریقہ بھی ہے ۔ یہ کہ چھوٹی سے چھوٹی حقیقت جو سامنے آئے میں اسے اپنے فتراکِ علم میں محفوظ کروں اور اس کے تسلیم کرنے کے بعد قدم آگے بڑھاؤں ۔ مجھے پہلی بڑی سچائی مل گئی ہے کہ "میں ہوں" اب میں اس سے آگے بڑھنا چاہتا ہوں"

"آگے بڑھنے کیلئے تو کوئی راستہ نہیں، ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے، آگے پیچھے، دائیں بائیں، آہنی فصلیں کھڑی ہیں اپنے ہونے سے آگے کچھ جانا نہیں جا سکتا ۔ بس تم یہ کرو کہ اتنی ہی حقیقت کو پلّے باندھ لو کہ تم ۔ بس اسی ہونے، اور ہونے کو قائم رکھنے کے لئے جتنے ممکنات ہوں، کوشش کرو، نہ ہوں تو اپنے آپ کو ختم ہو جانے کیلئے تیار رکھو"

"یعنی اور چیزوں میں تو ہمیں شک کرنا چاہیے مگر تمہارے اس خیال میں شک نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی راستہ نہیں تاریکیاں ہیں، اور فصیلیں ہیں اور بے بسی ہے"

"تو پھر تم کیا سوچنا چاہتے ہو؟"

"میرے اندر سے ایک سوال ابھر رہا ہے کہ اگر میں ہوں تو کیوں ہوں؟"

"بڑا لایعنی سوال ہے، اسے تم دماغ سے جھٹک کیوں نہیں دیتے؟"

"اس لئے کہ سوال خود ایک بڑی حقیقت اور سچائی ہوتا ہے، میں کیسے اس سچائی کو مسترد کر دوں؟"

"اس کا کوئی جواب تم عقل سے پا ہی نہیں سکتے ۔ لہٰذا فضول ہے"

"جو سوال فطری طور پر میرے اندر سے ابھرا ہے اس کا وجود خود اس بات کی شہادت ہے کہ کوئی نہ کوئی جواب

کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اور یہ سوال مجھ سے تقاضا کرتا ہے کہ مجھے اس جواب تک پہنچنا چاہیے۔"

"میں نے کہا تاں کہ یہ عقل سے ممکن نہیں، لہٰذا سوال ہی غیر عقلی ہے۔ پھر جواب کیسے ملے گا۔"

"میں کہتا ہوں کہ دراصل سوال میں خود ہوں، ہمہ تن سوال ہوں، کیا عقل اسے تسلیم کرنے سے انکار کر سکتی ہے کہ میں ہوں، اور میں ایک بڑا اہم سوال ہوں ـــــ اور اگر میں سوال ہوں تو میرا جواب ہونا چاہیے، مجھے ملنا چاہیے اگر عقل جواب تک مجھے پہنچا نہیں سکتی تو میں کسی فوق العقل ذریعہ کو تلاش کرونگا، بلکہ ایسا ذریعہ خود مجھ تک رسائی حاصل کرے گا۔ اور پھر جو کچھ بھی تجربہ پیش آئے گا، اور جو کچھ بھی اس کا حاصل ہوگا وہ بے حد عقلی ہوگا۔ اور عقل اسے تسلیم کرے گی جو عقل جواب فراہم نہیں کر سکتی مگر جب جواب فراہم ہو جائے گا تو عقل اس کی تصدیق کرے گی۔"

"عجیب بات ہے کہ تم اپنی اہمیت کو ضائع کر کے کسی دوسرے وجود کا محض گمان اپنے اوپر مسلط کر رہے ہو!"

"وہ نہیں یہ بات نہیں، میرا ذہن، میرا قلب، میری ساخت، میری حرکت ـــــ میرا اختیار اور میری مجبوری ـــــ یہ سب کچھ چیخ چیخ کر "اس" کا پتہ دے رہے ہیں۔ یہ سب کچھ محض گمان نہیں بلکہ میری عقل عاجزی سے یہ سب کچھ تسلیم کرتی ہے۔ میں اگر اس کو تلاش نہ کر سکوں اور پہچان نہ سکوں اور اس سے رابطہ استوار نہ کر سکوں تو میرا حقیر سا وجود خلاء میں لٹکا رہ جاتا ہے۔ اپنے آپ کو اپنی نگاہ میں بے معنی اور نامطلوب بننے سے بچانے کیلئے میں اس کا تعارف چاہتا ہوں نا!"

"مگر فلسفیانہ خیال آرائیوں کو چھوڑ کر خالص عملی، تمدنی زندگی کے لحاظ سے اس کد و کاوش کا فائدہ؟"

"بھئی گستاخی معاف: فلسفے کے حجابوں میں تو تم الجھے ہوتے ہو، میں نے فلسفے کو تھوڑا بہت چاٹا ضرور ہے۔ مگر اسے قلب و ذہن پر حکمران نہیں بننے دیا۔ باقی رہا زیر گفتگو کد و کاش کا فائدہ، سو تمام علوم، تمام فنون، تمام سائنسی ایجادیں تمام کی تمام ٹیکنالوجی۔ سارا کچھ بعض سوالوں سے شروع ہونے والا سفر ہے، ان کے جوابوں تک، اور پھر ہر جواب نیا سوال سامنے لاتا ہے اور پھر آگے کا اقدام شروع ہو جاتا ہے۔"

"تو سارا چکر سوال جواب کا ہے۔"

"جی ہاں، ادب کی تمام دلفریبیاں اور شعر کی ساری عطر بیزیاں، انسان کے خیال و احساس کے اسفار ہیں۔ کچھ سوالوں سے کچھ جوابوں تک!"

"عجیب فلسفہ ہے!"

"جی ہاں ـــــ اور میرا تو یہ حال ہے کہ اپنی تمناؤں اور خوابوں اور ذوق شائستگی اور تلاش حسن کے زیر اثر روزمرہ زندگی میں اٹھنے والے بے شمار سوالوں کے علاوہ پورا زور میں اس بڑے سوال پر بھی صرف کرتا ہوں جو میں خود ہوں! یہی عظیم سوال میرے ادب کی روح ہے اور اسے ایک امتیازی رنگ دیتا ہے۔"

مولانا مودودیؒ کا طرزِ نگارش

پروفیسر اسرار احمد سہاوری ۔ گوجرانوالہ

پس منظر مولانا مودودی مرحوم کے طرزِ نگارش پر کچھ لکھنے کے سلسلے میں سب سے پہلے اس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس طرزِ نگارش کا پس منظر معلوم کرلیا جائے تاکہ اسے سمجھنے میں آسانی رہے ۔ اس سلسلے میں پس منظر کو دو شقوں میں تقسیم کرنا پڑے گا ۔ ایک تو ان کا تربیتی اور سماجی زندگی کا پس منظر' جسے آپ ذاتی کہہ سکتے ہیں ۔ دوسرا ان کا تاریخی' علاقائی' سیاسی اور دینی پس منظر جسے آپ بیرونی پس منظر کا نام دے سکتے ہیں ۔

پہلی شق کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مولانا ئے مرحوم ایک تعلیم یافتہ دینی گھرانے میں پیدا ہوئے اسلئے انہیں علمی اور دینی تہذیب و تربیت کی بڑی سہولتیں حاصل رہیں ۔ زبان و بیان پر گھر کے ماحول نے اثر ڈالا اور لڑکپن میں ہی اسی ضمن میں ان کو پوری قدرت حاصل ہو گئی ۔ تھوڑی کد و کاوش سے انہوں نے اس صلاحیت کو اعلیٰ سے اعلیٰ مطالب کے ادا کرنے کیلئے جِلا دی ۔ اور انہیں جلد ہی اظہار و ابلاغ پر مکمل اعتماد حاصل ہو گیا ۔ اس کلی اعتماد کا انہوں نے اپنے بعض خطوط میں اظہار بھی کیا ہے جس کا انشاء اللہ اس مضمون میں خطوط نگاری کے سلسلے میں ذکر آئے گا ۔

دوسری شق ان کے بیرونی ماحول سے متعلق ہے' اس کے متعلق عرض ہے کہ مولانا ئے مرحوم نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس نے انہیں بے حد متاثر کیا ۔ اس دور میں مغرب کے جدید اور ملحدانہ تصورات نے' زندگی کی مادی تعبیروں نے اخلاقی اضافیت اور نظریۂ افادیت نے اور جمہور اور عوام کے خدائی دعوے نے پوری دنیا کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا ۔ الحاد' مذہب بیزاری' اخلاقی اباحیت اور اشتراکیت کے تصورات نے انسانی ذہن کو مفلوج کر دیا تھا ۔ بلکہ ان چیزوں کے علم ہی کو "روحِ عصر" تصور کرلیا گیا تھا اور اس تحریک کی پشت پناہی زبردست عالمگیر لٹریچر اور ایک طاقتور عالمی حکومت بھی کر رہی تھی ہندوستان کے مسلمان بھی اس زبردست عالمگیر ذہنی انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان کے عقائد و تصورات بھی تشکیک کا شکار ہونے لگے ۔ مغربی حکومت کے زور پر مذہب کو ذاتی معاملے کی حیثیت دی جانے لگی اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم عوام کا ایک بہت بڑا طبقہ زندگی میں دو رنگی اختیار کرنے لگا ۔ یعنی مذہبی رسومات بھی ادا کرلیں اور دنیاوی معاملات میں مغرب کی پیروی کرتے ہوئے مادی اصولِ زندگی کو اپنا لیا اور معاشرتی' معیشتی' ثقافتی اور سیاسی زندگی سے دین کو برطرف کر دیا ۔ رہی سہی کسر بعض نام نہاد پیرانِ طریقت اور علمائے سوء نے پوری کر دکھائی اپنے تنزل و تعطل کرکے ہر معاشرتی اور اخلاقی جرم کو اباحت کی سند عطا کر دی اور اس طرح لوگوں کے ذہنوں کو ضمیر کی خلش سے بھی بے نیاز کر دیا ۔

طریق کار

مندرجہ بالا پس منظر میں مولانا کو اپنے طریق کار کا تعین کرنا پڑا۔ انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ ایسے ماحول میں سب سے پہلے تو اس بات کی ضرورت ہے کہ اصلاحی کام اجتماعی طور پر ایک باقاعدہ تحریک کے ذریعے کیا جائے دوسرے یہ کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کیا جائے جیسا کہ وہ فی الواقع ہے تاکہ اسلام کے ہر پہلو کو الحاد کے ہر پہلو سے پوری طاقت سے ٹکرایا جا سکے۔ چنانچہ اصلاحی کام کے لئے انہوں نے ایسے ناسازگار ماحول میں "جماعت اسلامی" کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی اور اسلام کو مکمل دستور سیات بنانے کی بنیاد پر اس تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور حقیقت تو یہ ہے کہ موصوف کی اسلامی نشاۃ ثانیہ کیلئے مساعی پوری طرح مشکور ہوئیں "دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات" میں لکھا ہے کہ

مقصدی ادب

"ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھکر اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت و صلاحیت میں بھی عام دنیا داروں سے زیادہ بہتر ہو۔"

اس قول سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک مقصد کو سامنے رکھکر لکھا ہے۔ گویا تنقیدی اصطلاح میں وہ شروع ہی سے ادب برائے ادب کے قائل نہیں تھے بلکہ مقصدی ادب کے قائل تھے۔ وہ ادب کو اپنے حصول مقصد کا ایک ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ ادب برائے زندگی و افادیت کے قائل تھے اور ان کے اس اصول نے ان کے طرز نگارش پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ مثلاً وہ بلا تکلف اور براہ راست قاری کے دل و دماغ میں اتر جانا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے انہیں سلیس، آسان اور مدلل طرز اظہار کو اپنانا پڑا۔ مقصدی نثر نگاری کی ابتدار دراصل سرسید نے کر دی تھی۔ حالی شبلی اور نذیر احمد وغیرہ نے اس کو ترقی دی۔ لیکن مولانا نے اس طرز کو فصاحت اور بلاغت کی انتہا تک پہنچا دیا۔ مولانا کے ہم عصر اردو نثر نگاروں میں مولانا آزاد، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، مہدی الافادی وغیرہ کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ یہ حضرات بھی بلاشبہ مقصدی ادب کے قائل تھے۔ سیاسی اور مذہبی ادب میں انہوں نے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ علامہ مشرقی کو بھی اسی زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ان بزرگوں میں سے کسی کا طرز ابلاغ، تصنع، مبالغہ آرائی، فارسی تراکیب کی بھرمار، اشعار کی پر تکلف نگینہ کاری سے پاک نہ تھا ~~نہیں~~ دوسرے یہ کہ اس طرز ابلاغ سے ایک عام ذہنی سطح کے آدمی کو مخاطب نہیں کیا جا سکتا اس لئے انہوں نے اس طریقۂ اظہار سے صرف نظر کر لیا اور اپنے مقصد کی مناسبت سے اپنے لئے ایک نئی راہ متعین کی اور اس میں سلاست، سادگی، براہ راست تخاطب اور جذبات کے بجائے شعور و فہم کو اپیل کرنے کا طریقہ اختیار کیا اور اس میں کامیاب رہے۔

یکسانی اور ہمواری

مولانا کی زبان کو سنجیدہ تحریر اور سلیس طرز بیان کی وجہ سے اگر مقالاتی زبان کہیں تو زیادہ

زیادہ موزوں ہوگا انہوں نے نہ اشعار کی بھرمار کی اور نہ طنز و مزاح کی نشتر زنی کی۔ نہ مناظرے کا رنگ پیدا ہونے دیا۔ بلکہ ہر جگہ سلامت، روانی اور بے تکلفی کا رنگ غالب رکھا ہے اور اس سادگیٔ ادا کی وجہ سے مولانا کی ہر دور کی تحریروں میں ایک حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے۔ کسی جگہ بھی ارتقائی کیفیت نظر نہیں آتی اور یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کیونکہ کسی دور کے بھی نثر نگار کی تصنیفات کو اٹھا کر آپ دیکھ لیں۔ آپ کو اس میں ارتقائی منازل اور ادوار واضح طور پر نظر آجائیں گے۔ شروع کی تحریر جوشِ بیان، مبالغہ آرائی، زورِ عبارت، حدّتِ جذبات اور تیز روانی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ طبیعت میں ٹھہراؤ، وقار، اور استقامت پیدا ہوتی ہے تو تحریر بھی اس سے متاثر ہوتی جاتی ہے۔ تحریر میں وقار، رفتار میں اعتدال، جذبات میں سکون اور مبالغہ آرائی سے گریز سے عبارت میں سلاست پیدا ہو جاتی ہے۔ جذبات سے اپیل کے بجائے استدلال کی طرف طبیعت مائل ہو جاتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں اس اصول کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔ "الہلال" "البلاغ" اور "غبارِ خاطر" کی عبارتوں میں آپ کو یہ فرق بین طور پر نظر آجائے گا لیکن مولانا مودودی کی تحریروں کی یکسانیت کا یہ عالم ہے کہ پردہ اور الجہاد سے لے کر سیرتِ نبوی تک آپ کو کوئی واضح تبدیلی طرز اور اسلوب ابلاغ میں نظر نہیں آئے گی۔

تنوع

مولانا مودودی کی انشا پردازی میں ایک حیرت انگیز چیز تنوّع بھی ہے۔ موضوعات کا تنوع اور اس کے ساتھ عبارت میں حسبِ ضرورت تبدیلی۔ اس سے ان کی زبان و بیان پر زبردست قدرت اور استیلا کا اظہار ہوتا ہے۔ علمائے عروض نے بلاغت کی تعریف بھی یہی کی ہے کہ کلام اقتضائے حال کے مطابق ہو۔ مولانا کی کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کس قدر مختلف النوع موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ دینی، سیاسی، ثقافتی، تاریخی، معیشتی، معاشرتی غرضیکہ زندگی کا شاید ہی کوئی اہم پہلو ایسا ہو جس پر مولانا نے مرحوم نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ اعتراضات کا جواب دیتے وقت استدلال کا یہ عالم ہوتا ہے کہ عبارت ایک ماہر متکلم کا نتیجۂ فکر معلوم ہوتی ہے۔ ہر بحث منطقی نتائج پر منتج ہوتی ہے اور ایک ایک دلیل قاری کے ذہن میں بلا تکلف اترتی چلی جاتی ہے۔ انہوں نے ملتِ مسلمہ کو خوابِ گراں سے جگانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کی تفہیم و تشریح سے کام بھی لیا ہے۔ اسلام کے مخالفین کو دلائل سے زچ کر دیا ہے۔ کہیں فلسفۂ تعلیم پر بحث کی ہے تو کہیں فلسفۂ جہاد بیان کیا ہے۔ پردے پر نوعمری میں جو کتاب لکھ دی وہ آج تک زورِ بیان، استقامت دلائل اور مغربی لٹریچر کے مستند حوالوں اور دلائل کی وجہ سے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ لوگ حیران تھے کہ مولانا کو مغرب کے معاشرتی لٹریچر پر اس قدر دسترس کس طرح حاصل ہو گئی۔

صحتِ زبان و بیان

مولانا زبان کی صحت کے بارے میں بھی بڑے محتاط تھے۔ ان کے بہت سے خطوط اس بات کا ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ انہیں اردو زبان اور اس کے الفاظ کے صحیح استعمال پر کتنا عبور حاصل تھا اور وہ اس بارے میں کس قدر اہتمام کرتے تھے۔ اسی لئے انہیں اپنی زبان دانی پر بھی پورا اعتماد تھا اور اپنی تحریر کو

اردو زبان وبیان کیلئے سند خیال کرتے تھے ۔ یہی نہیں بلکہ انہیں فارسی، عربی اور انگریزی زبان کے الفاظ پر بھی پورا عبور تھا اور ان کے صحیح استعمال پر بھی پوری توجہ دیتے تھے ۔ فارسی کے بارے میں ڈاکٹر آغا یمین کا بیان قابل اعتماد ہے کہ انہوں نے مولانا کے سامنے اپنے زعم باطل یا مولانا کو آزمانے کیلئے فارسی بولنا شروع کردی تو وہ حیران رہ گئے جب مولانا نے بھی عمدہ فارسی میں انہیں جواب دینا شروع کردیا حالانکہ مولانا کو فارسی میں گفتگو کرنے کا شاید ہی کبھی موقع ملا تو پھر اسکے علاوہ خواجہ اقبال احمد ندوی صاحب کا مولانا کا انگریزی الفاظ پر عبور حاصل کرنے کے بارے میں یہ بیان بھی توجہ کا مستحق ہے کہ

" میں نے انگریزی زبان کے بعض اسکالرز کو انگریزی زبان کے بعض الفاظ پر گفتگو کرتے سنا ہے گفتگو کے دوران میں مولانا نے ہر لفظ کے اصل مفہوم، بعد کی صدیوں میں مفہوم کی تبدیلی اور ہر لفظ کی پشت پر جو تاریخ تھی اس پر روشنی ڈالنا شروع کی تو یہ اسکالرز بیٹھے حیرت سے مولانا کا منہ تکتے رہ گئے "

مولانا کی زبان وبیان کی توانائی، اقتضائے حال کے مطابق ابلاغ اپنے انفرادی طرز کے مالک ہونے کے بارے میں پروفیسر فروغ احمد صاحب نے بڑا پیارا تجزیہ کیا ہے ۔ مختصر الفاظ میں سارے اہم پہلو پیش نظر کر دیئے ہیں ۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دینے کا مظاہرہ کیا ہے لکھتے ہیں کہ :

" مولانا کے اسلوب نگارش کے سلسلے میں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کم وبیش پچاس سال تک سید مودودی نے اپنی نثر میں واعظوں اور خطیبوں والا انداز اختیار نہیں کیا ان کا کام اپنی نوعیت کا منفرد تھا ۔ اس کے مناسب حال اسی نوعیت کا منفرد اسلوب بھی انہیں اختیار کرنا پڑا ۔ سید مودودی نے نثر میں نہ شاعری کی اور نہ انشاپردازی سے کام لیا ۔ انہوں نے اپنی دعوتی نثر کو صحافتی انداز سے الگ ہی رکھا ۔ ان کی نثر انشاپردازانہ تکلفات سے آزاد، واعظانہ اور خطیبانہ تیزی وطراری سے الگ، صحافتی فقرے بازی سے جدا، صاف ستھری اور سادہ لیکن پُر اثر نثر ہے ۔

پروفیسر انور مسعود نے مولانا کی انشاپردازی کے متعلق اپنے خیالات کو بڑے عمدہ انداز میں پیش کیا ۔ انہوں نے اپنے تاثرات کے تحت اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار نہایت بالغ نظری اور اختصار کیا ہے ۔ چند سطور لائق دید ہیں ۔

" سید مودودی کی نثر ایک منفرد اسلوب کی حامل ہے ۔ ان کا انداز نگارش اردو ادب میں ایک علیحدہ دبستان کی حیثیت رکھتا ہے ۔ [illegible] کے کسی اور ادیب کے انداز تحریر کو سید صاحب کے اسلوب کے مماثل نہیں ٹھہرایا جاسکتا ۔ اس لئے کہ کئی خوبیوں کا جو لطیف امتزاج ان کی نثر میں ہے وہ اس تناسب سے اور کسی کے یہاں نہیں ملتا ۔ سلاست

منطقی استدلال، ادبی چاشنی اور کہیں طنز کی نشتریت مولانا کی نثر کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ مجموعی تاثر ایسا جسے صرف تاثیر کے لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ سید صاحب نے اپنے خیالات کو جو قبائیں عطا کی ہیں وہ سادہ بھی ہیں اور پرکشش بھی۔"

تنقید نگاری

مولانا کی نگارشات میں تنقید نگاری کی بڑی اہمیت ہے ان کی ہر تصنیف میں تنقید و تبصرے کا ایک بڑا جز شامل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مولانا کا تنقید نگاروں میں اہم اور بلند مقام ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو نقد و نظر کے معاملے میں مولانا کے مقابل آسکیں۔ اس لئے میں تنقید پر ذرا جم کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ تنقید کے لغوی معنی ہیں پرکھنا۔ برے بھلے اور کھوٹے کھرے کا فرق معلوم کرنا۔ کسی تخلیق کے محاسن اور معائب کا صحیح اندازہ کرنا اور اس پر رائے قائم کرنا تنقید کہلاتا ہے تنقید کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ ناقد اپنی رائے میں جن چیزوں کو محاسن اور معائب خیال کرتا ہے۔ ان کی روشنی میں خود ایک نیا راستہ تجویز کرکے تخلیق کاروں کی رہنمائی کرے۔ اس لئے ایک تنقید نگار کا اولین فرض یہ قرار پاتا ہے کہ وہ مطالعہ اور مشاہدے سے اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ دوسرے پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ لوگوں کی تخلیقات پر محاکمہ کرسکے۔ اس کے مطالعے میں اتنی وسعت ہونی چاہیے کہ وہ تمام مبادیات اور متعلقہ علوم پر حاوی ہو۔ ان علوم کے لطائف اس کی نظر میں ہوں۔ علم تنقید کے بارے میں تمام لوازم پر اس کی نظر ہو۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ناقد کو چاہیئے کہ جس تخلیق پر تنقید کر رہا ہے۔ اس کا غور سے مطالعہ کرے۔ یہ نہیں کہ صرف سرسری ورق گردانی کرکے تنقید کرنے بیٹھ جائے۔ تیسری اہم چیز خلوص اور انصاف پسندی ہے۔ ناقد کی حیثیت ایک منصف کی ہوتی ہے اس لئے اس کو خالی الذہن ہوکر اور ذاتی تعصبات اور پسند و ناپسند سے بالاتر ہوکر تنقید کرنی چاہیئے۔ تنقید میں محاسن و معائب دونوں کا ذکر ہونا چاہیے۔ نہ توصیفِ محض ہو نہ تنقیصِ محض بلکہ دونوں کا حق ادا کرنا چاہیے۔

مندرجہ بالا اصولوں کو مدنظر رکھ کر اگر مولانا کی تنقیدی عبارتوں کا مطالعہ کریں تو حیرت ہوتی ہے کہ موصوف نے ان میں سے کسی اصول کو ترک نہیں کیا اور ہر اصول کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں اپنے اصولِ تنقید اس طرح بیان فرماتے ہیں

"تنقید کے لئے چار شرطیں ہیں۔ اول یہ کہ آدمی اس شخص کے نظریات کو اچھی طرح سمجھتا ہو جس کے کلام پر وہ تنقید کر رہا ہے۔ اس لئے صرف وہی کتاب یا مضمون اس کے مدنظر نہ ہو جس پر وہ تنقید کر رہا ہے بلکہ مجموعی طور پر اس کے کلام پر بھی اسکی نگاہ ہو۔ دوسرے یہ کہ تنقید میں ذاتی محبت یا مخاصمت کو دخل نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ تنقید معقول اور مہذب طریقے سے کی جائے۔ چوتھے یہ کہ تنقید کرنے والا بھی اور اسے پڑھنے والا بھی کسی شخص کی کسی رائے کی تغلیط کو اس شخص کی کلی تغلیط نہ بنادے۔ بڑے سے بڑے آدمی کی بھی کوئی رائے غلط ہوسکتی ہے مگر اس سے اس

اس شخص کی بُرائی میں فرق نہیں آتا"۔

ایک خط کے جواب میں اپنے تنقیدی خلوص کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"میرے لئے کسی مسئلے پر رائے قائم کرتے اور ظاہر کرتے میں یہ سوال سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ لوگوں کے جذبات اس معاملے میں کیا ہیں اور لوگ کس چیز کو پسند یا ناپسند کرتے ہیں۔ میرے سامنے اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ اس معاملے میں خدا اور رسول کی ہدایت کیا ہے اور ان کو کیا چیز پسند اور کیا ناپسند ہے"

دور حاضر کے جدلیاتی فلسفے پر چند تنقیدی جملے ملاحظہ ہوں

"موجودہ زمانہ کے بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے در پے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتی چلی جارہی ہے۔ یہ غلط نتیجہ نکال لیا کہ "جدلی عمل" Dialetical process انسانی زندگی کے ارتقاء کا فطری طریق ہے۔ وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقاء کا راستہ یہی ایک ہے کہ پہلے انتہاپسندانہ دعویٰ Thesis اسے ایک رخ پر بہالے جائے پھر اس کے جواب میں دوسرا ایسا ہی انتہاپسندانہ دعویٰ Antithesis اسے دوسری انتہا کی طرف کھینچے، اور پھر دونوں کے امتزاج Synthesis سے ارتقاء حیات کا راستہ بنے۔ حالانکہ دراصل یہ ارتقاء کی راہ نہیں بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء میں بار بار مانع ہو رہے ہیں ہر انتہاپسندانہ دعویٰ زندگی اس کے کسی پہلو کی طرف موڑتا ہے اور اسے کھینچے لئے چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ سواء السبیل سے بہت دور جا پڑتی ہے تو خود زندگی ہی کی بعض دوسری حقیقتیں، جن کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی۔ اس کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہیں اور یہ بغاوت ایک جوابی دعوے کی شکل اختیار کرکے اسے مخالف سمت میں کھینچنا شروع کر دیتی ہیں۔ جوں جوں سواء السبیل قریب آتی ہے ان متصادم دعووں کے درمیان مصالحت ہونے لگتی ہے اور ان کے امتزاج سے وہ چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ جو انسانی زندگی میں نافع ہیں لیکن جب وہاں نہ سواء السبیل کے نشانات دکھانے والی روشنی موجود ہوتی ہے اور نہ اس پر ثابت قدم رکھنے والا ایمان، تو وہ جوابی دعویٰ زندگی کے اس مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتا۔ بلکہ اپنے زور میں اسے دوسری جانب انتہا تک کھینچتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پھر زندگی کی کچھ دوسری حقیقتوں کی نفی

> شروع ہوجاتی ہے اور نتیجہ میں ایک دوسری بغاوت اٹھ کھڑی ہوتی ہے - اگر ان کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انھوں نے سواء السبیل کو دیکھ لیا ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے لئے ارتقاء کا صحیح راستہ یہی سواء السبیل ہے نہ کہ خط منحنی پر ایک انتہا سے دوسری انتہا تک دھکے کھاتے پھرنا (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۵۴،۵۳)

آپ اس مختصر سے نقل قول میں مولانا کا طرز استدلال بھی دیکھ سکتے ہیں اور عبارت آرائی کا رنگ بھی، غیر محسوس سا طنز بھی موجود ہے اور ناقد کا خلوص بھی۔ نشتر زنی میں انسانی ہمدردی اور آفاقی بہبود کا جذبہ بھی کار فرما ہے۔ باوجود اسکے زبان و بیان ایسا سلیس اور سادہ ہے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ مولانا ایک گمبھیر فلسفیانہ مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔ اسی لئے ہر بات نہایت آسانی سے ذہن کے عمیق گوشوں میں اترتی چلی جاتی ہے اور گراں باری کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

مراسلہ نگاری

خطوط نگاری ایک ایسی صنف سخن ہے جو لکھنے والے کی سیرت اور کردار پر بھرپور اور مستند روشنی ڈالتی ہے کیونکہ خط لکھنے والے کو دوران تحریر میں احساس نہیں ہوتا کہ کبھی اس کے خطوط شائع ہو کر عام لوگوں کی نظروں سے بھی گذریں گے۔ نگارش کے وقت وہ اس کو ایک راز اور امانت ہی سمجھتا ہے اسی لیے جو کچھ اس کے دل میں آتا ہے بلا کم و کاست سپرد قلم کرتا چلا جاتا ہے۔ خطوط کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ ان کی عبارت میں انتہائی بے تکلفی اور سادگی کی فضا قائم رہتی ہے۔ عبارت میں اور خیالات میں تصنع اور آورد نام کو بھی نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے خطوط عموماً کاتب کے طرز اظہار کا بھی بہترین سرمایہ ثابت ہوتے ہیں اور دل سے نکلی ہوئی ہر بات براہ راست قاری کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تیسری اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ مراسلہ نگار مختلف حیثیتوں کے لوگوں کو خطوط لکھتا ہے اس لئے اس کے طرز تخاطب اور طریقہ اظہار میں دلچسپ تنوع پیدا ہو جاتا ہے اور اسکی قدرت ابلاغ کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ خط اپنی عبارت اور نکتہ آرائی کے لحاظ سے ادب کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ اگر کسی خط میں کسی جذبے کے اظہار کا موقع آگیا ہے اور اس جذبے کو مناسب طریقے سے قاری یا مخاطب کے دل میں اتار دیا گیا ہے تو ایسا خط ادب پاروں میں شمار ہوگا اور اسی قسم کے خطوط اپنے لئے ادب میں ایک مخصوص مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

اگر ہم مندرجہ بالا خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے مولانا کے خطوط دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ان کے خطوط مندرجہ بالا تمام صفات سے متصف ہیں۔ ان کے خطوط کے تمام مجموعوں میں ایسے سینکڑوں اشارات مل جاتے ہیں جن سے مولانا کی سیرت اور ان کے کردار پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ دوسری خصوصیت عبارت میں سادگی اور بے تکلفی ہے جو عام خطوط میں بھی موجود ہے اور علمی مباحث سے تعلق رکھنے والے خطوط میں بھی موجود ہے اور علمی مباحث سے تعلق رکھنے والے خطوط میں بھی۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مولانا نے مختلف حیثیت کے لوگوں کو خطوط لکھے ہیں۔ اور ہر خط میں انہوں نے مکتوب الیہ کی حیثیت کو مد نظر رکھ کر تخاطب اختیار کیا ہے۔ مثلاً اپنے بچوں کو جو خطوط لکھے ہیں انکا

مخصوص تخاطب ہے۔ عبارت اور اظہار کا بھی خاص رنگ ہے۔ جو خطوط دوستوں اور ہم خیال کو لکھے ہیں ان کا طرز اظہار اپنا خاص رنگ لئے ہوئے ہے کسی علمی سوال کا جواب دیا ہے تو اس کا طرز نگارش بالکل جدا ہے۔ اس میں مجبوراً زبان علمی ہو گئی ہے۔ علمی اصطلاحات کا استعمال بھی کرنا پڑا ہے۔ جیل سے جو خطوط لکھے گئے ہیں ان کا طرز کسی اور قسم کا ہے۔ قدرتی طور پر ان میں جذبات نگاری کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور گداز کی کیفیت نے ان خطوط کو نہایت پر تاثیر بنا دیا ہے۔ یہاں صرف ایک خط کی چند سطور پیش کرونگا جو مولانا نے جیل سے اپنے بیٹے احمد فاروق صاحب کے نام لکھا ہے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگوں کو بالکل اسی طرح زندگی بسر کرنی چاہیے جس طرح میرے مر جانے کی صورت میں کرتے۔ یہ بھی خدا کی شان پروردگاری ہے کہ اس نے میری زندگی میں تم لوگوں کو ان حالات کے تجربے کا موقع دے دیا جو دوسروں کو اپنے سرپرست کی موت ہی کی شکل میں پیش آیا کرتے ہیں۔ اس تجربے سے تم لوگ ہراساں نہ ہو بلکہ خوب فائدہ اٹھاؤ۔ یہ انشاء اللہ تم سب کیلئے نہایت مفید ثابت ہوگا۔"

ایک اور خط کی چند سطر جو حکیم محمد شریف کو لکھا گیا۔

"حقیقت یہ ہے کہ آج کل میری صحت جس قدر اچھی ہے ایسی صحت تو مجھے برسوں سے نصیب نہ تھی۔ وزن بڑھ گیا ہے۔ خوراک بڑھ گئی ہے۔ نیند اتنی اچھی آتی ہے کہ پچھلے ۱۵ سال میں اتنی اچھی نیند کبھی نہ آئی تھی۔ دماغی اور جسمانی دونوں طرح کی محنتیں پہلے سے بہت زیادہ کر سکتا ہوں اور پہلے سے بہت کم تھکتا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بلا مبالغہ آج شاید روئے زمین پر مجھ سے زیادہ مطمئن کوئی آدمی نہیں ہے۔ بال بچوں اور متعلقین کی مجھے کوئی فکر نہیں۔ کیونکہ انہیں خدا کے حوالے کر کے آیا ہوں۔ قوم کا مجھے کوئی فکر نہیں ہے کیونکہ اس معاملہ میں خدا کی طرف سے جتنی ذمہ داری مجھ پر تھی وہ سب موجودہ حکمران گروہ نے اپنے ذمہ لے لی ہے جماعت اور دعوت اسلامی کا مجھے فکر نہیں، کیونکہ گرفتار ہوتے ہی عنداللہ بری الذمہ ہو چکا ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی سو فیصدی یقین رکھتا ہوں کہ اس کام کو میرے قید ہوتے اور رہنے سے قطعاً کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ بلکہ اس کے برعکس فائدہ ہی پہونچے گا۔ اس کے بعد آپ خود ہی سوچیں کہ مجھ سے زیادہ خوش و خرم اور مطمئن کون ہو سکتا ہے۔ پھر یہاں غور و فکر اور گہرے مطالعہ کا جو خدا داد موقع مجھے مل گیا ہے، یہ تو وہ نعمت ہے جس کے لئے میں اپنی بے حد مصروف زندگی میں مدتوں سے ترس رہا تھا۔"

دیکھیئے ان مختصر سطور میں سادگی و سلاست بھی ہے۔ جذبات نگاری بھی، عبارت کی بے تکلفی بھی ہے

اور ایمان کی پختگی اور بشریت کا اظہار بھی ۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مولانا ہمارے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور اسی کیفیت کو غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنانا کہا ہے اور یہی خطوط نگاری کا نقطۂ کمال ہے ۔

طنز و مزاح

مولانا مودودی باقاعدہ طنز نگار یا مزاح نگار عمر کے کسی حصے میں نہیں رہے ۔ لیکن ان کی بہت سی تحریروں میں طنز بھی مل جاتا ہے اور مزاح بھی ۔ یہ رنگ خطوط میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آیا ہے ۔ دوسری تحریروں میں شاذ و نادر نظر آتا ہے ۔ البتہ گفتگو میں مولانا اکثر مزاح پیدا کرتے ہیں اور یہ مزاح سوچا سمجھا ہوا نہیں ہوتا ۔ بلکہ بالکل برجستہ اور فی البدیہہ ہوتا ہے ۔ مثلاً پھانسی کی کوٹھری میں اپنے اعزہ کو مخاطب کر کے یہ کہنا اگر میری موت آگئی ہے تو کوئی نہیں روک سکتا اور اگر نہیں آئی تو یہ لوگ الٹے لٹک جائیں تب بھی مجھے نہیں لٹکا سکتے ۔ ایک تاریخی فقرہ ہو گیا ہے یا ایک نوجوان کا یہ سوال کرنا کہ مولانا پہلی نظر تو اسلام میں بھی معاف ہے اور مولانا کا برجستہ جواب دینا کہ اگر پہلی نظر واپس ہی نہ آئے تو ۔ یہ تاریخی فقرے کم از کم یہ ثابت کرتے ہیں کہ مولانا فطرتاً بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے ۔ ظرافت بلکہ سنجیدہ ظرافت کو ان کے مزاج سے خاص مناسبت تھی جو تحریروں میں بھی ظاہر ہوتی رہتی تھی اور تقریر میں بھی ۔

نعیم صدیقی صاحب نے مولانا کے مزاح کے سلسلے میں اپنے ایک مضمون میں بڑا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے کہتے ہیں

> "مولانا مودودی کا مسلک ہر معاملے میں اعتدال تھا اور بالعموم انتہا پسندی سے بچ کر ترازو کے پلڑے برابر رکھتے ۔ وہ نہ منقطع تھے نہ ہنسوڑ ، ایک طرف دعوت و تحریک سے پیدا ہونے والے مسائل اگر سنجیدہ تفکر کا تقاضا کرتے تو دوسری طرف سید مودودی سنجیدگی کے بوجھ سے ساتھیوں کو بچانے کیلئے لطافت بیان سے کام لیتے ۔ ان کا میدان تضحیک و استہزا نہ تھا ۔ نفرت و تحقیر کو ان کے دل میں جگہ نہ مل سکی ۔ کسی کی دل آزاری نہیں کی ۔ کسی کا خاکہ نہیں اڑایا ۔ وہ اصطلاحی معنوں میں مزاح نگار بھی نہ تھے کہ سوچ سوچ کر مزاحیہ مضمون تخلیق کرتے ان کے یہاں تبسم انگیز کلام میں بھی آپ کو ثقاہت و اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات نہ ملے گی ۔ وہ تحریر میں کبھی کبھی بے ساختہ انداز میں لطافت پیدا کر دیتے تھے ۔ وہ ایسی بات فی البدیہہ کہتے تھے ۔

مولانا نے سوچ سمجھ کر ایک منصوبے کے تحت مزاح پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی ۔ مولانا نے کہیں کہیں لفظوں کے الٹ پھیر سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ ان کا مستقل اسلوب نہیں تھا ۔ ان کا اسلوب رشید احمد صدیقی کی طرح جہاں معنی سے زیادہ تعلق رکھتا ہے ۔ کبھی کبھی ذو معنی الفاظ یا جملے کہہ کر بھی مزاح پیدا کر دیتے ۔ مگر وہ بھی ارتجالاً ۔ ہر جملے میں بے ساختگی اور بے تکلفی جھلکتی نظر آتی ہے ۔ مولانا کی شگفتہ مزاجی اور خندہ روئی سے ساتھیوں کے دل ہلکے ہو جاتے ۔ پریشانیاں کافور ہو جاتیں مایوسیاں اپنا منہ چھپا لیتی تھیں ۔ عزم و استقلال ابھر آتا

حوصلہ مندی مسکرا رہی تھی۔ آج بھی مولانا کی محفلیں یاد آتی ہیں تو یہ شعر لوحِ ذہن پر ابھر آتا ہے ؎

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں

زورِ استدلال | مولانا کی تحریروں کی ایک اہم ترین خصوصیت ان کا منطقی اسلوب اور زورِ استدلال ہے، دنیا بھر نے ان کی اس بے مثال خصوصیت کو تسلیم کیا ہے۔ مولانا کا کمال یہ ہے کہ وہ خود ان سوالات کو اٹھاتے چلے جاتے ہیں جو کسی قاری یا معترض کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں پھر ان کا ایک ایک کر کے مسکت جواب دیتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح معترض کو بھی اور ایک عام قاری کو بھی بالکل بے بس کر دیتے ہیں اس معاملے میں بڑے بڑے دانشور اور متکلم ان کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ میں مولانا کی کتابوں سے وہ اقوال پیش کروں جن میں انہوں نے مخالفین کو دلائل سے بے بس کیا ہے۔ مگر دشواری مشکل یہ ہوتی ہے کو بڑے طویل اقتباسات پیش کرنے پڑتے ہیں اور اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ سیر حاصل اقتباسات پیش کئے جائیں۔ اس لئے یہی ممکن ہے کہ چھوٹے چھوٹے اور مختصر اقتباس پیش کر کے کام چلایا جائے۔ استدلال کے ضمن میں مولانا کی کئی کتابیں مشہور ہیں۔ مثلاً پردہ، مسئلہ جبر و قدر، تفہیمات، ضبط ولادت وغیرہ۔ میں انہیں کتابوں میں سے چند سطور پیش کرتا ہوں، جو ایک مثال یا نمونے کا کام دے سکیں گی۔ اور اس پر آسانی سے یہ قیاس کیا جا سکے گا کہ مولانا نے اپنی نگارشات میں کس طرح مدلل اور منطقیانہ بحث کی ہے۔

مثلاً اپنی ابتدائی دور کی کتاب "پردہ" میں لکھتے ہیں۔

"انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ پیچیدہ مسائل دو ہیں جن کے صحیح اور متوازن حل پر انسان کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے اور جن کو حل کرنے میں قدیم ترین زمانے سے لے کر آج تک دنیا کے حکماء و عقلا پریشان و سرگرداں رہے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں عورت اور مرد کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے کیونکہ یہی تعلق دراصل انسانی تمدن کا سنگ بنیاد ہے اور دوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلق کا ہے جس کا تناسب قائم کرنے میں اگر ذرا سی بے اعتدالی بھی باقی رہ جائے تو صدیوں تک عالم انسانی کو اس کے تلخ نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ ان دونوں مسائل کی پیچیدگی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ جب تک فطرت کے تمام حقائق پر کسی کی نظر پوری طرح حاوی نہ ہو وہ انکو حل نہیں کر سکتا۔"

ایک دوسری ابتدائی اور استدلالی کتاب "تنقیحات" سے چند سطور بطور نمونہ پیش کرتا ہوں، زورِ عبارت، استدلالی آہنگ اور منطقی نتائج کا استخراج کتاب کے ہر صفحے پر نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

حکومت و فرمانروائی و غلبہ و استیلا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ، دوسرا سیاسی

اور مادی غلبہ۔ پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فکری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اس کے افکار پر ایمان لے آئیں۔ اس کی تحقیق کو تحقیق سمجھا جائے اور ہر وہ چیز باطل ٹھہرائی جائے جس کو وہ باطل ٹھہرا دے دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ اگر ایک قوم اپنی مادی طاقتوں کے اعتبار سے اتنی قوی ہو جائے کہ دوسری قومیں اس کے مقابلے میں اپنی سیاسی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکیں اور کلی طور پر یا بڑی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائل ثروت پر قابض اور ان کے نظم مملکت پر حاوی ہو جائے اس کے مقابلے میں مغلوبیت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک ذہنی مغلوبیت، دوسری سیاسی مغلوبیت"

ایک تیسری کتاب جس میں استدلال اور براہین کا بہت زور ہے "اسلام اور ضبط ولادت" ہے اسمیں سے بھی چند سطور اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

" جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے وہ تو ایک" لادینی مملکت" ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس لئے اپنے کسی سرکاری پالیسی کیلئے مذہب سے سند لانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن پاکستان ماشاء اللہ ایک اسلامی مملکت ہے۔ اس لئے یہاں یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ یہ تحریک (ضبط ولادت) عین مطابق اسلام ہے۔... یہ کتاب اس غلط فہمی کو رفع کرنے کیلئے لکھی جارہی ہے...... ایک اجتماعی مسئلے کو حل کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام متعلقہ پہلوؤں پر جامعیت کے ساتھ نگاہ ڈالی جائے اور کسی وقت بھی بحث وتحقیق کا دروازہ بند نہ کیا جائے۔

اسی کتاب میں آگے چل کر تحریر ہے :

"سوال یہ ہے کہ کیا اضافہ آبادی سے تنگیٔ معیشت کا خطرہ ہے؟ ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ اندیشہ بجائے خود کہاں تک صحیح ہے۔ پہلی ہی نظر میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں آج تک کبھی انسانی نسل اس ہندسی طریقے پر نہیں بڑھتی ہے جو مالتھوس اور فرانسس پلاس کے پیرو بڑے حسابی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان کی نسل کبھی کی اس دنیا سے مٹ چکی ہوتی۔ اور آج ہم اس مسئلے پر بحث کرنے کیلئے موجود ہی نہ ہوتے"

★★

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

صہبائے آبگینہ گداز

اقتباسات

انتخاب : حفیظ الرحمٰن احسن

-۱-

حق تعالیٰ اپنے احسان وفضل میں جیسا فیاض ہے، یہ بندہ اس سے فضل و احسان کی طلب میں ویسا ہی حریص ہے۔ اس نے جو کچھ دیا ہے اس پر شکر ضرور ہے، مگر قناعت نہیں۔ خدا کے مقابلے میں قناعت کیسی؟ اس کو اپنے غنا پر ناز ہے تو بندے کو بھی اپنے فقر پر ناز ہے۔ اس کا فیض بے پایاں ہے تو بندے کی احتیاج بھی بے پایاں ہے، اور وہ دینے سے نہیں تھکتا تو بندہ مانگنے سے کیوں تھکے، اور اس سے نہ مانگے تو پھر کس سے مانگے۔

...... میں علم کا پیاسا ہوں اور اس پیاس کو بجھانے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ میری عقل وفہم میں ہزاروں کوتاہیاں ہیں اور ان کو دور کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہی ہے۔ میرا دل بے چین ہے، میری روح مضطرب ہے، میرا دماغ سکون سے محروم ہے، خدا ہی ہے جو اس بیماری کا مداوا کرسکتا ہے۔ میں گنا ہوں میں گھرا ہوا ہوں۔ میرے عمل میں لاکھوں خامیاں ہیں۔ میری فطرت کی کمزوریاں قدم قدم پر مرضاتِ الٰہی کے اتباع سے مجھ کو روکتی ہیں، خدا کے سوا کوئی نہیں جو میرے ان عیوب کی اصلاح کرے اور عملِ صالح کو توفیق بخشے۔

میں اس سے خلوصِ نیت کا طلبگار ہوں۔ صحتِ فکر اور سدادِ نظر مانگتا ہوں۔ اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ کی توفیق چاہتا ہوں۔ میں اس سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے بندوں سے بے نیاز کرکے صرف اپنا نیازمند بنائے۔ محبت اور خوف اور طمع کا تعلق سب سے توڑ کر صرف اپنے ساتھ جوڑ دے اور اتنی قوت وطاقت عطا فرمادے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں اپنے دل کے سب حوصلے نکال سکوں۔ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ عَسٰٓی اَلَّآ اَکُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا [1]

(اشارات، ترجمان القرآن، محرم ۱۳۵۵ھ مطابق مارچ اپریل ۱۹۳۶ء)

-۲-

پہلے صبر و توکل کے الفاظ ذہن میں تھے، روح میں ان کے معنی کا تحقق اب شروع ہوا ہے۔ پہلے صرف اعتقاداً یہ سمجھتے تھے کہ خدا پر بھروسا کرنا چاہیے۔ چار سال کی مشق و تمرین کے بعد اب کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے کہ خدا پر بھروسا

---

[1] ترجمہ از مرتب: اور میں اپنے رب ہی کو پکاروں گا، امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا (سورۂ مریم ۴۸)

کرنے کے کیا معنی ہیں اور اس پر بھروسا کرنے والوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ یہی وہ نعمت ہے، برسوں سے جس کی طالب تھی، اور اب کہ اس بخشش کا آغاز ہوا ہے، صمیم قلب کے ساتھ بخشنے والے کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ادائے شکر کے ساتھ یہ دعا کرتا ہوں کہ اس نعمت کا اتمام فرمایا جائے، کیونکہ اب جو مرحلہ درپیش ہے اس میں سب سے بڑھکر اسی چیز کی ضرورت ہے۔ میں ایک مجاہد کے سے ایمان کا طالب ہوں۔ ایسا دل مانگتا ہوں جو سمندر کی طوفانی موجوں کے مقابلے میں ٹوٹی ہوئی کشتی لے جانے پر بے جھجک آمادہ ہو جائے۔ ایسی روح مانگتا ہوں جو شکست کھانے اور سپر رکھ دینے کا تصور ہی نہ کر سکتی ہو۔ ایسی عزیمت مانگتا ہوں جو مادی سہاروں سے قطعاً مستغنی ہو اور تمام سہاروں کے چھوٹ جانے پر بھی نہ ٹوٹ سکے۔ ایسا ارادہ مانگتا ہوں جسے کوئی طاقت اپنے مقصد کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔

(اشارات: ترجمان القرآن محرم ۵۶ ۱۳ھ
(بمطابق مارچ، اپریل ۱۹۳۷ء)

— ۳ —

اب میرے سامنے ایک بڑی مہم درپیش ہے جس میں مجھے ہمہ تن منہمک ہو جانا پڑے گا۔ میں نے اس مہم کی ابتدا محرم کے ترجمان القرآن سے کر دی ہے جس میں اسلامی ہند کے مستقبل پر مضامین کا سلسلہ شروع ہوا ہے آئندہ چند مہینوں میں دیکھنا ہے کہ کتنے مددگار ملتے ہیں۔ بہر حال میں یہ تصفیہ کر چکا ہوں کہ خواہ سارے ہندستان میں ایک بھی ساتھی نہ ملے، میں تنہا اپنی ذات سے اس جنگ کو شروع کروں گا اور آخر وقت تک جاری رکھوں گا۔ قطع نظر اس کے کہ کامیابی ہو یا نہ ہو۔ مسلمانوں کی اس وقت جو نازک حالت ہے اور جو خطرناک مستقبل ان کے سامنے ہے، اس کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ آئندہ دس بیس سال اس ملک میں اسلام کی قسمت کیلئے فیصلہ کن ہیں۔ اگر اس وقت ہم مدافعت کیلئے کھڑے نہ ہوئے تو چند سال بعد ہم کو سکون کا کوئی گوشہ نہ ملے گا جہاں بیٹھ کر ہم کوئی تعمیری کام کر سکیں .... آج کل میرے خیالات میں ایک ہلچل برپا ہے۔ جس نے مجھے پر سکون تفکر کے قابل نہیں رکھا۔ دل میں سے ایک آگ اپنے سینے میں جلایا ہوں اور ہر لمحہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب کیا کروں۔

(خط بنام چودھری نیاز علی صاحب،
۲۷ر اپریل ۱۹۳۷ء۔ مطبوعہ وثائق مودودی ص ۸۳)

بہت دور مگر

(اشبیلیہ سے قرطبہ جاتے ہوئے)

دور ہے مجھ سے بہت دور مگر دور نہیں
آنکھ مجبور سہی، دل کا یہ دستور نہیں
دل کہ صدیوں کے گراں بار تلے چور نہیں

سر بسر حدِ نظر تک ہیں بکھرے جسم سمیت
جھومتی بیلیں ـــ دمکتے ہوئے انگور کے کھیت
ایسی شادابیوں میں کیسی یہ اڑتی ہوئی ریت

عربی نسل کے گھوڑوں پہ ہیں کچھ شاہسوار
اتنی تیزی سے بڑھا جاتا ہے جو ابر غبار
یا ہے مردانِ جواں عزم کی پیہم یلغار

کارواں عظمتوں کے، عزتوں کے گزرے ہیں
دشتِ تخیل میں وحشی بھی کئی اترے ہیں
کوئی جمتا ہی نہیں نقش بہت ابھرے ہیں

کیسا شعلہ سا چمک اٹھا تھا اس جھاڑی میں
اسپ تازی کی صدا پھولوں بھری باڑی میں
کان بجتے ہیں مرے، ورنہ کہاں گاڑی میں

پی لیے آنکھ سے امڈا تھا جو دل سے آنسو
نعرہ زن پھر بھی رگ و پے میں ہوا میرا لہو
اپنے ہمراہ لئے چل مجھے اے کون ہے تو

قیوم نظر

اب جاگ چکو

اب جاگ چکو کھوئی عظمت کے رکھوالو
جاں دے کے جو بات بنائی تھی وہ بات کہاں باقی ہے
جو ساکھ تمہارے نام سے تھی وہ ساکھ گئی کب باقی ہے
اس جان دیئے کو اندھیرے میں کھو جانے سے پہلے اجیالو
اب جاگ چکو کھوئی عظمت کے رکھوالو

پھر دیس کی لاج کا نقارہ بجتا ہے سب کو بلایا ہے
گھمسان کا رن ہے، دھرتی کا سینہ ہے کہ خوں میں نہایا ہے
ایسے میں زندہ رہنے کو اک موت ہے جس کو اپنا لو
اب جاگ چکو کھوئی عظمت کے رکھوالو

گرتی دیواریں، اڑتی چھتیں اور ہول کے مارے ویرانے
کل تک تو یہی شاید ہوں گے کہنے کو تمہارے افسانے
یہ وقت ہے ہوش میں آنے کا یہ وقت نہ سو کر یوں کاٹو
اب جاگ چکو کھوئی عظمت کے رکھوالو

لطیف آرزو - جوگی بیٹ

دوستی، راہ وفا میں سب لٹا دینے کا نام
عزم و ہمت، ہنس کے سارے غم بھلا دینے کا نام
زندگی، اللہ کی مرضی کو پا لینے کا نام
بندگی، فرمانِ حق پر سر جھکا دینے کا نام

محمد بن حسین نقیب

فرقہ بندیاں

بلکہ سینے سے لگا رکھتے ہیں قرآن بھی
نام اسلام کا لیتے ہیں مسلمان سبھی
یوں تو سب کہتے ہیں، ہے دین بھی قرآن بھی ایک
ہم نے ہوتے نہیں دیکھا ہے مسلمان بھی ایک
ہر عقیدہ ہے نیا، ہو گئے ایمان کئی
اک قرآں سے نکالے گئے قرآن کئی
اُسکی تفہیم الگ اسکی ہے تفسیر نئی
اُسکی تقریر جدا، اسکی ہے تحریر نئی
کوئی دیتا ہے سدا دین شریعت کا پیام
کوئی کہتا ہے طریقت سے ہے جانِ اسلام
کوئی ٹھہرا ہے فقط جبہ و دستار لئے
کوئی آتا ہے سدا دعوتِ کردار لئے
درسِ عرفان و تصوف میں ہے غلطاں کوئی
ترک کرتا ہی نہیں سنت و قرآں کوئی
چند لوگوں کی ہے تلقین کہ سب سے مانگو
کوئی کہتا ہے نہیں۔ مانگو تو رب سے مانگو
دامنِ شیخ کا لیتا ہے سہارا کوئی
اپنے اعمال پہ کرتا ہے گزارا کوئی
ساز و آواز کی لَے پر کوئی جھومے ہے مدام
نغمہ و ساز کی محفل کہیں ہوتی ہے حرام
"ناخدا" کتنے ہیں، روز کتنے "سفینے" ہیں یہاں
کتنے "کعبے" ہیں یہاں کتنے "مدینے" ہیں یہاں

پھر بھی کہتے ہیں مسلمان کہ ہم ایک تو ہیں!!
شرک ہوتا ہے شب و روز مگر نیک تو ہیں!!

شفیع اللہ خان رازؔ آبادی

قیدِ مسلسل

خوبصورت ہے بہت
عالمِ امکاں
لیکن
رنگ زندانِ عناصر سے
مزیّن ہے حیات
توڑ کر ——
حلقۂ دوراں کو نکل بھی جائیں
اڑ کے ——
محبوس فضاؤں سے،
گزر بھی جائیں
چاند تاروں میں / الجھ جائیں گے
دنیا والے
ہر طرف ——
شوخ طلسمات کی دیواریں ہیں
جن میں
جکڑے ہوئے مخلوق کی زنجیریں ہیں
آدمی ——
قید میں ہے ——
روزِ ازل سے ——
اب تک ——
آہ!
اس قیدِ مسلسل سے نجات پائے گا۔

کونپل اور کرنیں

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی۔ حیدرآباد (سندھ)

مارننگ واک سے واپسی پر چوراہے پر پہنچتے پہنچتے ریٹائرڈ بوڑھوں کا یہ گروہ جو مختلف موضوعات پر گفتگو کرتا چلا آرہا تھا اپنی اپنی گلیوں میں مڑ گیا تھا۔ شیخ صاحب کو بھی چوراہا پار کرکے ایک سمت میں جانا تھا لیکن نہ جانے کیوں چلتے چلتے ان کے پاؤں رک گئے۔ ایسا لگا جیسے وہ کچھ بھول گئے ہوں۔ ان کے چہرے پر عجیب سی اداسی تھی۔ آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں بند ہوگئیں جیسے وہ کسی گہرے خیال میں غرق ہو گئے تھے۔ نہ جانے کہاں سے انکی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ بدن ڈھیلا پڑ گیا 'یہ کیا زندگی ہے۔ بے بسی، بے کسی، مجبور و مقہور بے معرف زندگی۔ آخر وہ کس لئے زندہ ہیں کیونکہ ان کا مقصد ختم ہو چکا ہے۔ وہ اب کس لئے زندہ رہیں۔ وہ اب تک کیوں زندہ ہیں۔ وہ کیوں سانسیں لے رہے ہیں۔ جب ان کی کسی کو بھی ضرورت نہیں ہے۔ جب ان کے بغیر سارے کام، اور بھی بہتر انداز سے چل سکتے ہیں تو پھر وہ ایک بوجھ بنا ہی تو ہے۔ اس بوجھ کو زمین سمیٹ کیوں نہیں لیتی، یہ سانس رک کیوں نہیں جاتی۔ میں .... شیخ صاحب کی آنکھوں سے پہلے تو ٹپ ٹپ آنسو گرے۔ پھر جھڑی سی لگ گئی، ہچکیاں بندھ گئیں، ان کا سفید ململ کا کرتہ بھیگنے لگا۔ انکی آنکھوں کے سامنے گہری دھند سی چھاگئی۔ چوراہے کے راستے دھندلا گئے، پھیل گئے، عجیب عجیب ٹیڑھے میڑھے، آڑے ترچھے، وحشت ناک اور ویران بند کانیں، خاموشی، انجانے سے خوف۔ یہ ساری باتیں شیخ صاحب نے جیسے ایک ساتھ محسوس کیں۔

یا الٰہی یہ کیا ہو رہا ہے، آج پھر شیخ صاحب کا ذہن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ خیالات نے انہیں گھیر لیا تھا، 'الٰہی میرے تو خاندان کا شیرازہ ہی بکھر اجا رہا ہے۔ میری برسوں کی ریاضت، تربیت، اصول، رکھ رکھاؤ، وضع داری، رعب، دبدبہ، وقار، زندگی کا مخصوص پیٹرن یہ سب کے سب آنے والے سیلاب اور طوفان کی شدت اور بہاؤ کے رخ پر ایک حقیر تنکے کی حیثیت میں اپنی ساری حقیقتیں کھو رہے ہیں۔ میرے اخلاقیات کے فلسفے، میرے رکھ رکھاؤ، میرا زندگی بھر کا بھرم، یہ سب کا سب میری آنکھوں کے سامنے ہی تباہ ہو رہے ہیں۔ میں محض تماشائی کی حیثیت سے زندہ ہوں، میرے منہ پر مسلسل طمانچے پڑ رہے ہیں۔ میری انا کو مسلسل مجروح ہی نہیں کیا جا رہا ذبح کیا جا رہا ہے اور مجھ پر یہ پابندی بھی ہے کہ میں یہ سب کچھ زندہ رہ کر دیکھوں۔

میں زندگی کے کسی بھی کرب ناک پہلو پہ ہمت نہیں ہارا۔ میں نے غربت کے دن بھی دیکھے۔ میں نے کئی دن

فاقے بھی کیے۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب میں پاکستان آیا تھا تو ایک چھوٹا سا تمبو مجھے رہنے کے لئے ملا تھا۔ جس میں بارش سے ہم سب بھیگ جاتے تھے۔ دونوں بچے، سردی کی بارشوں میں مجھ سے چپک جاتے اور میں انہیں محفوظ رکھنے کیلئے ہر ممکن کوشش کرتا۔ میں نے فاقے کیے۔ اس وقت بھی میں اپنی جگہ پر مطمئن تھا۔ میرے ذہن میں شعلے اس طرح کبھی نہیں لپکے۔ وقتی طور پر تکلیفوں کو بھول جاتا تھا۔ نوکری ملنے کے کافی دن بعد بھی میں کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا رہا لیکن کبھی بھی یہ باتیں میرے ذہن پر بھوت بن کر سوار نہیں ہوئیں۔ میں نے مردانہ وار مقابلہ کیا اور میں نے فتح بھی حاصل کی۔ میں نے اپنی مسلسل جدوجہد اور خدا پر بھروسے کی بدولت حالات کا رخ موڑ ڈالا میں نے محنت کی۔ دن رات کسی نہ کسی کام میں مصروف رہا۔ میں نے اپنے بچوں کی تعلیم پر سب کچھ خرچ کر ڈالا۔ میں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ بچوں کو غربت کا احساس نہ ہونے پائے اور پھر میں ایسا غریب بھی نہیں تھا۔ دونوں وقت کھانا پینا، پہننے اور رہنے کو بھی اللہ نے دیا تھا۔ میں نے پیسہ پیسہ کر کے جمع کیا۔ ضرورتوں کیلئے قرض بھی لیا۔ تنگی ترشی بھی برداشت کی لیکن یہ طویل دور بس گزر ہی گیا۔ اب اسے یاد کرنے سے حاصل بھی کیا۔ کوئی کام رکا تو نہیں۔ سارے کام چلتے ہی رہے۔ ساری ضرورتیں کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی رہیں۔

ہاں مجھے یاد ہے اس وقت کچھ پریشانیاں بڑھ گئی تھیں۔ جب شاہد کو میڈیکل کالج میں داخل کرایا تھا۔ ایک کتاب تو پانچ سو روپے سے بھی زیادہ کی آئی تھی۔ جب قرض نہیں ملتا تھا تو میں کتنا گھبرا گیا تھا۔ میں نے اپنی کئی بہت ضروری چیزیں بیچ دی تھیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی تھی۔ میں نے کبھی شاہد کو کمتری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ خالد کو انجینئرنگ میں داخلہ دلوایا۔ ماجد کیلئے تو اور بھی زیادہ پاپڑ بیلنے پڑے۔ اس کے اخراجات، نفاست پسندی اور سی ایس ایس کے امتحان کی تیاری کے سلسلے کے اخراجات، وہ امتیازی حیثیت سے کامیاب بھی ہوا۔ نازو بی بی نے ہوم اکنامکس میں ایم ایس سی کی اور وہ کالج میں استاد مقرر ہو گئی۔ آج یہ جو ڈاکٹر، انجینئر، ڈپٹی کمشنر اور پروفیسر ہیں ان کے لئے ساری زندگی میں نے کیا کیا کیا۔ میں ہی جانتا ہوں۔ میں نے اپنے اصولوں اور تمناؤں کیلئے جو سعی مسلسل کی اس کا اندازہ مجھے ہی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ان تمام تکلیفوں اور صعوبتوں کو تنہا برداشت کیا۔ اپنی بیوی تک کو اس میں شامل نہیں کیا۔ میں کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا کہ دن رات کی شدید محنت اور ہر وقت فکروں میں مبتلا رہنے سے میری صحت پر کیا اثر پڑا ہے۔ میں نے یہ ساری مصیبتیں اس لئے بھی برداشت کیں کہ یہ میرا فرض تھا۔ مجھے یہ سب کچھ کرنا ہی چاہیے تھا۔ گھر کے سب لوگ میری بات بھی مانتے تھے اور میرے اصولوں کو بھی اہم سمجھتے تھے۔

-۲-

سلمیٰ تم کو بھی اب میری ضرورت نہیں رہی۔ ہمارا چالیس سال کا طویل ساتھ ہے۔ چالیس سال بڑا وقت ہوتا ہے۔ دو نسلیں جوان ہو جاتی ہیں۔ میں نے ہر ممکن طریقے پر تمہارے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کی لیکن

جب تمہیں غصہ آتا تھا تو تم پھٹ پڑتیں اور میں نہایت صبر اور شکر کے ساتھ سب کچھ سنتا تھا۔ میرے دل و دماغ پر کیا بیتتی تھی میں اس اذیت ناک عذاب کے بارے میں کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں، وہ وقت عذاب کا لامتناہی سلسلہ ہوتا تھا۔ تم مجھے میری غربت کے طعنے دیتی تھیں۔ میرے ماں باپ کو کوستی تھیں۔ تمہیں اس بات کا قلق تھا کہ بڑے لوگوں کی طرح میں تمہارے لئے عیش و عشرت مہیا نہ کر سکتا تھا۔ میری زبوں حالی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان طویل چالیس سالوں میں میں تمہیں ایک لمحہ کیلئے بھی اپنا حال نہ سنا سکا۔ میں نے تمہارا موڈ دیکھ کر ہمیشہ بات کی مجھے معلوم تھا اگر میں نے تمہارے خوشگوار موڈ کو دیکھ کر بات نہ کی تو تم شعلے کی طرح بھڑک جاؤ گی تنہائیوں میں جب میرے غم دھیرے دھیرے جاگتے ہیں اور کسی ساتھی کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے تو خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں اس جہنم کو برداشت کرتا ہوں۔ میں نے محض تمہاری جلی کٹی باتوں اور طعنوں سے بچنے کے لئے، محض تمہاری خوشیوں کیلئے، محض اپنے اصولوں کی برتری کیلئے اور تمہارے جارحانہ رویے سے زندگی میں مزید تلخی پیدا ہو جانے کے خوف سے تمہیں اپنے غموں میں شریک کرنے کا خیال بھی ذہن میں نہیں آنے دیا۔ سلمیٰ! کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تمہارا دل کتنا سخت کھٹور اور بے حس ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم نے بارہا میرے چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئی نہ دیکھی ہوں گی؟ کیا ان طویل چالیس سالوں میں تم نے مجھے غمگین، اداس، افسردہ اور مضمحل نہیں دیکھا ہوگا؟ میری آنکھوں میں بے لبسی اور مجبوری کے آنسوؤں کو تیرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔؟ سلمیٰ ان چالیس سالوں میں یقیناً بہت سے ایسے مواقع آئے ہوں گے جب میں باوجود احتیاط کے اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا ہوں گا۔ کبھی تم نے میرے چہرے کو پڑھا، میرے زخمی دل کو ٹٹولا۔ میں بھی انسان ہوں، میرے بھی جذبات ہیں۔ میں بھی محسوس کر سکتا ہوں۔ تمہاری مسلسل بے حسی بے تعلقی اور کھردرے رویئے پر بھی میں نے اپنے دل میں مسلسل جلن محسوس کی ہے۔ تاریکیوں میں میں پھوٹ پھوٹ کر رویا بھی ہوں میری ہچکیاں بھی بندھی ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میرا دل کٹ کٹ کر گر رہا ہے۔ میرے ذہن نے مسلسل ضربیں محسوس کی ہیں، مسلسل رونے سے میرا جی ہلکا بھی ہوا ہے۔ چالیس سال سلمیٰ چالیس سال، میں نے یہ عذاب بھگتا ہے۔

سلمیٰ تمہارا بڑا بیٹا ڈاکٹر ہو گیا لیکن اس طرح کے ڈاکٹر تو بہت تھے۔ ہاؤس جاب کے بعد ستر گریڈ کی اسے بھی نوکری مل گئی تھی لیکن وہ تو بہت اونچے خواب دیکھتا تھا وہ لندن سے اسپیشلائزیشن کرنا چاہتا تھا اس کے لئے ایک بڑی رقم درکار تھی۔ مجھے بھی اس کی اس خواہش کا احساس تھا۔ ایک دفعہ پھر میں نے خود کو داؤ پر لگا دیا اور شاہد کی یہ تمنا بھی پوری ہو گئی۔ میں اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے اور بھی بوڑھا ہوتا چلا گیا۔ تم نے، شاہد نے کسی نے بھی یہ نہیں پوچھا کہ یہ سب کچھ کس طرح ہوا۔ جب تم نے نہیں پوچھا تو میں تمہیں کیا بتاتا۔

شاہد کی پریکٹس بہت اچھی چلی دولت کی ریل پیل ہو گئی پرانی چیزیں سب کو بری لگنے لگیں گھروں کار

آئی۔ ٹیلی فون لگے۔ رنگین ٹیلی ویژن آیا۔ مکان کو از سرِ نو بنوایا گیا اور یہ سب کچھ میری مرضی کے خلاف ہوا۔ مجھ سے کسی نے بھی مشورہ نہیں لیا۔ میں یہ سب کچھ اجنبی کی طرح دیکھتا رہا۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں ملی کہ وہ مجھ سے پوچھتا کہ تم نے گھر کی ضرورتوں کے تحت جو قرضہ لیا ہے وہ ہمیں واپس بھی کرنا ہے پہلے وہ واپس کرو۔ سلمیٰ جب تم نے تمہارے بیٹوں نے کبھی اس موضوع پر نہیں سوچا تو میری بھی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ میں اپنا دکھڑا تمہارے سامنے روتا۔ میں نے سارے قرض خود ہی ادا کئے۔ تمہارا دوسرا بیٹا انجینیئر بن گیا تھا تیسرا ڈپٹی کمشنر اور بیٹی پروفیسر اور میں ——— میں محنت اور اصولوں کی آگ میں بھن رہا ہوں۔

شاہد کی شادی کا مسئلہ تھا میں نے اس کے چچا کی لڑکی سے بہت پہلے خاندان کو یکجا رکھنے کیلئے نسبت طے کردی تھی لیکن اس بات کو جیسے سارا گھر ہی بھول گیا۔ شاہد نے خود ہی لڑکی کا انتخاب کیا اور جب شادی کی تاریخ قریب آئی تو مجھے دعوت نامہ ملا کہ آپ کی شرکت سے ہمیں خوشی ہوگی۔ یہ سانحہ بھی سہا۔ بھائی اور برادری نے مجھے ہی معتوب کیا۔ مجھ پر کیا گذری کسی کو کیا معلوم۔ آنے والی بہو کے رنگ ڈھنگ بالکل نرالے تھے وہ جتنی زیادہ خوبصورت تھی اتنی ہی بدمزاج اور مغرور لیکن شاہد کی پسند تھی اس لئے سارا گھر اس کے پیچھے پیچھے چلنے، اس کے اشاروں اور مزاج کو سمجھنے اور خدمت کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ بہو نے شاہد ایک دفعہ پوچھا بھی تھا کہ یہ کون حضرت ہیں اس جملے پر سارے گھر والوں پر ایک لمحہ کیلئے تو سکتہ ساطاری ہوگیا پھر شاید شاہد نے ہی دل پہ جبر کر کے بتایا تھا کہ میرے والد ہیں ریٹائرڈ لائف گذار رہے ہیں۔

۔۳۔

بے مصرف زندگی، ہاں بے مصرف۔ گھر والوں کی نظر میں میری زندگی قطعی بے مصرف ہے۔ جب یہ مصرف کی تھی اس وقت بھی یہ ایک مختصر تنخواہ والی نوکری کی زندگی تھی اور اب جو پنشن مقرر ہوئی ہے اس سے زیادہ تنخواہ شاہد اپنے خانساماں کو دیتا ہے۔ اس لئے اس پنشن کا کبھی ذکر ہی نہیں آیا۔ کسی نے کبھی پوچھا بھی نہیں۔ اپنے ہی گھر میں اپنے ہی بچوں کے درمیان اجنبی شیخ جی نے بے حد تنہائی محسوس کی۔ لے دے کر ایک گڈو تھا ان کا پوتا جو شیخ جی سے لپٹ جاتا، ان سے کہانیاں سنتا۔ انہیں اپنا سبق سناتا، ان کے ساتھ کھیل کھیلتا جب گڈو ان کے پاس ہوتا تو وہ سمجھتے کہ ان کی زندگی بے مصرف نہیں ہے۔ کوئی تو ایسا ہے جو ان سے دلچسپی لیتا ہے۔ وہ گڈو کو اپنی جوانی کے حال دلچسپی کے ساتھ سناتے۔ اپنی جدوجہد گڈو کو سمجھاتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کرکے وہ گڈو کو ایک مستقل مزاج انسان بنا رہے تھے۔ اس میں انسانیت کا جذبہ پیدا کر رہے تھے۔ اس میں تعلیم کا لگن پیدا کر رہے تھے۔ گڈو ان کی باتوں کو حیرانی اور دلچسپی کے ساتھ سنتا۔ جیسے وہ یہ ساری باتیں پہلی بار سن رہا ہے۔ یہ باتیں اسے گھر میں کسی نے نہیں بتائی تھیں اور نہ کوئی اس قسم کی باتوں کو اہمیت دیتا تھا

گڈو کا خیال ذہن میں آتے ہی شیخ صاحب کے اداس، غمزدہ اور سلوٹوں والے چہرے پر ایک ہلکی سی کرن نمودار ہوئی۔ ان کے چہرے کی تنی ہوئی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ پھر انہوں نے ایک لمبی سانس لی، یہ شیخ صاحب کے لئے اس بات کا اشارہ تھا جیسے وہ آلام دہر اور زندگی کی تمام بکھری ہوئی تلخیوں کو ایک گھونٹ میں پی گئے ہیں۔ ان میں زندہ رہنے اور زندگی کے بوجھ کو سہارنے کی ایک نئی قوت پیدا ہو گئی ہے۔ انہوں نے حالات اور واقعات پر پھر سے قابو پا لیا ہے اور وہ زخموں کے درد کی شدت کو بھول گئے ہیں یا انکی شدت میں کمی آ گئی ہے۔

شیخ صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔ انہیں کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ انہیں محسوس ہوا جیسے خوشیوں کی ہلکی ہلکی پھواریں ان کے ذہن پر گر رہی ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش خوشبو کے جھونکوں کو محسوس کر رہے تھے۔ جیسے کوئی ان کے کندھوں پر ہاتھ سے دھیمے دھیمے تھپک کر کہہ رہا ہے۔ شیخ صاحب نیکیوں کو گنا نہیں کرتے۔ نیکیاں صلہ نہیں مانگتیں۔ نیکیاں نیکیاں ہیں۔ وہ تو نرا خوشیوں کا احساس ہیں۔ وہ خوشیوں کی نرم و نازک معطر لہریں ہیں۔ خوشبو کا شدید احساس ہیں نیکیاں بدلہ چاہتی ہی نہیں۔ قربانیاں تو اگربتی ہیں۔ ان کا تصور انسان کے دل پر سے بڑے بڑے بوجھ اتار دیتا ہے۔ دوسروں کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے کندھوں پر گٹے ضرور پڑ جاتے ہیں۔ لیکن اس سے انسان کو جو دلی مسرت حاصل ہوتی ہے وہ دوسرا کوئی محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ غموں میں بھی ایک لذت ہوتی ہے۔ اپنی ایک شان ہوتی ہے، آن ہوتی ہے، وقار ہوتا ہے۔ دوسروں کے لئے سہارا بننے والا مالی اور مادی فائدہ کبھی نہیں دیکھتا اسی لئے تو وہ خوشیوں کی جن لہروں پر سفر کرتا ہے اور احساس کی جن لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ اس کا اور صرف اس کا ہی حصہ ہے۔ شیخ صاحب نے یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہی محسوس کر لیا۔

شیخ صاحب کے سفید بالوں اور جھریوں والے چہرے پر طمانیت کے آثار تھے اور جب انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو فضا اجلی اجلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ سورج کی سنہری کرنیں تبھی ہو ہو کر دیواروں، بازاروں، دکانوں اور سڑکوں پر پڑ رہی تھیں۔ یہ کرنیں انہیں بڑی حسین معلوم ہوئیں۔ ان کرنوں کی روشنی میں جیسے خوشیاں لہرا رہی تھیں۔ ان کے دل میں ایک معصوم سا جذبہ ابھرا کہ وہ دوڑ کر ان ساری کرنوں کو سمیٹ لیں۔

چوراہے پر چہل پہل ہو گئی تھی، تانگے، رکشے، موٹریں، سائیکلیں، بسیں بڑی تیزی کے ساتھ اپنے سفر پر رواں دواں تھیں۔ لوگ اپنے اپنے کاموں کی طرف کشاں کشاں چلے جا رہے تھے۔

شیخ صاحب نے چوراہا پار کیا۔ سامنے سے گڈو انکی طرف بھاگتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اسکے ننھے سے چہرے پر خوشیوں کی لہریں رقصاں تھیں، انداز والہانہ تھا۔ شیخ صاحب نے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ بے اختیار ہو کر بار بار اس کا ماتھا چوما۔ ان کا دل خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ گڈو ان سے لپٹ گیا اور شیخ صاحب سارے ہی غم بھول گئے تھے۔ گڈو چاہتا ہے کہ میں اس کے لئے زندہ رہوں۔ اس کی تربیت کروں۔ اس کے لئے خوشیاں مہیا کروں ——— گڈو! انہوں نے بے اختیار ہو کر ایک بار پھر گڈو کو چوم لیا۔ کرنیں شیخ صاحب اور گڈو دونوں کے چہروں کو منور کر رہی تھیں۔ (بشکریہ "سیارہ" لاہور)

الم

طاہر نقوی نمبر پر خاص

نیند کے بعد

اہتمام کی سیڑھیوں پر لوگ ہانپتے ہوئے چڑھ رہے ہیں۔ اس کیفیت سے گھبرا کر میں اپنی زمینوں پر اترتے ہوئے شہر کے راستوں پر اجنبی بنا اپنی تنہائیاں سمیٹے، جلتا ہوا دیا لیے پھرتا ہوں تاکہ مجھے روشنی کا کوئی شناسا اجالا مل جائے جو اپنی ذات کے حصار سے خود کو نکال کر میرے ساتھ مل کر باہر نظر ڈالے۔ لیکن سمے کا جھومتا ہوا دریا گدلاتا جا رہا ہے اور اس کے دھارے کے ساتھ ہم سب مجبوراً بہتے چلے جاتے ہیں۔

چنانچہ اپنے شہر کی اس کثیف فضا کا فطری ردعمل مجھ پر یہ ہوا کہ میں اپنے گھر کے دروازے، کھڑکیاں دن رات کھلی رکھتا ہوں۔ دفتر جاتا ہوں۔ تب بھی انہیں کھلا چھوڑ جاتا ہوں اور رات کو گھر میں داخل ہوتا ہوں تو دروازے، کھڑکیاں بند کیے بغیر سو جاتا ہوں۔ چنانچہ میری جان پہچان والے میری اس عادت پر حیران و پریشان ہیں، اور فی زمانہ میری یہ عادت ان کے لیے بجا طور پر حیران کن ہے۔ شروع میں مجھے دبے لفظوں میں اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن میں ہنس کر ٹال دیا کرتا۔ اس ضمن میں پریشان ہونا میرے نزدیک فضول ہے کیونکہ میرے گھر میں کوئی ایسی شے موجود نہیں جس کی حفاظت کے لیے میں کوئی بندوبست کروں اور دروازے کھڑکیاں بند کر کے اندر بیٹھا رہوں۔ میرے احباب میری اس رائے سے میری صحت پر شک کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ میں الٹا خود ان پر دل ہی دل میں ہنستا ہوں کہ یہ اتنی حفاظتی تدابیر بھلا کس چیز کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ ان کے پاس بھلا کیا رکھا ہے۔ یہ سب اپنے اپنے واہموں میں رہ کر خود اپنی سزا غیر محسوس طور پر بند مکانوں میں کاٹتے ہیں اور پھر اپنے گھروں کی دیواریں اونچی کر لینے کے بعد محفوظ ہو جانے کے گمان میں مبتلا رہتے ہیں۔

لہٰذا محلے میں کئی پڑوسیوں نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے اس معاملے کو سنجیدگی سے لیا اور اکثر مجھے احتیاط برتنے اور دروازے کھڑکیاں بند کر لینے کی تاکید کرتے رہتے۔ لیکن میں ہمیشہ کی طرح اب بھی ان کی اس بات کو خاطر میں نہ لایا۔ میرے خیال میں محض اسی خدشے کی وجہ سے قدم قدم پر ان لوگوں کی پریشانیاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور نتیجے کے طور پر ان کے من کے اندھیرے میں اب خود ان کا اپنا دم گھٹنے لگا ہے۔ تاہم جب کوئی مجھ سے اپنی گھٹی گھٹی آواز میں ہمدردی جتاتا تو میں اس سے ہمیشہ یہی کہتا کہ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جسے سینت سینت کر رکھوں۔ آخر

میرے اس نقطۂ نظر کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے مجھ سے اس موضوع پر دوبارہ بات کرنا مناسب نہ سمجھا میں خود بھی روز روز کی اس بحث سے تنگ آ چکا تھا اور یہی چاہتا تھا کہ ان سب کی حمایت سے لاتعلقی کے نقاب اوڑھ لوں۔ کیونکہ زمانے سے آشنا ہونا بہت کٹھن ہوتا ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہ تعجب ہوتا کہ گرم موسم میں بھی لوگ دروازے کھڑکیاں بند کر کے رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس میرے گھر میں تازہ اور ٹھنڈی ہوا چاروں طرف گھومتی پھرتی اور سردیوں میں میرے صحن پر دھوپ کی چادر تنی رہتی۔

پھر یہ ہوا کہ ایک رات جب دنیا اندھیرے کی چادر اوڑھے سو رہی تھی تو میں حسب عادت اپنے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں قیمتی صوفے پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی کی آواز پر میں چونک کر اٹھ بیٹھا اور باہر نکل کر دیکھا تو وہاں محلے کا چوکیدار کھڑا تھا۔ اس نے اس وقت بھی مجھ سے وہی بات کہی کہ میں نے آپ کو کئی بار آواز دے کر بتانا چاہا مگر شاید آپ ہمیشہ دروازہ بند کیے بغیر سو چکے ہوتے اور مجھے آپ کے گھر کا خاص خیال رکھنا پڑتا۔ لہٰذا اب آپ اپنا دروازہ بند کر لیں۔ میں نے اس کے سامنے اپنی وہی بات دہرائی تو اس نے مجھ پر حیرانی سے نظر ڈالی اور اپنی بات کا کوئی اثر نہ دیکھ کر زمین پر لاٹھی مارتا ہوا چلا گیا۔

انہی دنوں میرے ایک پڑوسی نے سویرے سویرے گھر آ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں اپنے خیال کے مطابق مجھے یہ اہم بات بتائی کہ محلے میں کل فلاں صاحب کے ہاں چوری ہو چکی ہے۔ جبکہ انہوں نے پوری طرح حفاظتی اقدامات کر رکھے تھے۔ میرا یہی مشورہ ہے کہ آپ بھی احتیاط کریں۔ مگر مجھ پر ان کی بات کا بھی کوئی اثر نہ ہو سکا۔ یہ دیکھ کر وہ خاموشی سے اٹھ کر جانے لگے تو میں نے اپنے گھر کی اشیا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بھئی اگر یہ چیزیں کوئی یہاں سے لے جاتا ہے تو ایسی کون سی بات ہے، انہیں کوئی بھی استعمال کر لے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس پر وہ کچھ بولے نہیں بلکہ مجھ پر مشکوک نظریں ڈال کر چلے گئے۔ ان سے فارغ ہو کر میں دفتر پہنچا تو میرے کئی ساتھیوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور تازہ اخبار میرے سامنے کر دیا کہ دیکھو شہر میں ان دنوں ڈاکے زیادہ پڑ رہے ہیں اور بتایا کہ انھوں نے اپنے گھروں میں مزید احتیاط کے طور پر لوہے کی گرل اور دروازے لگوا دیئے ہیں۔ میں اس دوران میں یہی سوچتا رہا کہ ہمہ وقت یہ سب محض اپنی اپنی خواہشوں کو لوریاں دینے میں مصروف رہتے ہیں چنانچہ ان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بیابان آوازوں کے جنگل میں بھٹکنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتا۔ اسی روز میرے ان ساتھیوں نے دفتر کے بعد فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ اس کے بعد ہم سب نے ہوٹل میں کھانا کھایا اور ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ اس دوران وہ متواتر وہی باتیں کرتے رہے۔ البتہ ابھی تک میں ان کی باتوں میں ان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ جب تھکن زیادہ سوار ہونے لگی تو ہم اپنے اپنے گھروں کی جانب چل دیئے اور جس وقت میں اپنے محلے میں داخل ہوا تو رات کافی بیت چکی تھی۔ اکا دکا دکان ابھی کھلی ہوئی تھی مگر سڑکوں پر چہل پہل ختم ہو چکی تھی اور شہر اپنے آپ کو سمیٹے زمین سے اٹھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ میرے واسطے سنسان راستوں کے سفر کا یہ پہلا تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے نہایت اطمینان سے ٹہلتے ہوئے میں چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ اس سناٹے میں اس اچانک آواز کی وجہ سے میں ٹھٹکا اور مڑ کر دیکھا تو محلے کا وہی چوکیدار تھا۔

"آپ اپنے گھر کا دروازہ پھر کھلا چھوڑ گئے۔"

مجھے اس کے ناوقت ٹوکنے پر اچھا نہیں معلوم ہوا مگر میں چپ رہ کر برداشت کر گیا تو وہ ہمدردی سے بولا

"صاحب ان دنوں چوریاں زیادہ ہو رہی ہیں۔"

میں نے جب لاپرواہی سے اسے یہ جواب دیا تو مجھے یہ علم تھا کہ وہ اس وقت مجھے باہوش و حواس نہیں سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اس نے سمجھانے کے انداز میں دھیمی آواز میں کہا۔

"ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی قیمتی چیز ضرور ہوتی ہے۔"

میں اپنی تھکن کے احساس کے باوجود اس کی بات پر ہنس دیا۔ لیکن اس نے میری ہنسی کو اہمیت نہیں دی اور فکرمندی سے کہنے لگا۔

"گھر کا نہ سہی کچھ اپنا ہی خیال کریں ——"

"اپنا —— ؟"

"ہاں اپنا —— !"

یہ کہہ کر وہ ڈنڈا زمین پر مارتا ہوا برابر والی گلی میں مڑ گیا۔ میں نے عجیب جذبے کے ساتھ جسے میں خود کوئی نام نہیں دے سکتا اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ میرے خیال میں ایسا لمحہ ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی غیر محسوس طریقے پر ضرور آتا ہے۔ البتہ جو اس مرحلے سے کامیابی سے گذر جاتا ہے اُسے اس کا ادراک ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی اس وقت ایسے ہی لمحے کا ادراک ہوا جو میری زندگی کا عنوان بن گیا۔ چنانچہ اس وقت اونگھتی گلیوں سے سویرے کو جھانکتے دیکھ کر اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی فوراً تمام دروازے کھڑکیاں بند کر لیں اور ہر طرح اطمینان کر لینے کے بعد مسہری پر جا بیٹھا۔ تاہم ہمارک جانے کے باوجود اب مجھے احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔

صبح سورج چڑھ آنے پر گہری نیند سے میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ میرے گھر کے دروازے اسی طرح چوپٹ کھلے پڑے تھے اور سارا سامان غائب تھا —— !!!

رؤف رحیم

گلشنِ دل میں جگہ دو نہ کبھی نفرت کو ——— ایک شعلہ کئی بار گھر جلا دیتا ہے

کانٹے کیوں بوتے ہو پھولنے پھلنے دو چمن ——— پیڑ بڑھتا ہے تو سایہ بھی گھنا دیتا ہے

کرم فرما

نورجہاں انجم (عمرکھیڑ)

"اردو کتابوں کی قومی نمائش کے اس مستحسن اقدام پر میں اردو اکاڈیمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور یہ یقین دلاتا ہوں کہ اردو کی ترقی و ترویج کیلئے میں اکاڈیمی کے ساتھ ہر طرح کی معاونت کیلئے ہمیشہ تیار رہوں گا۔ ساتھ ہی عوام سے اور خصوصاً اردو دوستوں سے میری پرزور گذارش ہے کہ وہ اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے کے ساتھ ساتھ اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنے کی کوشش کریں۔ کسی اردو کے چاہنے والے کا گھر اردو کتابوں اور اخبارات سے خالی نہیں ہونا چاہیئے۔ اور...... اور بھائیو! ہمارے لئے یہ ایک بڑا سانحہ ہے کہ ایک طرف تو ہم اردو کی بقا کے لئے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف خود ہم ہی اردو کے قاتل بھی ہیں۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ اردو کے کتنے ہی اخبارات و رسائل ایسے ہیں، جو چند گام چل کر ہی دم توڑ دیتے ہیں اور اس کا سبب محض یہ ہوتا ہے کہ خریداروں اور ایجنٹ حضرات پر ہزاروں روپے واجب الادا رہتے ہیں۔ اخبار کچھ دن خسارے میں چلتا اور ایک دن بند ہو جاتا ہے!!"

ان الفاظ کے ساتھ مولوی بہادر علی خان نیازی وزیر مملکت نے اکاڈیمی کی جانب سے منعقدہ اردو کتابوں کی قومی نمائش کا افتتاح کیا۔ موصوف کی اس ولولہ انگیز تقریر کا اخبارات کے مدیروں، نمائندوں، نامہ نگاروں اور دیگر اردو دوستوں اور عوام پر اچھا اثر ہوا۔ دوسرے دن اخبارات میں جلی سرخیوں اور تصویر کے ساتھ موصوف کی یہ تقریر شائع ہوئی۔ اردو حلقے میں مولوی صاحب اپنی اردو نوازی کیلئے کافی مشہور ہو گئے۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اپنے ماہنامہ "المجاہد" کیلئے انہیں انٹرویو کیلئے تیار کرلیا۔

پروگرام کے مطابق میں بہادر علی خان نیازی وزیر مملکت کے مکان پر گیا۔ مولوی صاحب ہمہ تن انتظار تھے۔ غالباً کسی اخبار کے لئے یہ ان کا پہلا انٹرویو تھا۔ وقت مقررہ پر مجھے پاکر بڑے خوش ہوئے کہنے لگے ہم نے بہت کم نوجوانوں کو اس قدر وقت کا پابند پایا۔ پھر تفصیل تعارف کے بعد مولوی صاحب نے انتہائی پرتکلف ناشتہ کروایا۔

ہم نے اردو سے متعلق کئی موضوعات پر سوالات کئے۔ مولوی صاحب نے تمام سوالات کے خاطر خواہ جوابات دیئے۔ ہم بہت متاثر ہوئے۔ ایسا لگتا تھا کہ مولوی صاحب گویا کسی رسالہ کے مدیر رہ چکے ہیں، کیونکہ موصوف کی گفتگو میں بالکل تقریر کی طرح ایک ہی بات کی تکرار زیادہ تھی کہ صاحب عوام تک میرا یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ اخبارات خرید کر پڑھیں اور ایجنٹ حضرات کو بل برابر دیا کریں۔ ادارے کو رقم وقت پر ادا کر دینا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

ہم بہت دیر سے مولوی صاحب کے کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہمیں کہیں کوئی رسالہ یا اخبار نظر نہ آیا۔ آخر ہم نے

اپنا آخری سوال کیا: "مولوی صاحب، آپ کن کن اخبارات و رسائل کے خریدار ہیں"؟ ہمارے اس سوال پر مولوی صاحب اس طرح چونکے گویا انہیں ہم سے اس گستاخی کی توقع نہ تھی۔ کہنے لگے "بھئی! اسلمی صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ ہم.... شہر کی لائبریری میں تو کئی اخبارات کا نہایت پابندی سے مطالعہ کرتے آ رہے ہیں"

ہم نے وضاحت کی "مولوی صاحب ہمارا مطلب ہے کہ آپ خود بھی تو کچھ رسائل کے خریدار ہوں گے"!

مولوی صاحب کو فوراً یاد آیا کہنے لگے "ہاں صاحب ہم ایک رسالہ جو لکھنؤ سے نکلا کرتا تھا "ہفت روزہ 'زیارت'" اسکے خریدار رہ چکے ہیں۔ لیکن بھئی آج کل وہ رسالہ بند ہو گیا ہے"۔

ہمیں بڑا تعجب ہوا کیونکہ ہم خود "زیارت" کے ادارے میں کام کر چکے تھے۔ ہم نے کہا مولوی صاحب "زیارت" آپ جس المیہ کا ذکر کر رہے تھے اسی کا شکار رسالہ ہے یعنی وہی دم توڑنے والی بات۔ مولوی صاحب نے افسوس کا اظہار کیا۔ ہماری دلچسپی بڑھنے لگی۔ ہم نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ "زیارت" کی کوئی پرانی کاپی ہو تو ہمیں دیں۔ مولوی صاحب نے ایک پرانی کاپی لاکر دی پرچہ جس طرح ڈاک خانے سے سال بھر پہلے آیا تھا اسی حال میں ابھی تک محفوظ تھا۔ پتہ اور خریداری نمبر کی چٹ اس پر چسپاں تھی۔ پرچہ لے کر ہم گھر آ گئے۔

ہفت روزہ "زیارت" اپنے جن کرم فرماؤں کی مہربانیوں کے نتیجے میں خسارے میں آکر بند ہو گیا تھا ان کا ریکارڈ ہمارے پاس موجود تھا کیونکہ ہم اس ادارے میں سرکولیشن منیجر تھے۔ ہم نے اس کا پرانا ریکارڈ نکالا۔ مولوی یاور علی خاں نیازی صاحب کا خریداری نمبر تلاش کیا۔ ہم دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ مولوی صاحب بھی ہفت روزہ زیارت کے کرم فرماؤں میں پیش پیش ہیں۔ موصوف نے تین سال سے چندہ روانہ نہیں کیا تھا محض ان کی شخصیت سے حسن ظن کی بنا پر پرچہ جاری رہا۔ اب ان کی تقریر کے وہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"ایک طرف تو ہم اردو کی بقا کے لئے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف خود ہم ہی اردو کے قاتل ہیں...."
واقعی مولوی صاحب نے بڑی سچی بات کہی۔

دراصل ایسی کتنی ہی باتیں ہوتی ہیں جو ہم دوسروں کے لئے کہتے ہیں، لیکن جن کے اصل اور اوّل مخاطب ہم خود ہی ہوتے ہیں۔ اور..... اور..... اب ہم اسی فکر میں تھے کہ انٹرویو کے ساتھ "المجاہد" میں مولوی صاحب کی ایک شاندار تصویر بھی شائع کی جائے۔

آٹھواں پنکھا

شبیب احمد کاف، بی ایس سی
۲۱ - اولڈ جیل روڈ مدراس

وہ جب کبھی مسجد کو جاتا وہ خالی جگہ اسے ایک چوٹ دیتی۔ اس چھوٹی سی مسجد میں کل سات پنکھے تھے۔ ہونے آٹھ تھے لیکن ایک پنکھا کم تھا۔ دو دو کی تین قطاریں اور چوتھی قطار کیلئے ایک اور پنکھا درکار تھا۔ عام دنوں میں تو صرف پہلی قطار کے دو پنکھے چلتے رہتے۔ باقی پانچ پنکھوں کو مکمل آرام ملتا۔ لیکن جمعہ کے دن نمازی برسات کے پتنگوں کی طرح آجاتے اور مسجد بھر جاتی۔ اس دن ساتوں پنکھوں کو پورا پورا کام کرنا پڑتا اور کبھی کبھی تو اوور ٹائم بھی ہوجاتا۔ لیکن آٹھویں پنکھے کی خالی جگہ دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ مسجد لنگڑی لولی یا کانی ہے۔ پورے چار سال سے وہ دیکھتا آرہا ہے کہ یہ جگہ خالی ہی تھی۔ جمعہ کے وقت عام طور پر دھوپ اور گرمی عروج پر ہوتے ہیں۔ پھر نمازیوں کی تعداد اور تپش بڑی ہے۔ خطیبوں اور اماموں کا جوش بھی جمعہ کے وقت دیکھنے کا ہوتا ہے۔ خطیبوں کے خطبے طویل ہوجاتے ہیں اور اماموں کی نمازیں طویل تر۔ ادھر بے چارے برسات کے پتنگے دو دو طرح سے بے قرار ہوجاتے۔ [illegible] سمجھ آئے ہوتے۔ کچھ یہ سوچ کر کہ جمعہ بھی نہ پڑھیں تو جنت ہرگز نہیں ملے گی۔ کچھ اس خیال سے کہ نسلی مسلمانوں کو جمعہ تو ضرور پڑھنا چاہیے۔ یہ تو ہوئی ایک طرح کی بے قراری۔ دوسری بے چینی گرمی کی وجہ سے ہوتی۔ اس آٹھویں پنکھے کی خالی جگہ پر کھڑے ہونے والے نمازیوں کا عجیب حال ہوتا تھا۔ کوئی نماز میں ہی سسکاریاں بھرتا۔ کوئی ایک ہاتھ باندھے رکھتا اور دوسرے ہاتھ میں رومال لئے گردن اور چہرے کا پسینہ پونچھتا جاتا۔ خطبے کے دوران کوئی دوسرے پنکھوں کی جانب حسرت سے دیکھے جاتا کوئی بیٹھے بیٹھے پلان بناتا کہ خطبہ ختم ہوتے ہی دھکم پیل کا سہارا لے کر کسی پنکھے کے نیچے کھڑا ہوجائے لیکن اس ارادہ میں دو ایک ہی کامیاب ہو پاتے کیونکہ جو نمازی ان پنکھوں کے نیچے بیٹھے ہوتے وہ تو پہلے ہی سے تہیہ کرکے آئے ہوتے جونہی خطبہ ختم ہوتا اپنی اپنی جگہ دیواروں اور چٹانوں کی طرح جم جاتے اور جنھیں پنکھے کے نیچے جگہ میسر نہ ہوتی وہ اپنے آپ کو یوں بہلاتے جاتے کہ جتنی حرارت اور تپش وہ دوران نماز برداشت کرینگے ثواب اتنا زیادہ ملے گا۔ زیربرداشت کریں گے ثواب اتنا زیادہ ملے گا۔

بہرحال پچھلے چار سال سے وہ برابر دیکھ رہا تھا کہ آٹھویں پنکھے کی جگہ خالی ہے وہ سوچتا کہ کیا اس محلّے کے اور بے شعور حضرات میں اتنا شعور بھی نہیں کہ ساڑھے تین چار سو کا ایک پنکھا خرید لیں۔ اس نے محلّہ والوں

سروے کیا تو پتہ چلا کہ کل ایک سو بیاسی مکانات ہیں جو مسلمانوں کے کہلاتے ہیں اور ان میں اوسطاً پانچ افراد فی مکان۔ اب اگر ایک ایک فرد چالیس پیسے جمع کر دے تو پنکھا خریدا جا سکتا تھا۔ پھر یہ لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ وہ اکثر سوچتا اور سوچتا ہی رہتا کہ اس کے دورے کا دن آجاتا اور وہ شہر سے باہر چلا جاتا۔ اور ایک بار جو باہر گیا تو تین چار ماہ واپسی میں لگ جاتے اور واپسی کے بعد اسی سوچ بچار میں ہوتا کہ پنکھے کی خریداری کا کیا راستہ نکالا جائے۔ اس کا اپنا وقت ختم ہو جاتا اور دورے پر اسے پھر نکل جانا پڑتا۔ یوں پورے چار سال نکل گئے۔ نہ محلے والوں نے کچھ کیا اور نہ خود اس نے۔

اس بار وہ تھوڑی لمبی چھٹیاں لے کر آیا تھا۔ مسجد گیا تو حسب معمول آٹھویں پنکھے کی جگہ خالی تھی۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے وہ ایک پنکھا مسجد کو خرید کر دے دے گا ــــــــ اس سلسلے میں اپنے قریبی دوستوں سے پہلے مشورہ کرنا مناسب سمجھا۔ بیس پچیس کر کے آٹھ دس دوستوں سے بھی کچھ رقم مل جائے تو باقی وہ خود لگا لے گا پہلے دن وہ دو دوستوں سے ملا۔ دونوں بخوشی راضی ہو گئے اور تنخواہ کے دن ملنے کو کہا۔ وہ ایک اور دوست کے پاس جا رہا تھا کہ راستے میں اس کے بچپن کے دوست عبدالرزاق سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں پورے گیارہ سال بعد مل رہے تھے۔ عبدالرزاق زبردستی اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس نے دیکھا کہ گھر کی ہر شئے سے افلاس ٹپکا پڑ رہا ہے۔ دیوار اور دریچے مفلسی کے غماز ہیں عبدالرزاق نے اسے بتایا کہ اسکی شادی چھ سال پہلے ہوئی تھی اور ہر سال ایک ایک بچہ اسے عطا ہوتا گیا تھا۔ شادی سے پہلے جو ملازمت تھی ہڑتال میں حصہ لینے کے باعث چھوٹ گئی۔ اب وہ کچھ نہ کچھ کر کے بچوں کو کھلا اور پڑھا رہا ہے لاکھ تکلیف اور ہزار رنج کے باوجود عبدالرزاق یہ اہتمام کر رہا تھا کہ ہر بچہ دین اور دنیا دونوں کی تعلیمات سے بہرہ ور ہو جائے اس کے لئے شام کے اوقات میں مولوی صاحب کا انتظام کیا تھا جو بچوں کو قرآن و دینیات اور اردو کی تعلیم دیتے تھے اور دنیاوی اغراض کیلئے اچھے اسکولوں میں بچوں کا داخلہ کروا دیا تھا۔ عبدالرزاق نے اس سے کہا کہ یہ بچے پڑھ لکھ کر کچھ بن جائیں گے تو اس کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔

"بے چارہ عبدالرزاق" اس نے سوچا تھا۔ صرف پینتیس (۳۵) سال کی عمر اور کوئی دکھ ایسا نہ تھا جس سے اسکی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ معاً اسے گرمی کا احساس ہوا اور وہ بول پڑا تھا۔ "ارے بھئی عبدالرزاق! ذرا پنکھا چلا دو بہت حبس ہے" لیکن عبدالرزاق بیٹھا مسکراتا رہا تھا۔ عجیب سی مسکراہٹ تھی اسکی اور دنیا جہاں کا درد سموئے۔ اس نے بے خیالی میں اوپر دیکھا۔ وہاں پنکھا نہیں تھا۔ ٹیبل تلاش کیا۔ ٹیبل تھا ہی نہیں۔ عبدالرزاق نے کہا۔
"دوست! تم نے پنکھے کی بات چھیڑ کے گویا میری دکھتی رگ پر چاقو رکھ دیا ہے۔ تین وقت کے کھانوں کا اللہ میاں انتظام کر دیتے ہیں۔ کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ سال بھر میں دو تین جوڑے ہر بچے کو سلوا دیتا ہوں۔ لیکن ایک پنکھے کا انتظام مجھ سے نہ ہو سکا ہے۔ گزشتہ چار سال سے میں سوچ رہا ہوں۔ ایک بار تو دو سو روپیوں کے قریب میں نے

پیس اخراز کر ہی لئے لیکن بیگم صاحبہ کی کمر میں درد شروع ہو گیا۔ یہ روپے گھس گئے اور ایک ننھا اور آ گیا۔ اس کے بعد سے مہنگائی نے پنکھے کے خیال کو ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا۔ راتوں میں بچے جاگ جاتے ہیں۔ گلی میں گندے پانی کی موری ہے وہاں سے مچھر آ جاتے ہیں انہیں کاٹنے لگتے ہیں۔ میں اور میری بیگم بچوں کو دستی پنکھے جھلاتے رہتے ہیں۔ گھنٹوں۔ کہ بچے سو جائیں۔ صبح انہیں اسکول جانا ہے۔ بچے جوں توں سو جاتے ہیں لیکن میرے دل پر آریاں چل جاتی ہیں۔ کبھی اپنے جنم کو کوستا ہوں۔ کبھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تین وقت کی عزت کی روٹی کھلا رہا ہے۔ یہ کہتے کہتے عبدالرزاق کی آواز بھر آگئی۔ پتہ نہیں کتنے سارے غموں کی بھڑاس تھی جس نے عبدالرزاق کی آواز کو متغیر کر دیا تھا

وہ عبدالرزاق کے پاس سے چلا آیا تھا۔ عبدالرزاق اس کے بچپن کا ساتھی تھا لیکن یہ تو ہوتا آیا ہے کہ بچپن کے ساتھی جوانی میں بچھڑ جاتے ہیں اور کبھی کبھار بڑھاپے میں مل جاتے ہیں۔ جوانی میں کسی کو کسی کا سننے سمجھنے کی فرصت نہیں ہوتی اور بڑھاپے میں کچھ دکھوں کا علاج ہو چکا ہوتا ہے یا لوگ دکھوں کو اپنا لیتے ہیں۔ انہیں دکھ پرائے نہیں اپنے سگے لگتے ہیں۔ وہ بھی جوان تھا۔ عبدالرزاق کے جیسے دکھ اس نے بہت سارے سن رکھے تھے۔ پہلے پہل تو وہ بھی دکھی ہوتا تھا انہیں سن کر۔ لیکن جب دکھوں کی تعداد بڑھتی گئی تو ان کا اثر ختم ہو گیا۔ اسے عبدالرزاق کا حال سنکر بہت تکلیف ہوئی تھی لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ ایک مسجد کے پنکھے کیلئے چار سال کی سوچ کے بعد آج وہ کچھ کرنے کو نکلا تھا کہ یہ دوسرا پنکھا نمودار ہو گیا تھا۔ اب اس کیلئے چار سال لگینگے۔ اس نے سر کو جھٹک دیا۔ تنخواہ پر پورے چھ سو چالیس روپے مسجد کے پنکھے کی مد میں اس نے اپنی جیب سے لگائے اور ایک خوبصورت پنکھا خرید لیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اور جلد سے جلد یہ پنکھا مسجد کی نذر کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ایک ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب محلے کے سارے آدمی اکٹھے ہوں اور سب کے سامنے وہ یہ پنکھا پیش کرے۔ اس نے جمعہ کے دن ہی یہ کام کر دینا چاہا لیکن اس دن لوگ جلدی میں ہوتے ہیں۔ نماز میں جتنے آدمی ہوتے ہیں نماز کے بعد دو ہی منٹوں میں ان میں سے ٪۹۵ مسجد سے باہر ہوتے ہیں اور نماز سے پہلے صرف پانچ منٹ پہلے یہ ٪۹۵ مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ تو پھر کونسا ایسا موقع ہو جس میں اس واقعہ کی خوب پبلسٹی ہو اور سارے محلے میں اس کا نام روشن ہو جائے۔ اس موقع کی تلاش نے اسکی چھٹیاں نگل لیں اور وہ پنکھا اپنے گھر میں رکھکر دورے پر چلا گیا۔

اس بار اسے ایک چھوٹے سے شہر میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں وہ پہلی بار جا رہا تھا۔ بس اسٹانڈ سے اتر کر وہ شہر کے واحد "لاج" میں پہونچا۔ کمرہ لیا خستہ حال دیوار و در۔ بوسیدہ فرنیچر۔ میلا بستر۔ اس کا منہ تو بن گیا۔ لیکن اسے یہیں قیام کرنا تھا۔ اتنا تو غنیمت تھا کہ کمرے میں پنکھا موجود تھا جو چل بھی رہا تھا۔ اس نے پنکھے کو پوری رفتار پر لگا دیا اور لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی نیند آ گئی لیکن دس منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ اسکی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ بلب جلتا

چھوڑ کر سویا تھا۔ پھر یہ اندھیرا۔۔۔۔؟ جب ہی اسے احساس ہوا کہ پنکھا بھی چل نہیں رہا ہے۔ تکیے کے پاس رکھی ماچس اس نے جلائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ پورے لاڈج میں سناٹا تھا۔ ٹٹولتا ہوا وہ لاج کے اس شخص تک پہونچا جو منیجر کہلاتا تھا۔ وہ بے سدھ سو رہا تھا۔ اس نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ منیجر اٹھ بیٹھا اور حال دریافت کیا۔ اس نے پوچھا پاور کو کیا ہوا۔ منیجر نے شائد اندھیرے میں اسے گھور کر دیکھا اور دل میں گالی بھی دی تھی لیکن اس کے چہرے مہرے اور لباس سے چونکہ وہ پہلے سے مرعوب تھا اس لئے نرم لہجے میں کہا دیکھئے صاحب! یہ یہاں کا معمول ہے! دس پندرہ منٹ میں کرنٹ آجائے گا آپ اپنے کمرے میں جائیے۔" پھر وہ پلٹ کر سو گیا۔

طوعاً و کرہاً وہ واپس کمرے میں آیا۔ دروازہ بند کیا۔ لیکن دو ہی منٹوں بعد اسے دروازہ کھول دینا پڑا۔ کیونکہ تقریباً دو ڈھائی سو مچھر اس کے کمرے میں کھڑکی کے راستے سے گھس آئے تھے اور اس کے بدن کو بڑے چاؤ سے چاٹ رہے تھے وہ کھڑکی تک گیا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ اندھیرے کے باوجود اسے گندے پانی کا نالہ نظر آگیا۔ اس نے پھٹاک سے کھڑکی بند کر دی لیکن اندر موجود مچھروں کو کیا کرے۔ اسکی ترکیب اس نے یہ نکالی کہ اخبار ہلا ہلا کر بیشتر مچھروں کو باہر کی راہ دکھائی اور جب مچھروں کی یلغار ختم ہوتی محسوس ہوتی تو دروازہ بند کر کے لیٹ گیا ۔۔ لیکن صرف پانچ منٹ۔ ان پانچ منٹوں میں اسکی بنیان بھیگ چکی تھی۔ اس نے بنیان نکال کر پھینکی اور لنگی کو موڑ کر گھٹنوں کے اوپر باندھ لیا۔ لیکن کھڑکی اور دروازہ کے سوراخوں سے در آنے والے مچھر اب اسکے جسم کے ننگے حصوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ وہ بے اختیار چیخ اٹھا "منیجر" لیکن منیجر تک اسکی آواز پہونچی نہیں یا وہ سنکر انجان بن گیا تھا۔ منیجر نے دس پندرہ منٹوں کی بات کی تھی لیکن وہ گھنٹوں بیٹھا رہا کبھی کمرے کے باہر کبھی اندر۔ کبھی اخبار ہلا ہلا کر مچھروں کو بھگاتا ہوا۔ کبھی اپنے ادھ ننگے بدن کو اسی اخبار سے سہلاتا ہوا۔ اور ایسے میں ایک مرغے نے کہیں بانگ دی اور مچھر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ جب اس نے دروازہ اور کھڑکی کو کھول دیا۔ نسیم سحر نے اسے تھپکیاں دیں اور شب غم کا مارا سو گیا۔

آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ شیو بنانے کیلئے اس نے چہرہ آئینے میں دیکھا۔ جا بجا پھنسیاں سی اگ آئی تھیں اور چہرہ لال ہو رہا تھا اس نے بدن پر نظر دوڑائی۔ سارے جسم کا یہی حال تھا۔ وہ سن بیٹھ گیا۔ اور جب اس کے دماغ میں بجلی سی دوڑی۔ وہ نہا دھو کر تیار ہوا۔ دفتر کو دو دن کی ایمرجنسی چھٹی لکھ بھیجی اور سیدھے اپنے شہر پہونچ گیا۔ گھر جاکر منہ ہاتھ دھوئے بنا اس نے وہ پنکھا ہاتھوں میں اٹھایا اور تقریباً دوڑتا ہوا عبدالرزاق کے گھر پہونچا۔ دستک دی عبدالرزاق باہر آیا۔ عبدالرزاق سے علیک سلیک کے بغیر ہی وہ پنکھا اس کے ہاتھوں میں تھما دیا اور پچیس روپے "فٹنگ چارج" بھی اس کے ہاتھوں میں رکھ دیئے۔ اور چپ چاپ چلا آیا۔

عبدالرزاق ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔

غزلیں

عزیز بگھروی

لکھے جو گل کو زخم لہو کو حنا کہے
فنکار اب اسی کو زمانہ بڑا کہے

کیا انقلابِ وقت ہے ہم چاہتے ہیں اب
روداد غم ہماری کوئی دوسرا کہے

خاطر میں بھی خدا کو نہ لائے یہ آدمی
آئے نواز نے پہ تو بت کو خدا کہے

تسلیم کیوں اسے کوئی اہل نظر کرے
سارا جہاں روا کو اگر نا روا کہے

بدلیں گے ہم نہ اپنے مذاق سخن کا رنگ
ناقد ہزار قاتلِ حرف و نوا کہے

نا معتبر ہیں وہم و گماں کے تمام نقش
ہے معتبر وہ عکس جسے آئینہ کہے

شکلیں ہیں سب کی ایک ہی کردار ایک سا
کس کو حریف کس کو کوئی ہمنوا کہے

اک اجنبی کہے تو عزیز اس کا غم نہیں
ترک وفا کی بات جو غم آشنا کہے

بات اپنی کرے یا پرائی کرے
آدمی سوچ کر لب کشائی کرے

کوئی کرنے کو یوں خودستائی کرے
بات جب ہے زمانہ بڑائی کرے

منہ پہ تعریف پیچھے برائی کرے
ہمنوا بھی لگائی بجھائی کرے

حق سے الفت بھی ہے آدمی کو بہت
بات حق کی کہو تو لڑائی کرے

بند آنکھیں نہ کھولے زمانہ اگر
خضر بھی اس کی کیا رہنمائی کرے

نیک و بد میں نہیں فرق کوئی یہاں
وہ بھی مخلص ہے جو بے وفائی کرے

کس قدر اوج پر ہے ستارہ ترا
ہر مخالف تری ہمنوائی کرے

مل کے رہنے کا ہم فیصلہ تو کریں
کس میں ہمت ہے ہم میں جدائی کرے

سرفرازی سے محروم اک حکمراں
اک فقیری میں فرمانروائی کرے

ہو سکوں دل کو حاصل تو چپ ہے عزیز
چوٹ کھائے تو نغمہ سرائی کرے

غزلیں

رؤف خیر

رستے میں تو خطرات کی سن گن بھی بہت ہے
منزل پہ پہنچنے کی ہمیں دھن بھی بہت ہے

ہر شہر میں تازہ ہے تو بس زخم تعصب
کچھ لذت ناخن کا تعاون بھی بہت ہے

کچھ ہاتھوں سے کچھ ہاتھوں سے کالک نہیں جاتی
ہر چند کہ بازار میں صابن بھی بہت ہے

وہ ہاتھ تحفظ کی علامت جسے کہیے
محسوس یہ ہوتا ہے وہی شُن بھی بہت ہے

اک جسم کے مانند ہیں ہم لوگ؛ کہیں ہوں
ٹھوکر سے اکھڑتا ہے تو ناخن بھی بہت ہے

ہم شعر کہا کرتے ہیں وجدان کے بل پر
کچھ لوگوں کو زعم فعلاتن بھی بہت ہے

گماں گزرتا ہے گم کردہ راہ بھی میں ہوں
کہ اس تولح میں اک بے پناہ بھی میں ہوں

یہ لوگ کس لئے شاکی ہیں منصفی سے تری
خلاف اپنے حقیقی گواہ بھی میں ہوں کہ

یہ اور بات کہ آنکھیں ہیں آسماں کی طرف
ہلاک حرفِ سفید و سیاہ بھی میں ہوں

ملال یہ ہے کہ تو سوجھتا نہیں مجھ کو
کمال یہ ہے کہ تیری نگاہ بھی میں ہوں

وہی ہوں میں، نہ چلا سحر سامری جس پر
عصائے معرکۂ لاالہ بھی میں ہوں

تمہیں خبر نہیں شب خون مارنے والو
جو ابرہہ سے لڑی وہ سپاہ بھی میں ہوں

تمہیں بھی خیر سے دعویٰ ہے بادشاہی کا
تمہیں خبر ہو کہ اک کج کلاہ بھی میں ہوں

ابوہارون مجاہد اعظمی
مرزاپور، اعظم گڑھ

غزل

نہ پوچھو رہتے ہیں، کانٹوں کے درمیاں کیسے
قفس میں رہ کے بھی رکھتے ہیں دل جواں کیسے

جلائے بیٹھے ہیں، کسطرح سے دلوں کے چراغ
ہوئے ہیں باد حوادث میں کامراں کیسے

یہ پوچھتا ہے مجھے زور دست قاتل سے
تڑپ رہی ابھی لاش ناتواں کیسے

جلا سکے نہ جنھیں شعلہ ہائے برق و شرر
ہے دیکھنا کہ وہ ہوتے ہیں آشیاں کیسے

نہیں ہے نرگس غماز کی اگر سازش
نظر نظر میں ہیں رقصاں یہ بجلیاں کیسے

حریم حسن کو ہے عشق کی وفا مطلوب
یہ دیکھنا ہے کہ ہوتا ہے امتحاں کیسے

بہت لطیف ہیں شبنم کے شبنمی بو سے
دکھائیں لالہ و گل زخم خونچکاں کیسے

قفس نصیب ہے حکم آشیاں بندی
بنائے شاخ نشیمن پہ آشیاں کیسے

فریب خوردہ نسیم سحر، اسیر بہار
سنائے تمکو بہاروں کی داستاں کیسے

قفس کے بیچ کھلی ہیں یہ بدگہر آنکھیں
خبر نہیں ہے کہ ہوتے ہیں آشیاں کیسے

شب سیاہ کے سائے ابھی گھنیرے ہیں
چمن میں گونجے گی آوازۂ اذاں کیسے

ملے ہے کوہ گراں کو سکوں، بلا سے ملے
کرے سکوت مگر مور ناتواں کیسے

جگر ہوا ہے مجاہد کا آہ سیپارہ
غزل سنا کے کرے تمکو شادماں کیسے

سکونِ دل

یہ بحرِ بے کراں، ساحل کہاں ہے
یہ محفل، عشق کا حاصل کہاں ہے

کسک میں درد میں سوز دروں میں
یہیں ڈھونڈو، سکونِ دل کہاں ہے

جاوید

غزلیں

ثاقب عباسی (دہلی)
۹۷۲ کشن گنج۔ (تیلیواڑہ)

دستورِ بندگی نہ رہا زندگی کے ساتھ
یہ حادثہ ہے کتنا بڑا آدمی کے ساتھ

کس کام کا کلیم کے وہ مردِ حق نوا
جس کے ہوں سب قوائے عمل ساحری کے ساتھ

برسوں کے ہمسفر ہیں مگر یوں ہیں دور دور
جیسے وہ چل رہے ہوں کسی اجنبی کے ساتھ

پُرنور تم سے بزم ہو ارماں اگر ہے یہ
مثلِ چراغ جلتے رہو خامشی کے ساتھ

رکھا تھا جس کے سر پہ کبھی میں نے تاجِ زر
آج اس کے سامنے ہوں کھڑا بے بسی کے ساتھ

میں منہ کے بل گرا ہوں تو کیوں ہنس رہے ہیں لوگ
دائم نہیں رہا ہے زمانہ کسی کے ساتھ

ثاقب یہ سادہ لوح پتنگے کدھر کو جائیں
ہے سازباز شمع کی جب تیرگی کے ساتھ

(شاعر)

اپنے الفاظ کو تو جان کے بیکار نہ بیچ
بیش قیمت ہیں جواہر کے یہ انبار نہ بیچ

دیکھ شاعر! بڑی قیمت ہے قلم کی تیرے
خاک کے نرخ اسے تو سرِ بازار نہ بیچ

فنِ زریں سے ترے خدمتِ باطل تو یہ
کھوٹے سکوں کے عوض دولتِ افکار نہ بیچ

مرے فنکار نہ کر رقص درِ شیطاں پر
عزتِ نفس نہ کھو، جوہرِ کردار نہ بیچ

کس نے بخشا ہے یہ فن کس لئے بخشا ہے یہ ذوق
عقل سے کام لے تاجر نہ بن، اشعار نہ بیچ

غلبۂ حق کیلئے ہے تری تاثیرِ کلام
اپنا اعجازِ سخن مفت میں زنہار نہ بیچ

ترے سینے میں امانت ہے کسی کی ثاقب
کتنے ہی تجھ کو ملیں دل کے خریدار نہ بیچ

تبصرے ـــ رحمت یوسف زئی

(تبصرے کیلئے کتاب کے دو نسخوں کا ملنا ضروری ہے)

یادوں کی مہک ـــــــــ ڈاکٹر اکبر یوسفی

ڈاکٹر اکبر یوسفی سے میں کافی عرصے سے واقف ہوں ۔ حیدرآباد کی ایک اہم ادبی انجمن اقلیم ادب کا سکریٹری ہونے کے ناطے مجھے انکی رفاقت بھی حاصل رہی ـــــ اور میں نے انہیں مخلص پایا ۔ گولکنڈہ کی جواہر خیز سرزمین کا یہ سپوت سادگی کا پیکر ہے ۔ بقول شاذ تمکنت مرحوم "حیوانات کا ڈاکٹر" اور "حیوان ناطق کا شاعر" اکبر یوسفی کھلتے ہوئے شگوفوں سے امڈتی ہوئی یادوں کی مہک لئے احساس کے جھروکوں میں روشنی کی کرنیں بکھیر رہا ہے ۔ اکبر یوسفی کے پاس فن بھی ہے اور جامع اظہار کی صلاحیت بھی ۔ یہ اور بات ہے کہ فکر روزگار نے انہیں ادبی حلقوں سے دور کر دیا ہے لیکن وہ کسک جو شاعر کی بیش قیمت دولت ہے، اس کسک سے اکبر یوسفی مالامال ہیں ۔ لب و لہجہ میں عصر حاضر کی چبھن جا بجا نمایاں نظر آتی ہے زندگی کی کشاکش اپنی پوری تابانی کے ساتھ اکبر یوسفی کے کلام میں جلوہ افروز ہے ۔ ؎

چند الجھے ہوئے خوابوں سے نکل آئی ہے ـــ زندگانی تو کتابوں سے نکل آئی ہے۔

صلیب زندگی جب تک ہے باقی ـــ ضمیر آدمیت بے زباں ہے ۔

زندگی اوڑھ کر بے خودی کا کفن ـــ توڑ کر حسرتوں کا بھرم سو گئی ۔

اکبر یوسفی نے روایت سے کنارہ کشی نہیں کی ۔ وہ روایت کو اپنا کر بھی اپنے لئے نئی راہوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہیں ۔ سفر طویل ہے ۔ لیکن "بقول کرن کلیانی .... اکبر یوسفی اپنے شعری سفر پر بڑے والہانہ انداز میں جھومتے ہوئے گذر رہے ہیں ـــ" بظاہر وہ غزل کے شاعر ہیں ۔ غزل کے میدان میں انہوں نے اپنے آپ کو پیش کرنے کی کاوش کی ہے ۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند جین انہیں غزل سے زیادہ نظم کا شاعر مانتے ہیں اور شاذ تمکنت مرحوم نے بھی ان کی رائے پر صاد کیا ہے ۔ اتنی معتبر آرا کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے ۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اکبر یوسفی کے پاس جو اظہار ہے وہ غزل سے زیادہ نظم کا متقاضی ہے ۔ آئینہ ریت کی پیاس، جستجو کا سفر، تمنا کی راکھ آرزو کا جھولنا اور کتنی ہی ایسی نظمیں ہیں جہاں اکبر یوسفی کے دل کی کسک قاری کو بھی محسوس ہونے لگتی ہے ۔ اس اعتبار سے اکبر یوسفی کا انتساب خود ایک مکمل نظم ہے ۔ ؎

اس کسک کے نام
گل کے رخسار پہ چل کے
جو شبنم کے پیکر میں ڈھل کے
مہک کا جواز بنتی ہے ۔

لیکن صرف نظم ہی نہیں ــــ اکبر یوسفی نے غزل کو بھی خوب تر کہا ہے ۔ چند شعر پیش ہیں

"دشمنی جتنی ستم ڈھائے گوارہ ہے مگر ــــ دوست کے ہاتھ میں خنجر نہیں دیکھے جاتے ۔

ہم تمناؤں کی ڈولی کو گرا کر کھنڈ میں ــــ لوٹ آئے ہیں گنہ گار کہاروں کی طرح

رات کا کرب چراغوں کے جگر سے پوچھو ــــ سونے والوں نے تو ہر خواب سنہرا دیکھا

آہ احساس کے شمشان میں جذبوں کی چتا ــــ بے بسی ضبط کے شعلوں میں گھری ہو جیسے

جذبۂ نا تمام تمناؤں کا آوارہ ہجوم ــــ کوچۂ دل کوئی بد نام گلی ہو جیسے

ٹوٹے ہوئے کاسے کو سرِ راہ ٹیک کر ــــ اک شخص بڑی دیر سے مصروف دعا ہے

اکبر یوسفی نے مفرس و معرب تراکیب سے حتی الامکان گریز کیا ہے ۔ وہ سادگی پسند ہیں ۔ بے ساختہ اظہار کے قائل ہیں ۔ اور اس سادگی و بے ساختگی میں ایک انوکھا حسن ہے ۔ بھینی بھینی یادوں کی مہک سے مشام جاں معطر کرنے کیلئے آپ کو اکبر یوسفی کے مجموعہ کلام سے مدد لینی ہوگی جو ڈیمائی سائز کے ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ طباعت و کتابت گوارہ ہے ۔ قیمت ۱۵ روپیہ رکھی گئی ہے اور اسے بشیر وارثی پبلیکیشنز حیدرآباد سے حاصل کیا جاسکتا ہے ۔

— رحمت یوسف زئی

بھارت جیوتی

علیم صبا نویدی

ھندوستان کی تاریخ میں ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کا منحوس دن ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ ہوگیا کیونکہ اس دن "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" کے مصداق اندرا گاندھی نے اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں جان دے دی یکجہتی اور سالمیت کی علمبردار، مدبّر اور ماہر فن سیاست کی موت نے اقطاعِ عالم میں ایک تہلکہ مچا دیا ۔ کون تھا جس نے اس موت پر اپنے سوگوارانہ جذبات کا اظہار نہ کیا ہو ــــ اسے خود پسندی یا تعلّی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اندرا گاندھی کی موت پر سب سے پہلی شائع ہونے والی نظم راقم الحروف کی تھی جو یکم نومبر ۸۴ء کے "منصف" روزنامہ حیدرآباد میں شائع ہوئی ۔ علیم صبا نویدی بھی ایک حساس ذہن کے حامل ہیں صرف دو ماہ کے عرصے میں انکی یہ چھوٹی سی کتاب "بھارت جیوتی" منظرِ عام پر آگئی ۔ جس میں اندرا گاندھی کی موت پر کہی گئی چار نظمیں "شہیدِ وطن" "خوشبوئے ہند" "نیا پرچار" اور "آخری رشتہ" کے علاوہ سات نظمیں ہیں ۔ یہ نظمیں بلا شبہ اس رتبہ کی ہیں کہ انہیں ترانہ کا درجہ دیا جاسکتا ہے ۔ خصوصاً "بھارت جیوتی" تو فوجی ترانہ کی حیثیت رکھتی ہے جسکا مصرعہ "ہم بھارت کے ویر جوان" پڑھتے ہوئے ایک امنگ اور ایک سرفروشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے یہی اس نظم کا خاصہ ہے ۔

علیم صبا نویدی جدید لب و لہجہ کے شاعر ہیں ۔ انہوں نے شعری تجربات بھی کئے ہیں اور جاپانی صنف ہائیکو میں بھی قلم فرسائی کی ہے ۔ ہائیکو نظموں پر ان کا ایک مجموعہ صدف آشنا میری نظر سے نہیں گزرا لیکن حال ہی میں ہائیکو نظموں کا ایک مجموعہ "ترتیلے" میں نے دیکھا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ علیم صبا نویدی کے پاس فن کی تڑپ ہے ۔ اظہار کا کرب ہے ۔ زیر نظر مجموعہ میں بھی کیفیت نمایاں نظر آئے گی ۔ شہر مدراس سے انکی محبت اختر شیرانی کی نظموں کی یاد دلاتی ہے ۔ وہی والہانہ انداز لیکن آج کے کرب میں ڈوبا ہوا تیکھا اور چبھتا ہوا لہجہ علیم صبا نویدی کی شاعری کی خصوصیت ہے ۔ یہ بند ملاحظہ کیجئے ۔

دن کے کٹتا ما دیدہ بھنور میں ڈوبی آنکھوں کی تھکن
دھوپ کی ماری ہوئی بے چاری سانسوں کی تھکن
اس کی باہوں میں اماں پاتی ہے جسموں کی تھکن

انہوں نے ساحل مدراس کی شاموں کو پر کیف نور پرور و دل نشیں بتایا ۔ ساحل مدراس گویا عیش و عشرت کا جہاں
انہوں نے ساحل مدراس کی باہوں میں ساری کائنات کو سمٹا ہوا پایا ۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں ۔

دھوپ میں تپتی سسکتی غم کی ماری کائنات

تو محسوس ہوتا ہے کہ شاعر صرف حسن ہی نہیں دیکھتا ——— وہ حسن میں بھی کرب کی لہروں کو محسوس کر لیتا ہے ۔
حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہونے کے باوجود وہ یہ کہنے کی ہمت رکھتا ہے ۔

ہماری قسمت میں اندھیرا ہے
ہم اندھیروں کے پجاری ہیں
ان ہی اندھیروں میں ہمیں رہنا ہے (دنیا پرچار)

لفظیات پر علیم صبا نویدی کو عبور ہے "قندیل نجات" "سوچ گاہوں کی حور" "کنواری کائنات" "نقرئی خواب" "اجلی سچائیوں کا دفتر" جیسی تراکیب ذہن کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں ۔ کہیں کہیں ریتی جیسے لفظ زخمی کرتے ہیں (اسکی ریتی سے نمایاں چار سو تابندہ پن) لیکن ان سے درگذر کر لیا جائے تو من حیث الکل : مجموعہ قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے شیریں نغموں سے مزین ہے ۔ کراون سائز کے ۴۴ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ کی قیمت ۵ روپے (مجلد بچے) ہے ۔ جسے ملک کے اہم مراکز کتب سے حاصل کیا جا سکتا ہے ۔

رحمت یوسف زئی
لیکچرر شعبہ اردو ۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد

تعمیری اور فلاحی ادب کا نقیب

ماہنامہ

فنکار

حیدرآباد

جلد (۳) — شمارہ (۹ و ۱۰)

ستمبر و اکتوبر
سنہ ۱۹۸۶ء

فی شمارہ	۳/۵۰	روپے
سالانہ	۴۰/=	روپے
معاونین سے	۱۰۰/=	روپے
دیگر ممالک سے	۱۵۰/=	روپے

رابطہ

ڈاکٹر احمد سجاد
طارق منزل، میریا تو ہاؤزنگ کالونی، رانچی، بہار

دفتر "فنکار"
لنگر کوٹھ، حیدرآباد - ۲

مسعود جاوید ہاشمی نے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر "دفتر" "فنکار" لنگر کوٹ حیدرآباد - ۲ سے شائع کیا

نقوش تازہ

۳

محسن انصاری

جو چراغ بجھ گئے

ایک وہ شخص جس نے ماقبل تقسیم ہندوستان میں سانس لی ہے وہ موجودہ وقت کے علمی و ادبی منظر کو دیکھ کر کچھ تاسف سا ہو جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ آج علم و ادب کی کمی ہے۔ ان کا پہلے سے کہیں زیادہ چرچا ہے بلکہ اس لئے کہ اس وقت ایک بات تھی جو اب نہیں ایک ایسی فضا تھی اور ایک ایسا معیار جو آج مفقود ہے۔ جو لوگ سرحد کو پار کر کے ارض پاکستان چلے گئے شاید وہ بھی اور جنھوں نے ترک وطن کر کے سرزمین ہند کو اپنا مسکن بنایا وہ بھی اب تک محسوس کرتے ہوں گے کہ کس طرح زندگی کا چلن بدل گیا، اپنا وطن پرایا دیس ہو گیا، اعزا و احباب جدا ہو گئے، خاندان بٹ گئے۔ جو مناظر کو دیکھ دیکھ کر بڑے ہوئے تھے وہ مناظر اوجھل ہو گئے۔ اپنے لوگوں، وہ بستیوں اور [illegible] کی صحبتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ کیا اچھا ہوا کیا برا ہوا اس کی بحث نہیں۔ پرانی صحبتوں اور پرانی باتوں کی یاد ہمیشہ باقی ہے۔ اس اتھل پتھل اور انقلاب زمانہ میں اردو زبان بھی مجروح ہوئی۔ یہ اپنی فطری قوت اور موروثی مزاج کی بدولت آج بھی ہندوستان میں پھل پھول رہی ہے ورنہ اس کے لئے حالات سازگار نہ تھے۔ آج بھی اردو بولنے والے کروڑوں ہیں۔ اردو مدارس ہیں۔ اردو مطابع ہیں۔ اشاعت گھر ہیں۔ اخبارات و رسائل ہیں اردو میں علمی مباحثے اور سیمینار ہوتے ہیں۔ مشاعرے ہوتے ہیں پمفلٹ چھپتے ہیں، پوسٹر لگتے ہیں۔ غرض اردو کوئی ٹوٹی پھوٹی کشتی نہیں بلکہ ملکی زندگی کی ہلچل میں وہ بھی برابر موجود اور اپنا حق ادا کر رہی ہے۔

قومی زندگی میں اخبارات و رسائل کی بڑی اہمیت ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ MASS MEDIA کے پردے پر ٹی وی اور ریڈیو کے ظاہر ہونے کے بعد بھی ان کی اہمیت بدستور ہے۔ اخبارات و رسائل کی ظاہراً ایک شکل بنا نہیں ہوتی ان کا ایک مزاج اور خصوصیت بھی ہوتی ہے وہ قوم کا دل ہیں۔ ان کی دھڑکنوں سے خبر و نظر اور مباحث و مسائل کی حیات ہے۔ ماقبل تقسیم کے اردو رسائل ایک سے ایک تھے جو علمی و ادبی ذوق کی آبیاری کرتے تھے اور شعر و ادب اور تہذیب و فن کا اجالا پھیلاتے تھے۔ جو روشن خیالی، جدت طرازی اور ادب و انشا کے اعلیٰ معیار کے علمبردار تھے۔ اس زمانے کے ایڈیٹر وہ خواہ روزنامہ کے ہوں یا ہفتہ وار یا ماہنامہ کے، اپنے آگے بلند نصب العین رکھتے تھے۔ اس وقت ایک نصب العین سب کے آگے موجود تھا آزادی۔ ملک و قوم کی خدمت، ایک راسخ جذبہ رکھتے تھے۔ علم و ادب کی خدمت کا۔ ایمان رکھتے تھے صداقت، انصاف اور قلم کی دیانت پر۔ وہ تارک الدنیا لوگ نہ تھے۔ باوضع و مخلص تھے تاجر نہ تھے ایڈیٹری ان کے لئے دکانداری نہیں تھی۔

لاہور آج بھی ہے۔ لاہور کل بھی تھا۔ لاہور زندہ دلان پنجاب کا قلب تھا۔ وہ اردو صحافیوں کی کارگاہ شاعروں اور ادیبوں کی انجمن اور علم دوستوں کا نگر تھا۔ اردو کے وہ رسالے نکلتے تھے جو سارے ہندوستان میں مانے جاتے تھے۔ وہ اردو زبان کی عالمگیری اور علم و تہذیب کے آئینہ دار تھے۔ میں جو کچھ لکھوں گا اپنی یادداشت اور تجربے سے لکھوں گا۔ تمام گذشتہ دور کے رسائل کا احاطہ مقصود نہیں اور میں تیسرے دہے کے نصف سے تقسیم تک اپنی نظر محدود رکھوں گا۔ غالب کے الفاظ میں گویا یہ تالیف نسخہ ہائے وفا کو الٹتا ہوں۔ سب سے پہلے جس رسالے کا خیال آتا ہے مخزن ہے۔ پنجاب کی چوٹی کے دانشور اس میں چھپتے تھے۔ علامہ اقبال کا کلام اس میں بالالتزام چھپتا تھا۔ سر عبدالقادر جو علامہ اقبال کی "بانگ درا" کے دیباچہ نگار ہیں مخزن کے مدیر تھے۔ مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کر دے : جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن "۔ :: اور ایک دوسری جگہ جن سے مخاطب ہو کر اقبال نے کہا ہے۔ اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں ۔ نفس سوختۂ شام و سحر تازہ کریں۔ اس کے شعراء میں خواجہ دل محمد، ناظر، غلام مصطفیٰ خاں، صوفی تبسم، ظفر علی خاں، غلام بھیک نیرنگ وغیرہ تھے۔ پنجاب کے تمام نقادوں اور شعراء کو یہ رسالہ اپنے دامن سے وابستہ کئے ہوئے تھا۔

لاہور سے ایک دوسرا اعلیٰ رسالہ نکلتا تھا "ہمایوں"۔ یہ جسٹس ہمایوں کی یادگار میں ان کے فرزند میاں بشیر احمد نکالتے تھے۔ حامد علی خاں اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ اپنا منفرد معیار رکھتا تھا اور رئیسانہ شان۔ اس کے سرورق پر جسٹس ہمایوں کا یہ شعر درج ہوتا تھا ہے۔ اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی : دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔ ایک خاص مضمون شاید "سیر فلک" کے عنوان سے ہوا کرتا تھا۔ "فلک پیما" کے قلم سے۔ شاید وہ کوئی عبدالعزیز تھے۔ راجہ مہدی علی خاں جو تقسیم کے بعد بمبئی کی فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئے اس میں اکثر ان کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ بعض اوقات "ہمایوں" کے صفحات پر شعراء کو مصرعۂ طرح دے کر دعوت سخن بھی دی جاتی تھی۔ ایک بار داغ کا یہ مصرعہ طرح کا مصرعہ تھا "حال دل بھی سنا کے دیکھ لیا"۔ عرش ملسیانی جو تقسیم کے بعد دہلی چلے آئے اور بزرگ شعراء میں شمار ہوتے تھے اس طرح میں ان کی غزل بہترین قرار دی گئی تھی۔ میاں بشیر احمد بھی اعلیٰ ذوق سخن رکھتے تھے۔ تقسیم سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کو ایک عصرانہ دیا تھا۔ اس میں انھوں نے ایک نظم پڑھی تھی جس کی ردیف محمد علی جناح اور قافیے کمان جان وغیرہ تھے۔ یہ نظم "ہمایوں" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک شعر خاص طور پر بہت مشہور ہوا "یہ لگتا ہے جا کے ٹھیک نشانے پہ جس کا تیر ایسی کڑی کمان ہے محمد علی جناح"۔ اس کا ٹائٹل صفحہ ہلکے گلابی رنگ کا ہوتا تھا اور جلی نستعلیق خط میں "ہمایوں" لکھا ہوتا۔ یہ شاید ۱۹۵۰ء سے بہت پہلے بند ہو چکا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میاں بشیر احمد کا ایک جوان سال بیٹا جو انگلستان میں زیر تعلیم تھا تیراکی کے ایک حادثے میں ڈوب گیا تھا جس کا انھیں از حد صدمہ تھا اور "ہمایوں" کو وہ اپنے ہی بل پر نکالتے تھے۔

تیسری دہائی میں "ادب لطیف" لاہور کا بڑا پرچا تھا۔ ادب لطیف کی اصطلاح اردو میں ان تحریروں کے لیے وضع ہوئی تھی جو ٹیگور کی گیتانجلی کے زیر اثر لکھی گئیں۔ ان میں مختصر جملے اور شاعرانہ انداز بیان ہوتا۔ ایک طرح سے یہ نثر میں شاعری تھی۔ "ادب لطیف" صرف رسالے کا نام تھا۔ وہ ادب لطیف کا ترجمان نہیں تھا۔ اس کے مضامین میں تنوع اور شاعری میں جدید رنگ تھا۔ یہ نسبتاً جوان پود کے شاعروں اور ادیبوں کا رسالہ تھا۔ مرزا ادیب جو صحرا نورد کے خطوط سے مشہور ہو چکے تھے اس کے زیادہ عرصہ مدیر رہے۔ ۱۹۴۷ء سے کچھ عرصہ پہلے مرزا ادیب اس کی ادارت چھوڑ کر بمبئی آ گئے تھے۔ شاید وہ واپس جا کر پھر اس کی ادارت کے ذمہ دار ہو گئے۔ میراجی جو تقا

پسند شعرا میں شمار ہوتے تھے مگر اپنی جنس زدہ شاعری کے لیے بدنام تھے وہ بھی ادبِ لطیف کے کچھ روز مدیر رہے۔ بہرحال یہ رسالہ وقت کے تقاضے کے عین مطابق تھا۔

لاہور سے ایک رسالہ "ادبی دنیا" نکلتا تھا۔ یہ بھی ایک اعلیٰ ادبی رسالہ تھا۔ منصور احمد اس کے مدیر تھے اس کے معاونین بھی مستند علمی و ادبی حیثیت کے اشخاص تھے۔ اس رسالے میں کسی افسانے، مضمون یا نظم کا شائع ہونا ادبی استناد تھا۔

لاہور کی ہوائیں رومان اور شعر تھا۔ میں ایک ایسے رسالے کا ذکر کر رہا ہوں جس کا نام "بہارستان" تھا اور وقت کے شاید سب سے بڑے رومانی شاعر اختر شیرانی اس کے مدیر تھے۔ اختر شیرانی مشہور محقق "پنجاب میں اردو" کے مصنف حافظ محمود شیرانی کے صاحبزادے تھے۔ افسوس کہ اختر شیرانی کی ان کے مرنے کے بعد اتنی قدر نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ یہ اردو کا ایک ہی رومانی شاعر تھا جس کی زندگی بھی رومان و شعر سے لبریز تھی۔ وہ اپنے وقت کا لارڈ بائرن تھا۔ شاعری اس کی ہر جنبشِ قلم سے پھوٹتی تھی۔ اس نے اردو شاعری میں پہلی بار معشوقہ کا نام لے کر پکارا۔ ہاں عربی شاعری میں یہ عام بات ہے۔ اختر کو یہ امتیاز حاصل ہے۔ جیسے بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں۔ سلمیٰ سے دل لگا کر۔ بدنام ہو رہا ہوں۔ سلمیٰ سے دل لگا کر یا یہی وادی ہے اے ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی۔ وہ اس جنگل کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی۔ حالانکہ اس نے شعری ہیئت میں تجربے بھی کیے مگر ردیف اور قافیے کی پابندی نہیں چھوڑی۔ اس رسالے کے نام کے متعلق کچھ۔ خلیقی دہلوی ایک اعلیٰ پائے کے ثقہ ادیب تھے جن کے مجموعہ مضامین کا نام ہے "ادبستان"۔ اختر شیرانی نے اس کا نہایت عمدہ دیباچہ لکھا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ میری شاعری کو جو رسوائیاں نصیب ہوئی ہیں وہ خلیقی سے استفادے کی بدولت۔ اس وقت ایسے نام رکھنے کا ذوق تھا مثلاً سجاد حیدر یلدرم کی کتاب کا نام ہے "خیالستان"، نیاز فتحپوری کی ایک کتاب کا نام ہے "جمالستان"۔ بہارستان کی غزلوں کے تعلق سے ایک خاص بات یہ تھی کہ ہر غزل کے ساتھ اپنا استدراک بھی اضافہ کر دیتا تھا۔ جو شعر جس خصوصیت کا حامل ہوتا وہ، اس کا ذکر کر کے داد دیتا۔ "بہارستان" بہت دنوں نہیں چلا۔

"نیرنگِ خیال" برسوں پابندی سے لاہور سے نکلتا رہا اور شائقینِ علم و ادب کے سینوں کو گرماتا رہا۔ یہ نہایت مقبول رسالہ تھا۔ اس کے مدیر حکیم سید یعسوب حسن تھے۔ اس کے سالنامے ضخیم ہوا کرتے تھے اور اس میں رنگین آرٹ کی تصویریں بھی ہوتی تھی۔ بلکہ آرٹ پیپر پر ایسی تصویریں اس کے عام پرچوں میں بھی ہوتی تھی۔

ایک اور رسالہ جو نیرنگِ خیال کی طرح مقبول تھا۔ لاہور کا "عالمگیر" تھا۔ اس میں بھی آرٹ پیپر پہ رنگین تصویریں ہوتی تھیں اور عام ناظرین کے ذوق کی تسکین کے لیے متنوع مواد ہوتا تھا۔ یہ بھی برسوں آب و تاب سے نکلتا رہا۔ عالمگیر کے سالنامے بھی ضخیم اور خاصے کی چیز ہوتے تھے۔ اچھے پڑھے لکھے لوگوں کے یہاں عموماً نیرنگِ خیال اور عالمگیر کی جلدیں پائی جاتی تھیں۔

ایک ایسے رسالے کا ذکر کرنا ہے جو اپنی شان میں منفرد تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے سرورق والا رسالہ پھر کہیں نہیں دیکھا یہ لاہور کا "شاہکار" تھا۔ یہ غیر معمولی بڑی سائز کا تھا اور اس کا سرورق بے نظیر رنگا رنگ اطلسی ڈیزائن [illegible] اور اس پہ [illegible] سنہری گرد کی چمک۔ بہت خوبصورت جاذبِ نظر سرورق رہتا۔ اس کے مدیر علامہ تاجور نجیب آبادی تھے۔ اس میں ایک خاص [illegible]

[illegible]

بات یاد آتی ہے کہ کرشن چندر جو ہندو پاکستان کے سب سے بڑے افسانہ نگار مانے گئے ان کا پہلا افسانہ جس کا نام یاد نہیں شاہکار میں شائع ہوا تھا۔ اس کی اشاعت کے بعد کرشن چندر نے علامہ تاجور کو ایک خط لکھا تھا جو شاہکار میں شائع ہوا کہ انھوں نے وہ افسانہ آل انڈیا ریڈیو لاہور کو پیش کیا تھا مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ نیز یہ کہ انگریزی ایم۔اے پاس کرنے کی اتنی خوشی انہیں نہیں ہوئی تھی جتنی اس افسانے کی اشاعت سے ہوئی رسالہ بھی زمانے کی گرد میں چھپ گیا۔ دہلی سے اردو زبان کو خاص تعلق ہے مگر اس کا مرکز ثقل ہٹ کر لاہور چلا گیا تھا۔

تاہم دہلی سے شائع ہونے والے ایک شاندار رسالہ "ساقی" اس کے مدیر تھے شاہد احمد دہلوی۔ دہلی کے تمام معروف شاعر اس میں چھپتے رہتے۔ وہ تمام یاد کرتے ہیں۔ میرزا مرحلی داستان گو، شاہد احمد حقی، ہندوستان کے تمام اچھے افسانہ نگاروں کے نام اس کی فہرست مضامین میں نظر آتے تھے۔ افسانوں کی اشاعت میں یہ ممتاز تھا کتنے آئندہ کے مشہور افسانہ نگاروں نے ساقی کے صفحات پہ اپنی ابتدا کی۔ احمد ندیم قاسمی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ وہ افسانے بھی لکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ دونوں صنفوں میں وہ برابر کی فنکاری کے قائل تھے۔ بہرحال اس وقت ان کا جھکاؤ افسانوں کی طرف تھا اور وہ بالالتزام کہیں شائع ہوتے تھے۔ اثر صہبائی ایک مشہور شاعر تھے ان کا کلام ساقی میں ضرور ہوتا۔ شاید حسن عسکری جو پاکستان میں بہت زیادہ مشہور رہے ہیں اپنا پہلا افسانہ "حرامجادی" لے کر بزم ساقی میں حاضر ہوئے تھے۔ پنڈت سدرشن، ممتاز مفتی، شفیق الرحمٰن، کرشن چندر وغیرہ مشہور افسانہ نگاروں کی تخلیقات برسوں سے ساقی کے صفحات مزین ہوتے تھے۔ اسعد گیلانی جو اچھے دینی تصانیف کے لیے مشہور ہیں اور جن کی سیرت پاک پر کتاب پر حکومت پاکستان نے سال رواں کی بہترین کتاب کی حیثیت سے انعام دیا ہے، پہلے بحیثیت افسانہ نگار ساقی ہی کے صفحات پہ نمودار ہوئے۔ ساقی کا سالنامہ برابر نکلتا ہو ضخیم اور مصور ہوتا۔ ساقی کے پہلے صفحے کا عنوان تھا "نگاہ اولیں" اس کا سرورق ساقی کی کسی انداز کی تصویر کے ساتھ بہت خوبصورت ہوتا تھا۔ سرورق ہر سال بدلا جاتا۔ شاہد احمد نے ساقی کے پرانے پرچوں سے افسانوں کا انتخاب "ریزہ مینا" کے نام سے کیا تھا۔ تقسیم کے ساتھ دہلی کا یہ جنت خانہ شعر و ادب بھی ویران ہو گیا۔

"نگار" لکھنؤ۔ یہ اس رسالے کا ذکر ہے جس کے بغیر ہمعصر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کی جا سکتی۔ نگار اپنے مدیر نیاز فتحپوری کی شخصیت سے پہچانا جاتا تھا۔ نیاز اور نگار دو مترادف نام تھے۔ نیاز ادب اور مذہب کے میدان میں ایک متنازعہ فیہ شخص تھے۔ "نگار" ان کی ذہانت و فطانت، نرگسیت اور ذہنی ادعا کا آئینہ دار تھا۔ نگار کا معیار بہت اونچا تھا اور اس کے صفحات پہ جگہ پانا فخر کی بات تھی۔ نیاز کے قلم سے "ملاحظات" خاصے کی چیز تھے۔ اس کے معاونین ثقہ علمی و ادبی حیثیت کے لوگ تھے۔ نگار عوام کا نہیں خواص کا پرچہ تھا۔ کبھی کبھی تو نیاز اپنی ہی تحریروں سے پورا پرچہ مرتب کر لیتے۔ نگار اپنی روایت قائم کرتا چلا گیا۔

نگار پہلے بھوپال سے نکلتا تھا۔ نیاز اس وقت مولانا نیاز فتحپوری تھے۔ ان کی زندگی کے وہ کیا واقعات تھے جنہوں نے ان کی زندگی کا نقشہ بدل دیا معلوم نہیں۔ کہ وہ دین اسلام سے نامطمئن ہو کر کفر و الحاد میں اماں ڈھونڈنے لگے۔ انانیت ایک سبب ہو سکتی ہے یا علمائے دین سے حنا دحسن نے مستقل طور پہ ان کو غیر دینی کیمپ میں لا کر چھوڑا۔ جیسا سجاد انصاری نے لکھا ہے کہ اگر علماء سرسید کو ان کے تعلیمی کاموں میں اپنی جگہ رہنے دیتے تو وہ تم ٹھونک کر ان کے خلاف میدان میں نہ آتے۔ بہرحال جب نیاز نے اسلامی عقائد پہ حملے کئے تو بھوپال کی زمین ان پر تنگ ہو گئی۔ وہ لکھنؤ آئے اور نگار کو بھی ساتھ لائے۔ وہ عمر بھر مولانا سید سلیمان ندوی

اور مناظر احسن گیلانی کے خلاف رہے۔ اسلامی عقائد و تعلیمات کے خلاف تشکیک پھیلاتے رہے۔ جہاں تک ادب و شعر کا تعلق ہے اس میں دو رائیں نہیں کہ نیاز کی تحریر میں ادبیت نقطۂ عروج پر ہے۔ وہ جمالیات کے عاشق ہیں اور ان کی قوت تنقید لاجواب ہے انھوں نے نگار کے ذریعہ اپنے عہد کی جوان نسل کو از حد متاثر کیا ہے۔ البتہ وہ آزاد یعنی بے ردیف و قوافی شاعری کو پسند کرنے سے معذور تھے بعلی سردار جعفری کی کتاب " نئی دنیا کو سلام " پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ لکھا ان کے تبصرے پڑھنے کے لائق ہوتے تھے۔ علامہ سلیمان ندوی کے مجموعۂ مضامین کا نام ہے " نقوش سلیمانی "۔ نیاز نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے شرارۃً لکھا کہ یہ کوئی تعویذ گنڈے کی کتاب نہیں بلکہ سلیمان ندوی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ بازار میں تعویذ گنڈے کی ایک کتاب ملتی ہے "نقش سلیمانی"۔ نیاز کے اشعار کی پرکھ لاجواب تھی وہ سیماب کے متعلق کہتے تھے کہ وہ دل سے نہیں دماغ سے شاعری کرتے ہیں۔ فراق گورکھپوری کے وہ بڑے قدرداں تھے۔ چنانچہ ایک بار " نگار " کے صفحات پر فراق پر ذاتی اعتراضات کیے گئے تو فراق نے اس کا پرجوش جواب دیتے ہوئے لکھا کہ میری شاعری میں جو طہارت و پاکیزگی پائی جاتی ہے وہ اردو کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں! اسی طرح کا ایک واقعہ اور ہے۔ امین زبیری نے جب علامہ شبلی کے خطوط بنام عطیہ فیضی شائع کیے اور ادبی دنیا میں اس کے چرچے ہونے لگے اور کچھ لوگوں نے علامہ شبلی پر انگشت نمائی کی تو نیاز نے شاید سلیمان کی دشمنی میں یہ شوشہ نگار میں بھی چھوڑا۔ چنانچہ کچھ روز تک گرم گرم تحریریں کچھ علامہ شبلی کی حمایت میں اور کچھ ان کے خلاف نگار میں شائع ہوتی رہیں یہاں تک کہ عطیہ فیضی نے ایک خط نگار میں شائع کرایا کہ ہم بہنیں تو علامہ شبلی کا بہ حیثیت ایک عالم دین کے احترام کرتی تھیں۔ ان کے دل میں کھوٹ ہو تو ہم کیا جانیں۔ یہ تحریر شاید غصے میں لکھی گئی تھی اور بہت سخت تھی۔ آخر میں نیاز نے ان سب تحریروں پر محاکمہ کیا اور لکھا کہ دراصل اس معاملے میں علامہ شبلی کی عمر کا قصور تھا۔ اگر وہ جوان ہوتے تو کسی حسینہ کو بھی ان جیسے بڑے آدمی کی معشوقہ ہونے پر فخر ہوتا۔ غرض نیاز کو متنازعہ فیہ مسائل کو ہوا دینے میں مزا آتا تھا

نیاز نے نگار کے بہت سے خاص نمبر اور سالنامے شائع کیے جو اپنی افادیت کے لحاظ سے بہت اہم اور وقیع ہیں۔ مثلاً نظیر نمبر۔ داغ نمبر۔ حسرت موہانی نمبر وغیرہ۔ نگار میں نیاز کے خطوط بھی بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ وہ غالب کے انداز میں ہوتے تھے جن میں ہمیشہ کوئی ادبی اور شعری نکتہ زیر بحث آتا۔ نیاز کی تحریر میں عربی اور فارسی کے الفاظ بہ کثرت آتے ہیں اور فارسی تراکیب سے وہ معنی آفرینی کرتے ہیں۔ شاید ان وجوہ سے موجودہ نسل اس کی قدر نہ کر پائے۔ تقسیم کے بعد نیاز نگار کو ساتھ لے کر کراچی چلے گئے اور اس کی ادارت ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے سپرد کی۔ مگر نگار کی عمر نے زیادہ دنوں وفا نہ کی۔

"کلیم" جوش ملیح آبادی ملیح آباد سے اور پھر لکھنؤ سے نکالتے تھے۔ جوش کی انقلابی شاعری کی دھوم تھی۔ کلیم میں ان کا تازہ کلام چھپ جاتا تھا۔ وہ نثر بھی اچھی لکھتے تھے۔ رسالے پر جوش صاحب چھائے رہتے تھے اس کے نائب مدیر ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہم وطن اسرائیل احمد خاں ایک کڑھے ہوئے بالغ نظر نقاد تھے۔ اس رسالے کی عمر تھوڑی تھی۔

ایک دوسرے شاعر ساغر نظامی کلکتہ سے "ایشیا" نکالتے تھے۔ جب جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے دھوم مچاتے ہوئے تھے۔ سیماب اکبرآبادی شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی اپنا ایک رسالہ "شاعر" آگرے سے نکالتے تھے جو آج بھی بمبئی کے آسمان صحافت پر ایک تنہا رسالہ ہے۔ ساغر سیماب کے شاگرد تھے اور کمسن تھے۔ اپنی خوش گلوئی کے سبب مشہور ہوئے اور ہندوستان کے بڑے مشاعروں میں بلائے جانے لگے۔ ان کی زبان پر بھی انقلاب کا نعرہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت اردو کا کوئی شاعر ایسا نہ تھا جو جدوجہد آزادی کا نقیب نہ ہو۔ اس ضمن میں شاید اردو زبان کی خدمت کا سیر حاصل جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ بہرحال ایشیا کے ذریعے ساغر کی حیثیت مستند ہوگئی۔ اس کلکتہ سے جہاں سے کبھی مولانا ابوالکلام آزاد الہلال اور البلاغ نکال چکے تھے۔ ایشیا ایک ادبی پرچے کی حیثیت سے برسوں اپنا فریضہ انجام دیتا رہا۔

اب اس رسالے کا ذکر ہے جس کے نکالنے والے اردو ادب میں ایک انقلابی تحریک کے داعی تھے۔ "نیا ادب" یہ ادب کے ذریعے اشتراکی انقلاب لانا چاہتے تھے یہ پہلے لکھنؤ اور پھر بمبئی سے نکلنے لگا۔ مدیر کی حیثیت سے مجھے ذیح گوالباری کا نام یاد آتا ہے جو شاید برائے نام تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ لندن میں سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے جو بین الاقوامی اشتراکیت کے معتقد تھے ایک پروگرام بنایا کہ ادب کے ذریعے انقلاب کے مقصد کو حاصل کیا جائے۔ ان کا ارادہ بہ یک وقت ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں میں اپنے خیالات کی اشاعت تھا۔ یہ ممکن اس لیے تھا کہ ہر حصہ ملک میں کمیونسٹ پارٹیاں قائم تھیں۔ مگر بہ حیثیت تحریک یہ تحریک اردو ہی میں بارآور ہوئی۔ سجاد ظہیر کی لندن سے واپسی کے بعد ۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل ہوئی۔ یہی زمانہ اسپین میں خانہ جنگی کا تھا۔ جب جنرل فرانکو اور ری پبلکن حکومت برسرپیکار تھے اور انگلستان سے اشتراکی اور نیم اشتراکی شاعر اور ادیب انٹرنیشنل بریگیڈ میں بھرتی ہوکر ری پبلکن حکومت کی حمایت میں لڑنے جا رہے تھے۔ ہندوستان میں یہی غنیمت تھا کہ اشتراکی نظریات کو مقبول بنانے کے لیے ادب کے ذریعے کوشش کی جائے مگر ہندوستان کے عام شاعر اور ادیب کسی نظریے کے پابند نہیں تھے۔ مدت سے "اسپرٹ آف دی ایج" کیر کٹر تھے۔ یعنی ان کا ادب ان کی زندگی یا اعتقاد کا گواہ نہیں تھا۔ مگر ترقی پسند مصنفین تحریک کے اکابر کی یہ حکمت عملی خوب تھی کہ جو بھی جس درجہ ان کا ہم خیال تھا اس کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ چنانچہ پریم چند جیسے لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ آزادی کا جذبہ ہر طرف موجزن تھا اور ہندوستان کی سیاست ہنگامہ خیز ہوگئی تھی اس ہلچل میں نظریاتی شعور اتنا تیز اور محسوس نہیں تھا۔ سمجھا جاتا تھا کہ سب ایک ہی خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی لیے اشتراکی ادیب البتہ اپنی منزل جانتے تھے۔ انھوں نے ہر کوشش کو بڑھاوا دیا جس سے مذہب اور اخلاق کو کھوکھلا کیا جاسکے۔ خاندانی نظام کی شیرازہ بندی ختم ہو۔ روایت کا اثر ختم ہو۔ جنسی آزادی اور مرد و زن کے بلا روک ٹوک اختلاط کا دروازہ کھلے۔

سجاد ظہیر۔ رضیہ سجاد ظہیر۔ ڈاکٹر عبدالعلیم۔ اختر حسین رائے پوری۔ ممتاز حسین۔ احتشام حسین۔ فیض کیفی اعظمی

علی سردار جعفری وغیرہ نیا ادب لکھنے والے تھے مگر ترقی پسند تحریک نیا ادب کے صفحات تک محدود نہ تھی۔ اس نے اردو ادب کو مکمل طور پر متاثر کیا۔ اس نے جمود کو توڑا مگر روایت کو کمزور کیا۔ موضوعات کی کثرت ہوئی اور رنگا رنگی بڑھی۔ علامت و اشاریت نے اظہار و ابلاغ کے نئے دروازے کھولے۔ جدوجہد آزادی کے ہنگامہ خیز پس منظر میں نئی زندگی۔ نئی دنیا۔ نئے ارمان اور نئی منزل کے تذکرے بڑے خوش آئند تھے۔ یہاں تک کہ مجاز نے کہا ؎

ترے جلو میں نئی جنتیں نئے دوزخ ؎ نئی جزائیں انوکھے عذاب پیدا کر

ترقی پسند ادب کیا ہے؟ اس موضوع پر عرصے تک بحثیں ہوتی رہیں مگر کب تک۔ یہ کہنے سے گریز کیا جاتا کہ اشتراکی ادب ہی ترقی پسند ادب ہے۔ جب صاف طور پر یہ محسوس ہونے لگا اور ترقی پسند تحریک کے اکابر اپنی روش میں سخت ہوتے گئے۔ یہ تحریک کمزور ہو گئی اور بالآخر ختم ہو گئی۔ اس تحریک نے اپنی مختصر عمر میں اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ اس نے عقیدہ و نظریہ اور تحریکی جوش و ایمان کی اہمیت ثابت کر دی۔

کانپور ایک تجارتی اور صنعتی شہر ہے۔ یہاں سے کسی اردو ادبی پرچے کا نکلنا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے مگر "زمانہ" یہاں سے نکلتا تھا اور برسوں نکلتا رہا۔ منشی دیا نرائن نگم اس کے مالک و فاضل مدیر تھے۔ زمانہ کا وجود اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ اردو کسی فرقے کی نہیں بلکہ ایک عام زبان ہے۔ جگر مراد آبادی کو لوگ اچھی طرح جانتے ہیں جگر بریلوی سے کم لوگ واقف ہوں گے۔ یہ شعر انھیں کا ہے ؎

کھولا نہیں جو دست حنا بستہ انھوں نے ؎ ٹھہرا ہوا ہے اپنی جگہ خون جگر بھی

ان کا اور دوسرے ہندو شعرا کا کلام اس میں خاص طور پر چھپتا تھا۔ تقسیم سے پہلے اردو ہندی کے سلسلے میں کافی بحثیں ہوئیں۔ زمانہ میں بھی یہ بحث چھڑی۔ ایک صاحب نے جو ہندو ہی تھے اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک روز جب وہ صبح کی سیر کے لیے نکلے تو ایک نوجوان جس کے خاندان میں اردو شعر و ادب کا چرچا تھا ملا۔ اس کے گلے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ان صاحب کی رگ شعریت پھڑکی اور کہا "جناب یہ صبح ہی صبح چاک گریباں کئے کہاں چلے؟ ان کو امید تھی کہ شاعروں کے خاندان کا یہ نوجوان کچھ ادبیت کے چٹخارے کے ساتھ جواب دے گا مگر اس نے کہا بٹن نہیں تھی۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ہماری نسل اردو سے بیگانہ ہو گئی۔ اور اتنے برسوں کے بعد اب؟ ۔۔۔؟

ڈاکٹر ملک حسن اختر

اردو تنقید اور ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک نے اردو تنقید میں ایک نئے نظریئے کو جنم دیا۔ اس سے پہلے مولانا حالی نے ادب کے مقصد پر زور دیا تھا۔ اقبال نے بھی جلال و جمال کے امتزاج کی اہمیت کو واضح کیا۔ ان دونوں کے نزدیک ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہونے کے باوجود اسے ادب کے فنی تقاضے بھی پورے کرنا ضروری تھے۔ ترقی پسند تحریک نے بھی ادب کی افادیت پر نگاہ رکھی مگر اس کے فنی لوازم کو زیادہ اہمیت نہ دی چنانچہ کلیم الدین احمد نے اس کا بڑی سختی سے محاسبہ کیا۔

"ترقی پسند مصنفین کو غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ خیالات ماخوذ ہیں۔ وہ دماغ سے صحیح مصرف نہیں لیتے۔ تخیل اور مستعار خیالات کی صحت اور عدم صحت کے متعلق کبھی نہیں سوچتے غور و فکر ان کے بس کی بات نہیں۔ اور غور و فکر کے بغیر کامیاب ادب ممکن نہیں۔ ان سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ بے نفاست خیالات کو اچھی طرح سے بیان کریں۔ تصورات میں جدت نہ سہی کم از کم طرز ادا میں حسن تمکین اور انفرادی رنگ آمیزی تو ہو۔ لیکن ترقی پسند ادب میں طرز ادا اور بھی ناقص ہے۔" (اردو تنقید پر ایک نظر، ص ۱۵۶)

کلیم الدین کا اعتراض بس صرف ایک حد تک درست ہے۔ اگر اسے پوری طرح مان لیا جائے تو ترقی پسند تنقید کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اپنی تمام خامیوں کے باوجود اردو تنقید کو ترقی پسند تحریک نے ایک نئی راہ عمل مہیا کی۔ یہ درست ہے کہ ترقی پسندوں کا نظریہ مستعار ہے ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد اشتراکیت کا چرچا ہوا۔ مارکس نے معاشیات میں جو نئے اصول وضع کئے تھے انہوں نے عملی صورت میں سامنے آنا شروع کیا۔ دنیا کے مختلف معاشروں نے ان اشتراکی اصولوں سے اثر قبول کیا۔ لہٰذا ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ بعض لوگوں نے اس کام کے لیے باقاعدہ انجمن سازی کی چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین ۱۹۳۵ء میں لندن میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی ڈاکٹر محمد دین تاثیر، سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ملک راج آنند اور حسین گپتا تھے۔ اسی سال سجاد ظہیر نے ہندوستان آکر اس کی شاخیں سارے ملک میں قائم کرنا شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں اپریل ۱۹۳۶ء میں ایک کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی گئی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور اپنے صدارتی خطبہ کے آخر میں کہا:

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

پریم چند کا یہ معیار سامنے رکھیں تو اقبال اور پریم چند دونوں اس پر پورے اترتے ہیں مگر ترقی پسند تنقید کا نظریہ اتنا

ہی نہیں ہے، وہ اس سے آگے بڑھتی ہے اور اشتراکی خیالات کو بھی شامل کر لیتی ہے۔ پریم چند کو اس کانفرنس کی صدارت اس لیے نہیں دی گئی تھی کہ ترقی پسندوں کے نزدیک پریم چند مشعل راہ تھے بلکہ ہر نئی تحریک کی طرح انہیں بھی بڑے ادیبوں کی معاونت درکار تھی چنانچہ انہوں نے اس وقت کے جن اہم ادیبوں سے رابطہ قائم کیا تھا، ان میں مولوی عبدالحق اور اقبال بھی تھے۔ انہوں نے ان لوگوں سے ہمدردی کا اظہار بھی کیا۔ مگر ظاہر ہے کہ ہم انہیں ترقی پسندوں میں شمار نہیں کرتے۔ ایک زمانے میں یہ بحث بھی چل نکلی تھی کہ پرانا ادب بھی ترقی پسند ہے اور ہر اس ادیب کو جو اپنے زمانے میں بہتری کی راہیں تلاش کرتا ہے ترقی پسند کہنا چاہیے۔ مگر ہمارے پیشِ نظر ترقی پسندی کی اصطلاح ہے اور اس سے مراد وہ ادیب ہیں جو باقاعدہ ۱۹۳۶ء میں چلائی گئی تحریک میں شامل تھے۔ ادیبوں کو اس انجمن کا ممبر بنایا جاتا تھا اور وہ پارٹی کی طرف سے مہیا کی گئی راہِ عمل پر چلتے تھے۔ اپنے ممبر ادیبوں کی تشہیر کی جاتی تھی اور ان کی کمتر تخلیقات کو بھی اعلیٰ بتایا جاتا تھا۔ یوں ترقی پسندوں نے ادب میں نظریاتی گروہ بندی کی داغ بیل ڈالی اور آگے چل کر اس نے قبیح صورت اختیار کر لی۔ اب ہر مذہبی اور سیاسی جماعت اپنی تحریک سے وابستہ ادیبوں کے لیے شہرت کے دروازے کھولنے کی کوشش کرتی رہتی ہے اور ان کی غیر معیاری چیزوں کو معیاری بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ تشہیر کے اس زمانے میں لوگ ان سے دھوکا بھی کھا جاتے ہیں۔

مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں اُردو میں نظریاتی تنقید کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے ادب کا جائزہ لیا۔ ان کے نزدیک ادب کو جدید زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ انھوں نے انگریزی ادب سے فائدہ اٹھایا اور اردو ادب میں نئی روح پھونکی۔ ترقی پسند تحریک نے انگریزی ادب سے فائدہ ضرور اٹھایا مگر اردو ادب کو روسی ادب سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ حالی اور اقبال نے بھی ادب سے معاشرتی اصلاح کا کام لیا اور ترقی پسند بھی اسی روش پر چلے مگر ان کا نظریہ ان سے مختلف تھا۔ ترقی پسند حالی سے اس معاملے میں متفق ہیں کہ شاعری کو سوسائٹی کے لیے مفید ہونا چاہیے نہ کہ نقصان دہ، مگر حالی کے نزدیک کسی عام آدمی کی موت سے متاثر ہونا پاک دلی نہیں ہے۔ اس کے برعکس ترقی پسندوں کے نزدیک ہر وہ ادیب جو مزدوروں، کسانوں اور عام انسانوں سے ہمدردی نہیں رکھتا، ان کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتا اور اپنی تخلیقات میں ان کے مصائب کو جلوہ گر نہیں کرتا۔ وہ اپنے پہلو میں پاک دل نہیں رکھتا، ترقی پسندوں سے پہلے پریم چند نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں نچلے طبقہ کے مصائب کا ذکر کیا تھا اور ان کا ناول "گئو دان" ان کے اس احساس کی معراج ہے۔ مگر پھر بھی عام ادیب و شاعر مزدوروں اور کسانوں کا ذکر اتنی بہتات سے اپنی تحریروں میں نہ کرتے تھے جتنا کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کرنے لگے، ترقی پسند تحریک نے مزدوروں اور کسانوں سے ہمدردی کا صور اس زور سے پھونکا کہ اس کے بعد وہ لوگ بھی ان عام انسانوں کا دم بھرنے لگے جن کا ترقی پسند تحریک سے براہ راست تعلق نہ تھا۔ یوں دیکھا جائے تو اس تحریک نے اردو ادب کا رخ موڑ کر رکھ دیا۔ چونکہ یہ تحریک مزدوروں اور کسانوں سے ہمدردی کو مطمعِ نظر بتاتی تھی۔

اس سے وابستہ ادیبوں نے زبان کی سادگی پر بھی زور دیا اور بعض اوقات ان کے ہاں زبان کی ناپختگی بھی نظر آتی ہے جس کا ذکر مولوی عبدالحق نے یوں کیا ہے ،

"مجھے معاف فرمائیے گا میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لکھنے والوں میں کم سے کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں"۔

(نیا ادب جنوری، فروری ۱۹۴۱ء)

بعد میں ترقی پسند ادیبوں کو بھی اس امر کا احساس ہو گیا کہ زبان کی ناپختگی ادب کے لیے نقصان دہ ہے۔ پہلے ڈاکٹر محمد علیم نے کہا تھا کہ :

"ترقی پسند ادیبوں کے اسلوب اور طرز ادا کے سوال کو لازمی طور پر ثانوی حیثیت ہونی چاہیے۔ ان کے لیے مقدم سوال موضوع کا ہے ،

(رسالہ منزل لکھنو فروری مارچ ۱۹۴۴ء ترقی پسند ادب کے بارے میں چند غلط فہمیاں۔ بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ، تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء ص ۹)

مگر بعد میں یہی عبدالعلیم صاحب نے کہا کہ :

"اگر موضوع صالح بھی ہو اور زندگی کی صحت مند قدروں کی عکاسی بھی کرتا ہو، اگر اسے پیش کرتے وقت ایک خاص سلیقہ اور خاص انداز میں ڈھالنے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے جو زیادہ سے زیادہ متاثر کن ہو تو پھر وہ ایک بھونڈی سی بات ہوگی لیکن ادب نہ ہوگا"۔

(علیگڑھ کے سالانہ جلسہ کی رپورٹ رسالہ ماحول دہلی شمارہ ۱۳، ۱۴ بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص ۱۰۲)

انھوں نے پارٹی کی ہدایت کے مطابق ادب تخلیق کرنے کی بھی مذمت کی اور کہا :

"اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ترقی پسندی کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی کٹر اور دقیانوسی سر پر ڈنڈا لے کر کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ لکھو تو پھر اس قسم کا تصور غلط ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ اس قسم کا تصور جلد از جلد ختم ہو جانا چاہیے"۔

(ادب اور انقلاب ص ۱۴۳)

دراصل جماعتی ہدایات کے تحت ادب تخلیق کرنے کا تجربہ بہت پہلے روس میں ناکام ہو چکا تھا مگر ترقی پسندوں نے اس سے سبق نہیں سیکھا۔ انقلاب روس کے بعد وہاں مصنفین کی ایک سرکاری انجمن راپ کے نام سے قائم کی گئی اور اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ ادیبوں سے جماعتی ہدایات کے تحت ادب تخلیق کرائے۔ اس انجمن نے تقریباً تیس ہزار کتابیں شائع کیں مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ان سب میں ادب کی اعلیٰ اقدار موجود نہیں ہیں اور یہ صرف پروپیگنڈا ہے،

روس ان تخلیقات پر فخر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں کمیونسٹ پارٹی نے ریاپ کو بند کر دیا اور یہ سب کتابیں نذرِ آتش کر دی گئیں۔[1] مگر اس کے بعد بھی روس میں ادیبوں کو آزادی نہیں ملی، اور انہیں کسی نہ کسی طرح مخصوص نظریات اور پارٹی لائن کا پابند کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ نتیجتاً کئی بڑے ادیب نے خودکشی کر لی تو کسی نے ملک سے فرار ہو کر جان بچائی۔ بعض نے تخلیقی ادب کے بجائے ترجموں کا سہارا لیا۔ دراصل ادیب کو پارٹی لائن کا پابند کر دیا جائے تو وہ بڑا ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔

اختر رائے پوری ترقی پسند ادب کے ایک بڑے مبلغ تھے۔ بعد میں انہیں بھی احساس ہوا کہ خود ترقی پسند تحریک کے اندر گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ پہلے زیادہ سے زیادہ ادیبوں کو اس تحریک میں شامل کیا جاتا تھا مگر بعد میں ایک مخصوص گروہ نے قوت پکڑ لی، ذاتی تعلقات کو قومی، ملی اور ادبی مفادات پر ترجیح دی جانے لگی۔ اختر حسین رائے پوری اس روش پر یوں توجہ کرتے نظر آتے ہیں:

> "انصاف کا تقاضا ہے کہ محتسبوں کے اس نئے گروہ کا بھی ذکر کیا جائے جو ناظروں پر نہیں بلکہ بعض مصنفوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ہر قماش کے محرّر شامل ہیں۔ کسی جماعت یا گروہ کا ذکر نہیں۔ ان کا رویّہ کچھ اس قسم کا ہے کہ ہمارے گروہ کا ہر فرد جو کچھ لکھتا ہے۔ اس کا ہر لفظ متبرک ہے، گو ان کی بہت سی ایسی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں جو انہیں کے فلسفۂ حیات کی کسوٹی پر کھوٹی اتریں گی، لیکن چونکہ وہ ان کے قلم سے نکلی ہیں لہٰذا مستند اور قابلِ تعظیم ہیں اور کسی کو حق نہیں کہ ان پر نکتہ چینی کرے ان کے گروہ سے جو باہر ہے وہ اگر وہی سوچتا اور لکھتا ہے جو انہیں کے فلسفۂ حیات کے مطابق ہے۔ تاہم وہ مردود ہے اور مطعون ہے، کیونکہ وہ یا تو ذاتی طور پر اس سے ناواقف ہیں یا ناراض ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک ادب وہ چیز ہے جو ان حضرات کی ذاتی مصلحت اور نجی تعلقات سے عبارت ہے۔"
>
> (ادب اور انقلاب، ص ۱۹)

یہ روش آج بھی موجود ہے۔ یہ ذاتی گروہ بندی ادب کو عظیم نقصان پہنچا رہی ہے اور ادب پر بے ادبی کا گمان ہوتا ہے۔

۱۹۳۶ء کے اجلاس میں مولانا حسرت موہانی بھی شریک تھے انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام اور سوشلزم میں کوئی تضاد نہیں۔ اسلام اور سوشلزم کے تعلق پر بعد میں بھی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ بعض نے مولانا حسرت

---

[1] اس کی تفصیل ممتاز شیریں کے مضمون سیاست، ادیب اور ذہنی آزادی میں ملاحظہ فرمائیں۔ جو ان کے مجموعہ "معیار" میں شامل ہے اسے نیا ادارہ لاہور نے پہلی بار ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔

کے طرزِ فکر کو اپنایا مگر بعض نے سوشلزم کو اسلام کی ضد قرار دیا۔ علامہ اقبال اسلام کے بڑے مبلغ ہیں۔ اول الذکر گروہ نے ان کو سوشلسٹ نظریات کا حامل قرار دیا مگر موخر الذکر نے انہیں سوشلزم کے خلاف بتایا۔ ہر کوئی اپنے مفاد کی خاطر حقیقت کو جھٹلاتا رہا اور یوں سیاست کا انداز فکر ادب میں بھی در آیا جو ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ ممبر بنا لیے گئے ہیں اور انہیں ادبی معنی فسٹو دیا گیا۔ ان سے تقاضا کیا گیا کہ وہ ایک خاص انداز فکر کو سراہیں اور دوسروں کو رجعت پسند قرار دیں۔ میتھو آرنلڈ نے نقاد کو بہترین خیالات رائج کرنے والا بتایا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے مبلغ یہاں تک تو آرنلڈ سے متفق ہیں مگر "بہترین" کا معیار اپنا بنا لیتے ہیں۔ ان کی نظر میں مزدوروں اور کسانوں کی فلاح کا کام کرنے والا ادب ہی ترقی پسند ہے۔ اور چونکہ اس زمانے میں روس میں اشتراکیت بھی یہی کام کرنے کا دعویٰ لے کر اٹھی تھی۔ اس لیے ترقی پسند تحریک پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس کے پہلے سکریٹری سجاد ظہیر کمیونسٹ تھے۔ چنانچہ ترقی پسند نقاد اپنے اشتراکی ساتھیوں کی تعریف میں رطب اللسان رہنے لگے۔ میتھو آرنلڈ نے کہا تھا کہ نقاد کو بہترین خیالات کی تلاش میں کسی گروہ سے منسلک نہیں ہونا چاہیے۔ وہ کسی پارٹی کا ترجمان نہ ہو مگر ترقی پسند تحریک نے نقادوں کو پارٹی کا ترجمان بنا کے رکھ دیا۔ وہ اپنی پارٹی کے گھٹیا ادیبوں کو اعلیٰ مرتبہ پر فائز کرتے اور دوسرے بڑے ادیبوں میں بھی کیڑے نکالتے۔ اختر حسین رائے پوری نے اقبال کو فاشسٹ قرار دیا۔ اگرچہ بعد میں اختر حسین رائے پوری پاکستان آجانے کے بعد سردار جعفری نے انھیں بھی رجعت پسندوں میں شامل کر دیا[1]۔ دراصل ترقی پسندوں نے ادب اور سیاست کو ایک کر دیا تھا۔ وہ سجاد ظہیر کی اس لیے تعریف کرتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ نظریات کے حامل تھے[2]۔ وہ کانگریس کی جیت کو سامراجیوں کی شکست قرار دیتے ہیں[3]۔ یاد رہے کہ سجاد ظہیر اس انجمن کے پہلے جنرل سکریٹری چنے گئے تھے اور وہ انجمن کے بانیوں میں سے تھے۔

ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں ایک اعلان نامہ منظور کیا گیا۔ اس کا متن ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

> "ہمارے دیس میں یہ پہلا موقع ہے کہ مختلف زبانوں کے ادیب باہمی تعاون کی غرض سے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تعاون کی بنیاد کیا ہو۔ کئی تجویزیں اس جلسہ میں پیش ہوئی ہیں۔ لیکن ایک بہت اہم مسئلہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس پر سب سے پہلے غور ہونا چاہیے تھا۔ ہم نے یہ طے کر لیا کہ ادب کا قالب کیا ہو مگر یہ نہیں بتایا کہ اس قالب کا روپ رنگ کیا ہو۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ

---

[1] ترقی پسند ادب، ص ۱۸ [2] روشنائی، ص ۷۷ [3] روشنائی، ص ۱۵۵، مکتبہ اردو، لاہور ۱۹۶۵ء

کیا کہنا ہے اور کہاں سے کہنا ہے، کیسے کہنا ہے کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کہ ادب کے مسائل کو زندگی کے دوسرے مسائل سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا، زندگی مکمل اکائی ہے، اسے ادب، فلسفہ، سیاست کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ دہ کاروانِ حیات کا رہبر ہے۔ اسے محض زندگی کا ہم رکابی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ رہنمائی بھی کرنا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کدھر جا رہی ہے اور اسے کدھر جانا چاہیے۔ ادیب انسان بھی ہے اور اسے سماج کی ترقی کے لیے اتنا تو کرنا ہی ہے جو ہر انسان کا فرض ہے۔ انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں کہ آج جب ترقی و پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے ادب اپنے کو غیر جانب دار رکھ سکتا ہے؟ حسن، آرٹ وغیرہ کے نقاب پہن کر وہ کارزارِ حیات سے راہ فرار اختیار کر سکتا ہے۔ کیا وہ واقعہ نگاری کی فصیل پر بیٹھ کر انقلاب و رجعت پسندی کی تصویر لے سکتا ہے؟

احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حالِ زار ہمیں بے حس کیونکر رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بے کاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو حاشا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو، وہ کیا کہے، کن سے کہے اور کس طریقہ سے کہے؟ چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع جائز ہے کہ وہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے، زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔ اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ بنی نوعِ انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے اپنے کو وابستہ کرے گا اور زندگی کے ارتقا کا علمبردار ہوگا۔"

دستخط — (پنڈت) جواہرلال نہرو　　(اچاریہ) نریندر دیو

مولوی عبدالحق　　(منشی) پریم چند　　اختر حسین رائے پوری

یہ اعلان نامہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی کتاب "ادب اور انقلاب" (نیشنل ہاؤس آپالو بندر بمبئی ا) کے دوسرے ایڈیشن سے نقل کیا گیا ہے۔ اس وقت سردار جعفری کے ترقی پسند ادب (سکتبہ پاکستان لاہور) کا دوسرا ایڈیشن بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس میں بھی ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ دیا گیا ہے مگر ان دونوں

میں بڑا فرق ہے لہٰذا ہم اسے بھی یہاں نقل کرتے ہیں۔

"اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پرستی جس کی موت لازمی اور یقینی ہے اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار ہو رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصوّر پرستی میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے اور اب شدید ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔

ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان مذہب جنس جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو ونما سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیر و ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔"

(انجمن کی پہلی کانفرنس لکھنؤ اپریل ۱۹۳۶ء میں منظور ہوا)

حرف اول میں صراحت کی گئی ہے کہ اس اعلان نامہ پر مولوی عبدالحق، پریم چند وغیرہ کے دستخط ہیں یہاں جوش ملیح آبادی، نیاز فتح پوری، سجاد ظہیر اور ملک راج آنند کے نام دستخطوں کا ذکر ہے جبکہ پنڈت جواہر لال نہرو اور آچاریہ نریندر دیو کے دستخطوں کا ذکر نہیں ہے "ادب اور انقلاب" کے پیش لفظ میں ناشر نے یہ بھی لکھا ہے کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور

کے اس اجلاس میں جو اعلان نامہ پیش کیا وہ اختر حسین رائے پوری نے لکھا تھا ان دونوں اعلان ناموں میں سے کون سا مستند ہے اس کی تصدیق ابھی باقی ہے سردار جعفری نے ترقی پسند ادب (ص ۴۰) میں "ادب اور انقلاب" والے اعلان نامہ کا بھی ذکر کیا ہے مگر یہ صراحت نہیں کی ہے کہ ان دونوں میں کون سا مستند ہے اور کسے انجمن کے اجلاس میں منظور کیا گیا وہ اس اعلان نامے کا ذکر بھی اس طرح کرتے ہیں جیسے یہی اصل ہے تعجب اس وقت ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق اور پریم چند کے دستخطوں کا دونوں نے دعویٰ کیا ہے کیا ان دونوں نے دو اعلان ناموں پر دستخط کئے تھے؟ یہ ممکن نظر نہیں آتا یا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ ہر ایک نے اپنی پسند کا اعلان نامہ تیار کیا سجاد ظہیر نے اپنی کتاب "روشنائی" میں ترقی پسند ادب کی تاریخ لکھی ہے مکتبہ اردو لاہور ۱۹۶۰ء کا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے مگر انھوں نے کانفرنس میں منظور کئے جانے والے اعلان نامے کا متن شائع نہیں کیا۔

اختر حسین رائے پوری نے ترقی پسند تحریک کی بھرپور وکالت کی اور ترقی پسند ادب کی تشریح کرنے کے لئے ایک مشہور مضمون "ادب اور زندگی" لکھا جو بعد میں ان کی کتاب "ادب اور انقلاب" میں شائع ہوا انھوں نے اپنے مضمون میں صحیح ادب کا معیار پیش کیا۔

> "صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقہ سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں۔ اس کے لئے دل میں خدمت خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہیے کیونکہ ادب پیغمبری کی طرح خود دگزاری کا متقاضی ہے نہ کہ ملائیت کی طرح پیشہ ور، ماضی حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لئے ضروری ہے تاکہ اس کی دردمندی رائیگاں نہ جائے اور وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھ سکے پھر زندگی کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کی آگ میں تپا جائے اس کے ہنگاموں میں حصہ لیا جائے اس کی تگ و دو سے الگ رہ کر اس کے رموز کو سمجھنے کی کوشش ویسی ہی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانا اس صورت میں نہ ادیب زیادہ لوگوں کے احساسات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنی زبان اور پیام ان تک پہونچا سکتا ہے۔ یہ معیار بہت مشکل معلوم ہوگا اس لئے کہ اب تک ادب پر اس جماعت کا قبضہ رہا ہے جو کسی درجہ کے مشہور درباری کی طرح ندی کی لہریں گننے کی تنخواہ لیا کرتا تھا" (ادب اور انقلاب ص ۲۴)

اختر حسین رائے پوری نے ادب کا جو معیار تجویز کیا ہے اس پر ہر اچھا ادب پارہ پورا اترے گا ان کی اس تعریف پر اقبال کے اثرات نظر آتے ہیں ماضی حال اور مستقبل پر اقبال بھی نظر رکھتے ہیں خدمت خلق کا درس بھی دیتے ہیں انسانیت کی ترجمانی کا فریضہ بھی سر انجام دیا ہے اور ملائیت کے بھی خلاف ہیں۔ تاریخ سے مستقبل کے لئے درس عبرت بھی دیتے ہیں انھیں ساحل پر کھڑے رہنا انھیں ناگوار ہے وہ طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اختر حسین رائے پوری کے آخری جملے ان کے اشعار کی یاد دلاتے ہیں ؎

مپا در بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز حیات جاوداں اندر ستیز است

ترقی پسند نقادوں نے ادب کو زندگی کی جن کھلی فضاؤں میں لاکھڑا کیا اس سے سب ہی متاثر ہوئے مگر انھوں نے پرانے ادب کو جانچتے ہوئے تنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہے اختر حسین رائے پوری کا آخری جملہ اس تنگ نظری کا غماز ہے ۔

سردار جعفری بھی ترقی پسند ادب کے شارح ہیں انھوں نے ترقی پسند تنقید کے بارے میں لکھا ۔

" ترقی پسند مصنفین نے نئی قسم کی علمی تنقید پیدا کی جس کی بنیاد یہ ہے کہ ادب کا جائزہ سماجی ، سیاسی اور تاریخی پس منظر میں لیا جائے اس نے تنقید کی سطح کو بلند کر دیا ہے اور تنقید کے فن کو سائنسی بنا دیا ہے ان اصولوں کی روشنی میں اپنے تہذیبی اور ادبی ورثے کا جائزہ لینے میں آسانی ہوتی ہے اور روایات کے چہرہ سے ماضی کے اندھیرے کی بہت سی نقابیں الٹ جاتی ہیں یہ تنقیدی انداز اردو ادب میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے ۔" (ترقی پسند ادب از سردار جعفری ص ۲۴۹)

ہمارے ہاں دقت یہ ہے کہ ہر شخص اپنی تنقید کو سائنسی کہتا ہے مگر اس بات سے ناواقف ہے کہ سائنسی تنقید کیا ہوتی ہے دراصل سائنس کی قدر و منزلت اتنی زیادہ ہے کہ اس لفظ کو ہر شخص استعمال کر کے استاد کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے سائنس حقائق کی دریافت کا نام ہے اور سائنسی تنقید کا غیر جانبدار ہونا لازمی ہے ۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ افراد کی تنقید قطعاً غیر جانبدار نہیں ہے ۔

ترقی پسند مصنفین نے مزدور اور کسان کی حالت زار پر بہت زور دیا اور اس سے اردو ادب میں جو موضوعات شامل ہوئے وہ ادب کے لئے باعث افتخار ہیں مگر ترقی پسند نقادوں نے جس جانبداری کا مظاہرہ کیا اور ماضی کے ادب کو جس طرح رنگدار عینک لگا کر پڑھا وہ افسوسناک ہے اسی لئے عزیز احمد نے جو ترقی پسندوں میں شمار ہوتے تھے ترقی پسند نقادوں کو مشورہ دیتے ہوئے لکھا ہے ۔

" ترقی پسند تنقید کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ سختی سے جدید تحریک کے ہر پہلو کا جائزہ لے ہر رجعت پسند رجحان کو جو قدامت پرستوں کے خوف سے اس انقلابی تحریک کے سائے میں پناہ لینا چاہتا ہے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے ۔ اب اس سے کام نہیں چلے گا کہ ترقی پسند نقاد محض نظم آزاد اور نظم عاری کی حمایت کو اپنا بڑا فرض سمجھیں یا مارکسی تنقید کے بنیادی اصول عام فہم زبان میں سمجھاتے رہیں انھیں قدامت پرست ادب اور ادیبوں سے زیادہ جائزہ لینا ہے ۔

(ترقی پسند ادب ۔ از عزیز احمد ص ۴۳)

بہر حال ترقی پسند تنقید نے اسلوب کی بجائے مواد پر زیادہ نگاہ رکھی اور مواد کے مقابلے میں اسلوب کو ثانوی حیثیت دے دی احتشام حسین بھی ترقی پسندوں کے ممتاز نقاد ہیں انھوں نے ۱۹۴۴ء میں ایک مضمون " ادبی [illegible]

سے لکھا تھا یہ مضمون بعد میں ان کے مجموعہ مضامین "روایت اور بغاوت" میں شامل کیا گیا اس مضمون میں انہوں نے بار بار اسلوب کے مقابلے میں مواد کی اہمیت کا ذکر کیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں"

انقلاب اور تغیر کے زمانے میں اسلوب کا مواد کا پابند نظر آتا ہے۔

(روایت اور بغاوت۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۶ء ص ۱۲)

" یا ہئیت اور اسلوب پر بھی مواد اور موضوع کی مناسبت سے نظر ڈالی جا سکتی ہے" اور مواد یا موضوع ان کے نزدیک وہی محمود ہے جو اشتراکیت کے اصولوں کا پابند ہو" یہی وجہ ہے کہ وہ حقیقی تنقید اشتراکی تنقید کو کہتے ہیں اور ان کے نزدیک تنقید کی اعلیٰ صورت یہ ہے وہ لکھتے ہیں۔

"تنقید جب حقیقت کے عام اور سطحی مفہوم سے گذر کر حقیقت کے ہر شعبہ کو اس کے مثبت اور منفی اثبات کو اس کے مادی اور نفسیاتی وجود اور تعلق کو گھیر لیتی ہے تو اسے اشتراکی حقیقت نگاری کا نام دیا جاتا ہے اس میں فرد کا تجزیہ ایک باشعور سماجی انسان کی حیثیت سے کیا جاتا ہے اور شاعر یا ادیب الہام و القا کی اونچی سطح سے اتر کر نقاد کے روبرو پیش ہوتا ہے ایسے تنقیدی تجزیے ہی وہ گل کھلاتے ہیں کیونکہ یہ طریقہ ادیب کو اس کے سماجی روابط کی روشنی میں پیش کرتا ہے اس کے رجحانات کی پیدائش اور حقیقت کو واضح کر دیتا ہے رجعت پسند اور زوال پذیر تصورات کا پول کھول دیتا ہے۔" (روایت اور بغاوت ص ۱۳۹، ۴۰)

ترقی پسند تحریک نے نقاد کو بے حد اہم بنا دیا کیونکہ وہ ادیب کو نقاد کے سامنے پیش کرتی ہے جیسے کسی کو عدالت انصاف کے سامنے پیش کیا جاتا ہے نقاد یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کا ادب کھوٹا ہے یا کھرا۔ یہاں نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ادیب کے نقطۂ نظر کا جائزہ لے کر دیکھے کہ وہ زندگی کے مسائل کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے اس میں تضاد یا ابہام پایا جاتا ہے یا کسی مخصوص فلسفۂ حیات کی مدد سے وہ زندگی کے ہر مسئلہ پر رائے دیتا ہے اس کا فلسفہ حقیقت پر مبنی ہے یا خیالی؟ رائی پر اس کے یہاں مادیت ہے یا غیبیت "[۱]

یعنی یہاں نقاد کے لئے یہ دیکھنا کافی نہیں ہے کہ ادب مسرت پہونچائے بلکہ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ یہ زندگی کے لئے مفید ہے یا نہیں اور زندگی کے لئے مفید ہونے کا تصور اس کا اپنا ہے کسی دوسرے نقطۂ نظر کو قبول کرنے پر وہ تیار نہیں ہے اس طرح دیکھا جائے تو ترقی پسند تنقید ایک مخصوص گروہ کے مخصوص نظریات کی تنقید ہے یہ ادبی معیاروں کی بجائے اپنے نظریات کو سامنے رکھتی ہے اور ان ہی کے مطابق تخلیقات کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔

---

[۱] روایت اور بغاوت ص ۴۴۔

ڈاکٹر خالد سجاد

شاعری میں مانوس سہسرامی کا مقام

اختر اورینوی کے الفاظ میں بہار نے شاد اور یاس عظیم آبادی کے بعد جدید اردو غزل کا ایک اور چشم و چراغ پیدا کیا، مانوس سہسرامی۔ ان کے خیال میں مانوس کی شاعری کا افق وسیع ہے اور ان کے تجربات میں سرشاری کے ساتھ گہرائی پائی جاتی ہے۔ وہ مانوس کی شاعری کے اس لئے بھی قائل ہیں کہ ان کے یہاں تغزل کے ساتھ ساتھ تفکر کا عنصر پایا جاتا ہے اس لحاظ سے وہ غالب اور اقبال کی شعری روایت کی امین اور وارث ہیں۔

مانوس کی شاعری کے اساسی محرکات ان کی ذاتی اور نجی زندگی کی واردات ان کے عہد کے عمومی حالات اور ان کے فکری معتقدات رہے ہیں جنھوں نے ان کی شاعری کو مخصوص آب و رنگ عطا کیا اور اس میں سوانحی انداز اور فکری لے پیدا کی۔ مانوس کو قدرت کی طرف سے شعر گوئی کا ملکہ ودیعت ہوا تھا وہ طبیعت کی موزونی اور قوت تخیل سے لیس تھے اور آسانی سے اپنے جذبات و کوائف کو شعری اظہار کا روپ دے سکتے تھے لیکن انھوں نے محض اپنی طبیعت کی موزونی اور قوت تخیل کا سہارا نہیں لیا بلکہ شعوری طور پر شاعری کے فن میں بھی مہارت بہم پہونچانے کی کوشش کی اور اپنا مطالعہ مسلسل آگے بڑھاتے رہے کہہ سکتے ہیں کہ ہیں کہ ان کے اکتساب فن کی شعوری کوشش نے ان کے شاعرانہ ذوق کو جلا بخشی جس کے نتیجے میں ان کے کلام میں فکری عنصر کا اضافہ ہوا اور اس میں بتدریج پختگی آتی گئی۔ مانوس کو اساتذۂ سخن کے کلام کے مطالعے سے خصوصی دلچسپی تھی وہ اردو غزل کے مزاج اور روایت سے آشنا تھے اور اس کے بجا طور پر رمز شناس کہے جا سکتے ہیں انھوں نے بعض اساتذہ اور شعرا کی زمینوں میں باضابطہ اشعار کہے ہیں اور اچھے شعر نکالنے میں کامیاب ہوتے ہیں ان کے بعض اشعار میں بھی ماقبل کے شعرا کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان شعرا میں میر، غالب، فانی، شاد، جگر، اقبال، شامل ہیں انھوں نے اپنے ذوق سخن کو نکھارنے میں عشرت لکھنوی، جلیل مانک پوری اور سیماب اکبرآبادی وغیرہ ہم سے اصلاحیں بھی لیں اس طرح دیکھا جائے تو مانوس نے اپنے شعری شعور اور لب و لہجہ کی تشکیل میں اردو شاعری کی روایات اور اسالیب سے بھی بقدر ضرورت استفادہ کیا اور انھیں ہضم اور جذب کر کے اپنے کلام میں ایک نیا نکھار اور رعنائی پیدا کی ان کے کلام میں جو جذبے اور فکر کا امتزاج رونما ہوا جس کی بنا پر اختر اورینوی ان کے کلام کو سراہتے اور اس میں غالب اور اقبال کا پرتو دیکھتے ہیں وہ دراصل اردو غزل کی روایت سے ان کے شعوری استفادہ ہی کا نتیجہ ہے۔

اردو غزل جس نے میر اور اس سے قبل محمد قلی قطب شاہ اور ولی سے لے کر آج تک ارتقا کی مختلف منزلیں

ملے کی ہیں ان کا اثر بہ حیثیت مجموعی مانوس کے کلام پر مرتب ہوا ہے اردو غزل گوئی کے اس درمیان میں دو اساسی میلانات نمایاں ہوئے ہیں جنھیں دہلی اور لکھنو سے منسوب کیا جاتا ہے اور علی الترتیب داخلیت اور خارجیت کا نام دیا جاتا ہے یعنی ایک طرف دہلوی شعرا قلبی واردات وکیفیات کے اظہار پر مائل رہے تو دوسری لکھنوی شعرا نے حسن کی صرف خارجی مظاہر کی ترجمانی ہی کو اصل اہمیت دی اور معشوق کے سراپا اور خال وخط کی مصوری تک اپنی شاعری کو محدود رکھا جس میں کہیں بھی دل گداختہ کی کارفرمائی نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنوی شعرا کے یہاں شاعری کی شمع اس طرح سے روشن نہ ہوسکی جو اکثر دہلوی شعرا کا خاصہ ہے میر، درد اور غالب کا کلام ناسخ اور آتش کے کلام سے نمایاں طور پر مختلف ہے اور یہ فرق اور اختلاف دہلوی اور لکھنوی طرز سخن یا بہ الفاظ دیگر داخلیت اور خارجیت کا ہے بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان رنگوں کے متوازن امتزاج اور ہم آہنگی نے شعر و شاعری کے بڑے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں اس وقت تفصیل میں جانے کا موقع نہیں دیکھا جائے تو شاد، حسرت، اصغر، فانی، جگر، عزیز اور آرزو وغیرہ شعرا کے ذریعے جدید غزل گوئی کے جس میلان کا عروج ہوا وہ ان ہی دو رنگوں کے امتزاج سے عبارت ہے۔ شاعری اصلاً تخیل کی پیداوار ہے اور شعری زبان الفاظ کو مستعار میں برتنے کا عمل ہے، شاعری واقعات کی حیاتی تعبیر اور تاثراتی شکلیں پیش کرکے ان کے ذریعے بصیرت و معرفت کے نئے پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے اس لئے جہاں تک شعری اظہار کی نوعیت اور حقیقت کا تعلق ہے داخلیت اور خارجیت کا فرق کوئی خاص معنی نہیں رکھتا جدید شعری شعور اس طرح کی کسی حد بندی کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس سے اوپر اٹھ چکا ہے۔

مانوس کی شاعری کی ابتدا۔ جدید غزل گوئی کے اسی پس منظر میں ہوئی۔ انھوں نے شعر گوئی کی روح اور جوہر پر نظر رکھی اور اپنے کلام میں داخلیت اور خارجیت کے فرق کو بالکل مٹا دیا انھوں نے اپنے کلام میں ان دونوں رنگوں کو بڑی خوبی سے سمو لیا اور فکر و جذبے کے حسین اور انوکھے امتزاج سے اپنی شاعری کے منفرد نقش و نگار اجاگر کرنے میں کامیاب ہوئے ان کی وہ غزل جس میں بسنت کی ردیف استعمال کی گئی ہے نیز کہسار سہسرام سے متعلق غزلیں جن میں خارجیت کا پہلو نمایاں ہے ان کے فن کے بڑے دل کش نمونے ہیں جن میں جذبے کی دھیمی دھیمی آنچ نے سحر انگیز کیفیت پیدا کر دی ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مانوس کا مبلغ علم وسیع نہ تھا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں شعر گوئی کے فن پر پورا عبور حاصل تھا اور ان کے اندر وجدان کے شعلے روشن تھے۔ جس کی وجہ سے ان پر ادراک حقیقت کے دروازے بند نہ ہوئے اور ان کی شاعری میں بصیرت و معرفت کے پہلو اجاگر ہو سکے ان کی درج ذیل رباعی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے ؎

کیا راز دم فکر و نظر کھلتا ہے ہر روز نیا باب سحر کھلتا ہے
پڑھنے سے نہیں کوشش پیہم سے یہاں بخانۂ تخلیق کا در کھلتا ہے

مانوس کی شاعری ان کی اس رباعی کی جیتی جاگتی تفسیر ہے ان کی تگ و دو اخیر وقت تک جاری رہی اور ان کے فکر و نظر میں تبدیلی وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی گئی ان کے پہلے مجموعہ کلام، ساز الم اور آخری مجموعہ کلام کلیات مانوس

میں اس لحاظ سے بڑے واضح فرق کا احساس ہوتا ہے "سارا عالم" کا احساس محرک ان کا ذاتی غم ہے "مژگاں نقش ناتمام" میں یہ غم غمِ زمانہ میں مدغم ہوتا نظر آتا ہے یہاں تک کہ "تارِ شبگیر" میں یہ لے اور بھی نمایاں ہو گئی ہے اور شاعر کا غم واضح طور پر اجتماعی روپ اختیار کر لیتا اور ایک نئی بلندی اور معنویت کا حامل ہو جاتا ہے۔

یہ بات بہرحال فراموش نہیں ہونی چاہیئے کہ مانوس مزاجاً ایک غم پسند شاعر ہیں اور ان کی شاعری کی لے اصلاً حزینہ ہے اور ان کا یہ رنگ ان کے فکر و شعور میں تبدیلی اور ترقی کے باوجود اخیر اخیر وقت تک برقرار رہا یقیناً ان کے کلام میں رجائیت بھی ہے اور حرکت و عمل کا پیغام بھی مگر ان کے یہاں غم پسندی کی ایک زیریں لہر ہر حال میں موجود ہوتی ہے اور ان کے اشعار کے پس منظر میں ان کے مزاج کی دردمندی اور حزن و الم جھلکتا رہتا ہے عبدالمالک آروی نے "سازِ الم" کے مقدمہ میں ان کے شاعرانہ ذہن اور مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے بالکل صحیح رائے دی ہے۔

"اردو تغزل کے المیہ تاثرات پر ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پانچ ایسے شعرا نظر آتے ہیں جن کی لے میں ایک خلقی المیہ تاثر پایا جاتا ہے میر، ضیا، قائم، فانی اور مانوس .... مانوس کے نالوں میں میر، قائم اور فانی ہی کی تلخیاں اور طنز آمیز مسکراہٹیں نظر آتی ہیں"

(سازِ الم، مقدمہ از عبدالمالک آروی ص ۲۱ - ۱۹)

دراصل مانوس کی شاعری کا یہی رنگ اور فضا ہے جو انہیں اپنے ہم عصر شعراء کے درمیان ایک امتیازی جگہ عطا کرتی ہے۔ نظیر صدیقی، عبدالملک آروی کے اس خیال سے اختلاف کرتے ہیں کہ ان کا ہر شعر ان کی آپ بیتی ہے لیکن یہ اعتراف کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کا کلام ان کے نوائے درد کی حیثیت رکھتا ہے نظیر صاحب نے مانوس کے کلام پر بڑی جچی تلی رائے دی ہے، ملاحظہ ہوں ان کے یہ الفاظ۔

"سازِ الم کے مطالعے کے بعد مانوس کے ہر شعر کو ان کی آپ بیتی تسلیم کرنا تو ممکن نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا کلام نوائے درد کی حیثیت ضرور رکھتا ہے ان کی تمام غزلوں میں ایک سوگوارانہ فضا پائی جاتی ہے جس سے ان کی غم زدگی اور غم پسندی دونوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے یہ ان کی الم پرستی ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں روایتی مضامین راہ پا گئے ہیں، وہ بھی نشاط و انبساط کے بجائے حزن و حسرت کے ترجمان ہیں مانوس کی شخصیت کا یہ پہلو اس مجموعے کے نام "سازِ الم" سے لے کے غزلوں کی زمینوں تک کے انتخاب میں کارفرما ہے" ؎ ۱

نظیر صدیقی نے مانوس کے کلام کے بارے میں یہ رائے ان کے پہلے مجموعۂ کلام "سازِ الم" کی بنیاد پر دی ہے تاہم یہ رائے مانوس کے بعد کے کلام پر بھی صادق آتی ہے جس میں تخلیقی محرکات کی کارفرمائی کے باوجود ان کی شاعری حزینہ لے اور فضا برقرار رہتی ہے

---

۱ ؎ نظیر صدیقی، مانوس کی المیہ شاعری کے عناصر، کلیم سہسرامی، ساقی کراچی، مارچ ۱۹۵۶ء، [illegible]

مانوس کے کلام سے یہاں مثالیں دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ان کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے ان کے کلام سے وافر مثالیں دی جا چکی ہیں تاہم یہاں مانوس کی شاعری کے جس پہلو پر زور دیا جا رہا ہے اس کی وضاحت اور تفہیم کے لئے چند اشعار کی طرف دوبارہ رجوع لانا بے جا نہ ہوگا مانوس کہتے ہیں ؎

میری محبت کے رات دن میں کوئی بھی لمحہ نہیں خوشی کا
نفس سمجھتے ہیں جس کو ہم وہم وہ ایک نوحہ ہے زندگی کا

اور یہ شعر بھی دیکھئے۔ ؎

یہ شکستہ خانۂ آرزو کا سہاگ چند نفس سہی
وہ چراغ حسن مآل غم ابھی جل رہا ہے بجھا نہیں

یہ اشعار "سازِ الم" سے ماخوذ ہیں۔ "نالۂ شبگیر" میں شاعر کا رنگ بہت کچھ بدل جاتا ہے اور وہ اس قسم کے اشعار کہنے لگتا ہے ؎

کم کسی دور میں بھی حوصلۂ دل نہ ہوا   واقعہ صبر شکن کب سر منزل نہ ہوا

لیکن اس کے ساتھ ہی اس احساس کا اظہار بھی آجاتا ہے ؎

حوصلۂ حیات کیا ضبط کے باوجود بھی   دل کی زبان بن گیا دیدۂ تر کبھی کبھی

" دل کی زبان بن گیا دیدۂ تر کبھی کبھی" شاعر کے طبیعت کے اصل رنگ کو ظاہر کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی شاعری کی طرف ادبی حلقوں کی توجہ مبذول ہوئی۔

'سازِ الم' کے دوسرے شعر کو سامنے رکھئے اور نالۂ شبگیر کے اس شعر پر نگاہ ڈالئے ؎

کیا کہئے چراغ دل امید کی محفل میں   اس طرح تو بجھ بجھ کر سو بار جلا ہوگا

صاف ظاہر ہے کہ یہاں کسی قدر بدلے ہوئے انداز میں اسی نوائے درد کا اظہار ہے جو شاعر کے مزاج اور افتاد طبع کی خصوصیت اور اس کے طرز کلام کی امتیازی شان ہے۔ مانوس حقیقتاً عمر بھر درد کی تکلیف برداشت کرتے رہے اور ان کا کلام اسی درد کی تفسیر اور شرح کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی کی گونج ان کے اشعار میں سنائی دیتی ہے اس باب میں کسی مزید بحث و تحقیق کی ضرورت نہیں رہ جاتی میرے خیال میں ذیل کے دو اشعار اس بحث کا کلی طور پر فیصلہ کر دیتے ہیں ؎

کیا ہوا مانوس کا انجام کہہ سکتا نہیں   درد کی تکلیف شاید عمر بھر ہوتی رہی
وہی سرگذشت غم ہے وہی شرح زندگی ہے   کہیں سن کے کہہ نہ دیں وہ یہ غزل کسی کی ہوئی ہے

عبد الغنی نے نالۂ شبگیر پر مقدمہ لکھتے ہوئے مانوس کی مجموعی شعری کاوشوں کے پس منظر میں ان کی شاعری کے بارے میں بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے۔ مانوس کے کلام پر اب تک جو رائیں دی گئی تھیں وہ 'سازِ الم' کو سامنے رکھتے ہوئے اس لئے مانوس کی شاعری کے تمام و کمال پہلوؤں کا اندازہ اور احاطہ نہیں ہوتا عبد الغنی کی یہ رائے اس باب میں زیادہ قرین قیاس ہے

"ان دمانوس کا حزن بہت وسیع و عمیق نیز رفیع و جمیل ہے بعض لوگوں نے ان کی قنوطیت ہی پر بڑے فلسفیانہ مضامین لکھے ہیں لیکن میں نے...... ان کی قنوطیت کی بجائے اس بسیط حزن پر روشنی ڈالی ہے جو اپنی ذاتیات سے آگے بڑھ کر شاعر کو حیات و کائنات کے اہم تر موضوعات کی طرف مائل کرتا رہا ہے۔"

(نالۂ شبگیر، مقدمہ ص)

عبدالغنی صاحب کی واضح رائے ہے کہ مانوس کا غم محض ذاتیات میں ڈوبے ہوئے کسی قنوطی کا نہیں اس میں ایک آفاقی وسعت ہے جو ہر درد مند دل کو اپیل کرتی ہے ؎۱

مانوس کا میر اور فانی کے ساتھ اس مرحلے پر موازنہ ضروری نہیں ان شعرا کا اسلوب اور آہنگ ایک دوسرے سے مختلف ہے میر کی تاثیر اور گھلاوٹ کا تو کوئی جواب ہی نہیں فانی کے غم کی بھی اپنی ایک سطح ہے جو ان کی انفرادیت کا تعین کرتی ہے مانوس ان شعرا کے مزاج اور انداز سے واقف رہے ہیں اس لئے انھوں نے اپنا الگ لہجہ کاڑھا ہے ان کے طرز شعر گوئی کا مخصوص امتیاز ان کے لہجے کا بانکپن اور آواز کی صلابت ہے جو طبیعت کی رقت اور گداز کو قابو میں رکھنے سے پیدا ہوتی ہے بہرحال مانوس ایک غم پسند شاعر کی حیثیت سے اپنی ایک انفرادیت ضرور رکھتے ہیں اور اس اعتبار سے انھیں نظر انداز نہ کیا جاسکے گا۔

مانوس کے کلام میں معنوی وسعت تخیل کا خروش لہجے کا تنوع، انداز بیان کی سرشاری اور والہانہ پن خاص چیزیں ہیں جو ہر ایک حساس قاری کو فوراً متاثر کرتی ہیں۔

ان کے یہاں بظاہر رسمی اور روایتی مضامین کا بھی بیان ہوا ہے مگر اس کی مثالیں ان کے کلام میں بہت کم ہیں انھوں نے غزل کی مروجہ اور مانوس علامتوں سے کام لیا ہے مگر ان کی معنوی فضا یکسر بدل دی ہے ان کی بعض تراکیب میں بھی بڑی جدت اور ندرت پائی جاتی ہے ہم ان کی غزل گوئی سے بحث کرتے ہوئے اس خصوصیت کی نشان دہی کر چکے ہیں اس لئے یہاں اس کی تکرار کرنا نہیں چاہتے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مانوس کی شاعری کا یہ پہلو ان کے ایک اچھے اور منفرد شاعر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

مانوس جعفر علی خاں اثر اور حامد حسن قادری جیسے نقاد ان فن سے اپنے کلام کی داد پا چکے ہیں یہ اور بات ہے کہ اردو کے سنجیدہ ناقدین اور اہل قلم ان کی طرف سے ابھی تک بالعموم بے اعتنائی برت رہے ہیں اور اردو غزل کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا نام فراموش کر جاتے ہیں انصاف کی بات یہ ہے کہ مانوس تغزل کے جملہ آداب اور تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور اپنے انفرادی مزاج اور انداز سے متاثر کرتے ہیں مانوس نے رباعیات اور نظمیں بھی کہیں ہیں نظمیں دو ایک ہیں اور ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں، ہاں ان کی رباعیات البتہ خصوصی توجہ کی مستحق ہیں اور اپنے موضوع اور طرز بیان کی ندرت

؎۱ نالۂ شبگیر، مقدمہ از عبدالغنی ص ۹

کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ اردو کے شعری سرمائے میں یہ رباعیات گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں جن کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہوگا۔ یوں ان کے شعری کارناموں میں اصل اہمیت ان کی غزلوں کی ہے جنھیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ یہ بات یقیناً افسوسناک ہے کہ اردو کے ناقدین اور قارئین کا سنجیدہ حلقہ مانوس کے نام اور کلام سے ابھی تک مانوس نہیں ہو سکا ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مانوس کی شاعری اپنی منفرد آواز مزاج اور فضا سے پہچانی جاتی ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ مانوس اردو کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں اور اردو کے ممتاز غزل گویوں میں شمار کئے جانے کے مستحق تو قع ہے کہ مانوس کے کلام کی قدر و قیمت کا آنے والے دنوں میں زیادہ صحیح اور بہتر اندازہ کیا جا سکے گا زمانے کی جانچ پرکھ کی اپنی کسوٹی ہے کیا عجب ہے کہ آنے والا دور جب کھوٹے اور کھرے کی پرکھ کرے تو مانوس کو ان کا جائز اور بلند مقام مل جائے۔

عبدالمغنی نے یہ کہہ کر کہ جدید غزل میں میر کا کوئی وارث فانی کے بعد کہا جا سکتا ہے تو وہ سب سے اول مانوس سہسرامی ہیں ذکر فراق یا ناصر کاظمی، ممکن ہے کسی قدر مبالغے سے کام لیا ہے مگر ان کی یہ رائے برحق ہے اور اردو شاعری اور غزل میں ان کا صحیح مقام متعین کر دیتی ہے۔

"عصر حاضر کی غزل گوئی کی کوئی تاریخ مانوس جیسے منفرد شاعر کے تذکرے کے بغیر ناقص ہوگی" ؎۱

؎۱ ناوکِ شبلیہ مقدمہ از عبدالمغنی ص۱۱

میرا گھر

مسعود جاوید ہاشمی

بنیادیں اخلاص کی گہری
پکی سب اینٹیں جذبوں کی
بھاری بھاری عزم کے پتھر
حسنِ عمل کا چونا اندر

صبر رضا اونچی دیواریں
سایہ افگن رحمت کی چھت
مہر و مروت، الفت کھمبے
لٹکے کچھ فانوس وفا کے

عدل و قسط پہ شاہد آنکھیں
قلب کی وسعت کے دروازے
پیشانی میں پنہاں سجدے
شرم و حیا کے ان پر پردے

استقبال کو دیواروں پر
چہرے پیار کا دلپن درپن
آویزاں الفت کے نقشے
آنکھیں آنسو کے سرچشمے

اشکوں کے موتی کے جھالر
جود و سخا کا کچھ تصویریں
سادہ دل، پاکیزہ شیشے
پاسِ عہد کے دلکش نغمے

حلقے پیار محبت کے ہیں
حسنِ نظر کے خواب سہانے
اپنے پن کی زنجیریں ہیں
روشن روشن تعبیریں ہیں

تری وفا کے اُداس منظر

سیّد احمد اختر

تری وفا کے اداس منظر
کنارِ دریا پہ دھنک بہتے پانیوں پر بچھے ہوئے ہیں
جدائیاں اسی طرح تھیں
ملاپ بھی تیری میری آنکھوں میں درد بن کر سجے ہوئے ہیں۔
مرے قریب اک جوان جوڑا سہاگ خوشبوں کی خوشبوئیں نشر کر رہا ہے۔
وہی تبسم وہی وفا سے بھری نگاہیں وہی ہمیشہ کا ساتھ دینے کے بولتے اور خموش وعدے
ہوائیں خنکی بھی ہے نمی بھی
دماغ و دل میں اتر رہی ہے پرانی خوشیوں کی بانسری بھی
مچلتی لہروں کے آئینے میں وہ کھیت بھی لہلہا رہا ہے
وہ سنگِ مرمر کا کارخانہ، وہ باغ کا رازدار گوشہ
وہ راستوں کی گداز باہیں، وہ منزلوں کی مراد مندی
وہ نیند صبحیں، وہ خواب شامیں، وہ پھول لمحے ترے لبوں تیرے گیسوؤں سے اُتر اُتر کر فضا میں
تحلیل ہو رہے ہیں۔

یہ آب اور یہ سراب کیا ہے!
جو خواب تھا کیسے رُک گیا ہے؟
چٹان بن کر ہر ایک لمحے پہ جھک گیا ہے۔
نہیں ہے تو اور ہر کہیں ہے،
مرا فلک ہے مری زمیں ہے
مگر کہاں ہے
یہی جو میرے قریب بیٹھی خود اپنی چاہت میں اتنی خوش
ہے کہ میرا غم بھی سمجھ رہی ہے؟
یہی تہمت ہے۔ گذار لوں گا یہ خواب ہیں یا تری وفا کے
عذاب ساتھی
سجے رہیں تیرے گیسوؤں میں محبتوں کے گلاب ساتھی۔

۲۸

آخری متر

ایک روسی کہانی

جوزاس بالتوس
اردو ترجمہ: ضیاء الحسن۔ لاہور

وہ خاصی عمر رسیدہ خاتون تھی ـــــ وہ آرام کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے بازو کرسی کے بازوؤں پر دھرے تھے۔ اس نے مجھ سے نرمی سے پوچھا۔

"میں آپ کیلئے کیا کر سکتی ہوں؟

میں نے اسے بتایا کہ میں ایک طویل عرصہ سے بہت سخت بیمار ہوں اور مجھے صحت کی کوئی امید نہیں رہی ـــــ اور یہ کہ میں نے اس کے بارے میں اتنا کچھ سنا ہے اس لئے میں اس سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔

"کیا آپ نہیں جانتے کہ میں اب پریکٹس نہیں کرتی"!

"مجھے علم تھا ڈاکٹر لیکن میں مرنا نہیں چاہتا۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ مجھے علم ہو کہ کوئی شخص میری مدد کر سکتا ہے چاہے۔ وہ پنشن یافتہ ہی کیوں نہ ہو اور پریکٹس چھوڑ چکا ہو ـــــ

وہ مسکرائی ـــــ لیکن سنجیدہ لہجہ اختیار کئے ہوئے کہا۔

"اب جبکہ یہاں بہت سارے ہسپتال، کلینک اور ڈسپنسریاں ہیں آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں"؟

میں کچھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ وہ خود بھی خاموش تھی اور اس کے بازو آرام کرسی کے بازوؤں پر دھرے تھے۔ اس کی فراخ پیشانی، برف سے سفید بال اور روشن نیلی آنکھیں اس کی شخصیت کے وقار میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایسا وقار جسے تکبر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو دروازے کی جانب جانے پر آمادہ کیا۔

ٹھہرو ـــــ! مجھے بتاؤ کہ تمہاری تشخیص کیا کی گئی ہے؟

"لاعلاج حد تک عارضہ، ضعف قلب"

لاعلاج ـــــ!

ہاں ڈاکٹر ـــــ!

وہ زیر لب مسکرائی ـــــ کتنی حیرانی کی بات ہے کہ لوگ آج کل طب میں اتنے ماہر ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے ذرا میری چھڑی تو دینا"

چھڑی کونے میں رکھی تھی۔ یہ بھاری اور ہموار چھڑی سیب کی لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ وہ چھڑی پر زور دیکر جھکی اور مجھے دیکھا۔ "مہربانی کرکے اپنی قمیض اتار دو"

اس نے چھڑی کے سہارے چلتے ہوئے میرا معائنہ شروع کیا۔ میرے دل کی دھڑکن سنی، میرے سینے اور پشت کو تھپتھپایا۔ میری نبض دیکھی، مجھے اٹھایا، بٹھایا، لٹایا، دوبارہ اس طرح اٹھایا کہ اپنے وزن پر کھڑا رہوں۔

اب تم اپنی قمیض پہن لو"

اپنی چھڑی سے کھٹ کھٹ کرتی وہ ایک علیحدہ کمرہ میں غائب ہو گئی، جہاں اس نے اپنے ہاتھ دھوئے اور کچھ برتنوں کو ادھر ادھر کیا۔ وہ لوٹی تو ویسی ہی بے پرواہ لگ رہی تھی جیسی ابتدا میں تھی۔

"ڈاکٹر میں نہیں مروں گا ناں؟ میں نے اپنی آواز کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔" کیا میں مر جاؤں گا؟"

" ہاں تم مر جاؤ گے"

مجھے یوں لگا جیسے اگلے ہی لمحہ مجھ پر دورہ پڑے گا، ویسے ہی شدید درد جیسا جو مجھے موت کے کنارے لے آئے تھے۔ اس لمحہ میرے دل میں اس عورت کیلئے شدید غصے کے جذبات ابھرے۔ کیا یہ تجربہ کار ڈاکٹر یہ تک نہیں جانتی کہ مریضوں سے تلخ سچائیاں چھپائی جاتی ہیں۔ کیا ہوا جو میں مایوس کن حد تک بیمار ہوں اور موت میرے پیچھے اپنے پنجے تیز کر رہی ہے۔ ایک ڈاکٹر کو ہمیشہ یہی کہنا چاہیئے کہ میں روز بروز بہتر ہو رہا ہوں اور جلد ہی بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بہرحال زندگی کے آخری لمحے تک زندگی کا یقین رکھتے ہوئے مرنا زیادہ آسان ہے۔ کیا یہ سب کچھ یہ نہیں جانتی؟

"اس نے گویا میرے خیالات کو پڑھتے ہوئے کہا۔ ہاں تم مر جاؤ گے"

"لیکن ڈاکٹر ——— !"

"ہمیں سب کو مرنا ہے۔" وہ دوبارہ اسی انداز میں کرسی کے بازوؤں پر بازو پھیلا کر بیٹھ گئی۔ "کوئی اور انسان ہماری تمہاری جگہ نہیں مریگا۔" وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر کہا" جاؤ اور ایک ہفتے بعد آنا۔ مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت چاہیئے

"سوچنے کے لئے"؟

" ہاں! بعض اوقات ڈاکٹروں کو سوچنے کیلئے وقت درکار ہوتا ہے۔ لیکن آتے وقت اپنی تمام رپورٹیں اور تجزیے لیتے آنا"

"لیکن ڈاکٹر، کیا تمہیں دوسرے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں ہے۔

"کیا تمہیں ہے۔؟ وہ میری پریشانی پر مسکرائی۔ شاید سقراط نے کہا تھا کہ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا، میں سب کچھ خود دیکھنا چاہتی ہوں۔ ڈاکٹر بھی آخر انسان ہوتا ہے اور غلطی بھی کر سکتا ہے"

ایک ہفتے کے بعد اس نے میرے تمام نسخے احتیاط سے مطالعہ کئے۔ مختلف ٹیسٹوں کے نتائج کو بغور پڑھا اور پھر کاران کا بنڈل بنا کر مجھے دے دیا۔ اور کہا، تم ان سب کو گھر جا کر کوڑے کے ڈرم میں پھینک سکتے ہو"

لیکن ڈاکٹر ——— !

ٹھہرو! پہلے ہمیں کچھ باتیں طے کر لینی چاہئیں۔ ہمارے ڈاکٹری پیشے میں ایک مثلث بنتی ہے۔ ڈاکٹر، مریض اور اس کی بیماری۔ اگر ڈاکٹر اور مریض اپنی توانائیاں کو مجتمع کر لیں تو وہ بیماری پر قابو پاسکتے ہیں۔ لیکن جب مریض ڈاکٹر کی مخالفت اور بیماری کی طرفداری کرتا ہے تو ڈاکٹر تنہا رہ جاتا ہے اور اسکی تمام مہارت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ پہلے یہ طے ہونا چاہیے کہ تم کس کی طرفداری کروگے، میری یا اپنی بیماری کی؟"

"بھلا یہ کیا سوال ہوا۔ تم جو کہوگی میں کروں گا"

"ٹھیک ہے، تو پہلے تو ہم ایک ایک جام شراب کا پیتے ہیں"۔

"شراب ــــ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"علاج شروع کرنے کیلئے یہ میری پہلی شرط ہے"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

لکڑی کی اس دو منزلہ عمارت میں دوسری منزل پر واقع اس کے اپارٹمنٹ تک جانے کیلئے سیڑھی کے بارہ قدم تھے اور مجھے دم لینے کیلئے چار بار رکنا پڑا۔

"ڈاکٹر! کیا تم چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں؟"

"مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" وہ اٹھی اور چھڑی سے کھٹ کھٹ کرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ جلد ہی شراب کے دو بلوری گلاس شراب کی ایک بوتل اور ایک پلیٹ میں کچھ بسکٹ لیکر واپس آگئی ــــ اس نے جھاگ اڑاتے سیال کو گلاسوں میں انڈیلا۔ ایک خود اٹھایا اور کہا ــــ اب ہم گلاس ٹکرائیں گے اور شراب پئیں گے۔

"ڈاکٹر کیا ایسا کرنا ٹھیک رہے گا؟"

"پی جاو!"

مجھے گلاسوں کی کھنکھناہٹ فضا میں تیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے ہونٹوں سے شراب کو چھوا۔ میں ابھی تک زندہ تھا۔ مجھے اپنے بدن میں کیف و سرور کی لہریں سی ہلکورے لیتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بعد میں فوراً ہی ماضی کی دھندلکوں میں کھو گیا۔ جب میں صحت مند تھا اور چھٹیاں اپنے دوستوں کے ساتھ مستقبل میں ایک طویل اور پرلطف زندگی کیلئے خم لنڈھاتے ہوئے گزارا کرتا تھا اور پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ وہ دن دوبارہ بھی آسکتے ہیں

"ڈاکٹر تم تو کوئی افسوں گر ہو!"

"اور اب تمہیں محبت میں گرفتار ہو جانا چاہیئے۔

"کیا؟"

"علاج شروع کرنے کیلئے یہ میری دوسری شرط ہے" وہ نہایت سکون سے بولی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا

شائبہ تک نہ تھا۔ وہ مذاق نہیں کر رہی تھی۔ اسکی شفاف آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس پر اعتماد نہ کیا جاسکتا ہو۔

"لیکن ڈاکٹر میں شادی شدہ ہوں"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ محبت تو بہرحال تمہیں کرنا ہی ہے"

"اور میرے بچے بھی ہیں ڈاکٹر!" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تین بچے"

"میں تم سے یہ پہلی دفعہ سن رہی ہوں کہ بچے محبت کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں!"

مجھے محسوس ہوا کہ میرے الفاظ رائیگاں ہی گئے۔ یہ عورت دوسرے ڈاکٹروں سے مختلف تھی اور اس کا طریقہ علاج بھی دوسرے ڈاکٹروں سے مختلف تھا۔

"اس کے علاوہ میرا دل بھی کمزور ہے۔ جذباتی انتشار میرے لئے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے"

"تمہارا دل کمزور نہیں ہے"

"میرا دل کمزور نہیں؟" لیکن میں عارضہ ضعف قلب کا شکار ہوں"

ایک مسکراہٹ سی اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔ "حیرانی کی بات ہے ان دنوں کسقدر لوگ علم طب میں ماہر ہو گئے ہیں!"

ان الفاظ پر اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکا۔ "ڈاکٹر ہمیں بے تکلفی سے کام لینا چاہیے۔

"ساتھ چلنے کے لئے ہمارے پاس یہی ایک راستہ ہے" اس نے کہا۔

"فرض کرو میں تمہاری ہدایت پر عمل کروں اور محبت میں مبتلا ہو جاؤں"

"ہاں تمہیں ایسے ہی کرنا ہوگا"

"لیکن کون لڑکی مجھ سے محبت پر مائل ہوگی؟ میں کبھی بھی خوش شکل نہیں رہا اور اب میں بیمار اور دبلا ہوگیا ہوں۔ میں جوان بھی نہیں رہا۔ میری عمر پچاس سے بھی اوپر ہے"

"میں بالکل بھی نہیں سمجھی کہ تم کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟"

"خیر، فرض کرو میں تلاش کر لیتا ہوں ...... فرض کرو میں تمہاری تجویز پر عمل کرتے ہوئے کسی کو پسند کر لیتا ہوں لیکن یہ تو ضروری نہیں کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرسکے"

"لیکن میں نے تو کسی لڑکی کی طرف اشارہ نہیں کیا"

"کیا تم نے نہیں کہا"؟

"میں نے صرف محبت کی بات کی ہے کہ تمہیں محبت میں مبتلا ہو جانا چاہیے"

"لیکن کس کے ساتھ؟"

یہ تمہارا معاملہ ہے

"اوہ!"

"اور تمہاری محبت کسی چیز کے عوض نہیں ہونی چاہیے، چیزوں کو دیکھنے کا یہ کتنا خود غرضانہ رویہ ہے! یعنی میں تمہیں ایک چیز دوں تاکہ اس کے بدلے میں تم مجھے کوئی چیز دو۔ نہیں، نہیں یہی کافی ہے کہ تم محبت کرو"

اور اس طرح اماں نے اپنا علاج شروع کیا۔ یہ سب کچھ حیران کن اور ناقابلِ یقین تھا۔ جتنا ہم آگے بڑھے اتنا ہی اس کا علاج تعجب انگیز ہوتا چلا گیا۔ وہ میری زندگی کے طور طریقوں اور پروگراموں میں خرابی پیدا کرتی چلی گئی۔ اس نے میری پرہیزی غذا باہر پھینک دی۔ "جو کچھ اور جتنا چاہو کھاؤ"

اس نے کہا کہ میں ممکنہ حد تک چست ہو جاؤں۔ ورزش کیا کروں، چھ گھنٹے تازہ ہوا میں سانس لوں اور کھڑکیاں کھول کر سویا کروں"

"لیکن کھڑکیاں تو سردیوں کے لئے بند کر دی گئی ہیں"

"انہیں پھر کھول لو، کیا تم صبح ورزش کرتے ہو؟"

"تم سنجیدہ نہیں ہو سکتیں"

"ہمارے پاس مذاق کیلئے ابھی بہت وقت ہے ۔۔۔ فی الحال تو تم صبح کی ورزش کا آغاز کر دو۔ ابتدا میں پانچ منٹ اور رفتہ رفتہ دس منٹ تک ۔۔۔ میں تمہیں بتا دوں گی کہ تمہیں کون سی ورزش کرنی چاہیے"

"لیکن ڈاکٹر! مجھے تو ہدایت کی گئی ہے کہ میں اپنے بازو کندھوں سے بھی اوپر نہ لے جاؤں"

"بالکل ٹھیک۔ لیکن تمہیں ان کو اس سے بھی اوپر لے جانا چاہیے، تم میری زیر نگرانی آغاز کرو گے اور ویلینس (VALENTINUS) میں واقع جسمانی طریقہ علاج کی ڈسپنسری میں اسے جاری رکھو گے"

اس نے اس انداز میں کہا جیسے اب اس بات میں شک کو شبہ اور اعتراض کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں کچھ سوچنے کا موقع دینا تو ایک طرف، دوسرے ڈاکٹروں کی تجویز دواؤں کی خوراک بھی کم کر دی۔

انسانی جسم بیماری کے مقابلے میں دماغی طریقہ کار سے اچھی طرح واقف ہے" اس نے کہا" لیکن اس کی مدد کی جانی چاہیے۔ مدد! نہ کہ چکرا دینے والی دواؤں سے اسے بے حال کر دیا جائے جیسا کہ بعض ڈاکٹر اسے لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ ایک عضو کا علاج کرتے ہیں اور بہت سوں کو تباہ کرتے ہیں"۔

"یہی تو علاج بالمثل (ہومیوپیتھی) کرنے والے کہتے ہیں"

آجکل لوگ ادویات کے بارے میں کافی کچھ جاننے لگ گئے ہیں" اس نے دخل اندازی کی۔ علاج بالمثل پر تنقید میں اتنی تیزی نہ کرو اس قدیم سائنس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں"

"مجھے افسوس ہے"

جب بھی میں اس کے پاس جاتا وہ اپنی چھڑی سے ٹک ٹک کرتی میرے اردگرد گھوم کر میرا مکمل معائنہ کرتی اور جس وقت

مجھ کو ہفتے میں لوٹ آنا۔ اور میں ایسا ہی کرتا۔ میں ہمیشہ ایک تنہا سفید بالوں والی عورت کو خاموشی سے کرسی پر بیٹھے ہوئے پاتا جو کرسی کے بازؤں کا سہارا لیئے آرام سے دراز ہوتی۔ کمرہ سادگی سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں کے ساتھ کتابوں کی الماریاں تھیں۔ ایک میز تھی اور ایک ... میز پر اخباروں اور رسالوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ جس میں مقامی بھی تھے اور غیر ملکی بھی۔ بہت سے ڈاکٹروں کی طرح وہ مطالعے کی شوقین اور اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کے معیار پر بحث کرنے میں مستعد تھی۔ شام کے وقت وہ ریڈیو سنتی یا ٹی وی کا کوئی پروگرام دیکھتی اور اکثر جاپانی ہاتھی دانت کے بنے ہوئے شیر کو انگلیوں سے سہلاتی رہتی۔ یہ ایک عجیب و غریب تخلیق تھی۔ جسامت میں کم مگر ظاہراً ایک عظیم اور ہیبت ناک درندہ — اس کے تیز دانت اس کے کھلے ہوئے منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے اور اس کی مضبوط دم کوڑے کی مانند پشت پر پڑی تھی۔

"کیا اس سے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے؟" ایک دفعہ اس نے مجھے شیر کی جانب دیکھتا پا کر پوچھا

"نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔" میں نے بوکھلا کر جواب دیا۔ "میں خوش ہوں کہ ایسا نہیں ہے!"

تھوڑے وقفے کے بعد اس نے مزید کہا — "یہ بہت قیمتی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ یہ ہاتھی دانت کا بنا ہوا ہے۔"

وہ دوبارہ خاموش ہو گئی اور پھر دبی دبی خفگی سے بولی۔ "تم کس قدر کم فہم ہو۔ کیا تمہیں اب تک کوئی لڑکی ملی؟" اچانک اس نے پوچھا۔

"لڑکی؟ لیکن ڈاکٹر تم نے یہ تو نہیں کہا تھا......"

"میں نے تمہیں محبت کرنے کیلئے کہا تھا اور اگر تمہیں اور کوئی نہیں ملتا تو ایک نوجوان لڑکی تو مل سکتی ہے" اس نے سختی سے کہا۔

اگلے ہی لمحے اس نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے بعض اوقات اپنے مریضوں کو یہ راستہ بھی دکھانا پڑتا ہے۔"

اور اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ اور پھر دو ہفتے مزید بھی۔ پھر ایک دن خصوصی مکمل معائنہ کے بعد اس نے ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر میری آنکھوں میں دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ٹھوڑی ہولے ہولے کپکپا رہی تھی اور ایک آنسو اس کی پلکوں پر لرز رہا تھا

"اچھی تبدیلی ہے" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

میں نے خود بھی محسوس کیا تھا۔ اگرچہ یہ تبدیلی بہت ہلکی تھی مگر تھی۔ میرے اندر کہیں گہرائی میں۔ شاید صرف میرے تحت الشعور میں کوئی نئی چیز جنم لے رہی تھی۔ نشوونما پا رہی تھی۔ کوئی غیر معمولی چیز۔ جسے الفاظ میں ڈھالنا مشکل ہے۔ یہ ایک مخفی سی مسرت تھی جو کسی آنے والی خوشی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ میرے اندر حرکت و عمل اور معاملات زندگی میں شمولیت کی خواہش سر اٹھا رہی تھی۔ ایک عرصے سے کھوئی ہوئی خواہش کہ لوگوں کے ساتھ رہا جائے اور ان سے باتیں کی جائیں۔ دوبارہ دل میں کروٹیں لینے لگی۔

وہ اٹھی۔ اس کی چھڑی فرش سے زور سے ٹکرائی اور دوبارہ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی "ایک ہفتے کے اندر لوٹ آنا" اس نے کہا۔

اور میں لوٹ گیا۔ ایسا کئی ہفتوں تک ہوتا رہا۔ ہر مرتبہ میں نے لکڑی کے زینے کو زیادہ تیز رفتاری سے طے کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ

جیسے میری شریانوں میں تازہ خون گردش کرنے لگا ۔ میری دھڑکن میں ترتیب تھی اور آنکھیں زیادہ چمکدار ہو گئیں

"ڈاکٹر ! اب میں صحت یاب ہو رہا ہوں"

"ایک ہفتے کے بعد آنا"

"لیکن اب میں ٹھیک ہو رہا ہوں ۔ ڈاکٹر کیا تم نہیں سمجھ سکتیں ! میں صحت یاب ہو رہا ہوں"

"آج کل لوگ ادویات کے بارے میں کچھ زیادہ ہی جاننے لگ گئے ہیں"

اور پھر وہ دن بھی آیا جب وہ خود بھی پرامید دکھائی دینے لگی ۔

"ایک کپ کافی ہو جائے" میں نے کہا

"خوشی سے ۔ لیکن مجھے ایسا کرنا چاہیے ۔ یہ تمہارے دل کیلئے نقصان دہ ہے"

"واقعی ! میں نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی ۔ میں اسے زندگی بھر پیتا رہا ہوں ۔ لیکن اس سے قبل کبھی اس بات پر غور نہیں کیا"

تھوڑی دیر بعد میز پر دو کپ کافی رکھ دی گئی ۔ وہیں جہاں کبھی شراب کے دو بلوری گلاسوں میں بلبلے بن رہے تھے ۔ اس نے ایک کپ میں کافی میرے لئے انڈیلی اور پھر اپنے لئے ۔ میں نے غور کیا کہ اس نے سفید بلاؤز پہن رکھا ہے ۔ یہ اس نے پہلے کبھی نہ پہنا تھا ۔ اس کے سفید بال مختلف طریقے سے بنے ہوئے تھے اور قوس قزح نما کنگھے سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے ۔ اس نے پیالوں میں کافی انڈیلی ۔ پھر اس نے اپنے رخسار کو ہاتھ پر ٹکایا اور میری طرف دیکھ کر اس قدر پرکشش طریقے سے مسکرائی کہ اس بات پر یقین مشکل ہو گیا کہ وہ اسّی سال سے زائد عمر کی عورت ہے ۔ جس نے اب تک اپنے بہت سے دوستوں کو قبر تک جاتے دیکھا تھا ۔ اور جس کو علم تھا کہ وہ دن بھی زیادہ دور نہیں جب وہ خود بھی اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گی ایسا لگتا تھا جیسے اس کی مسکراہٹ سے روشنی پھوٹ رہی ہے بلکہ اس کے سفید بال شفاف نیلی آنکھیں اور سارا جسم روشنی کا منبع ہے ۔ وہ نوجوان خوبصورت اور کسی حد تک ایک شرمیلی لڑکی معلوم ہو رہی تھی ۔

"ایک ہفتے میں آجانا ــــ مجھے بھولنا نہیں"

ایک برس گزر گیا اور مکمل طور پر بھول گیا کہ میں کبھی اس کے لکڑی کے زینوں پر دم لینے رکا تھا ۔ ماضی کا اضطراب ختم ہو گیا ۔ جب بیماری کا ایک حملہ یہ دہشت ناک احساس دلایا کرتا تھا کہ فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے اور عورت ہر جگہ میرا انتظار کر رہی ہے ۔ میں اسے اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں ۔ اور یہ سب اس عجیب "تنہا پسند" ناقابل فہم عورت کی وجہ سے ہوا ۔

"یہ سچ نہیں ہے" اس نے کہا اور مسکرائی "! تم خود زندہ رہنا چاہتے تھے"

"کیا ہر شخص زندہ رہنا نہیں چاہتا ؟"

"نہیں ــــ"

"میری ابھی تک کسی بھی ایسے شخص سے ملاقات نہیں ہوئی جس میں زندگی کی خواہش نہ ہو"

یں ایسے بہت سے لوگوں سے ملی ہوں ۔" اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا ۔ اس نے رخسار کو ہاتھ پر ٹکایا اور خاموش
گئی "۔ لوگ ٹھیک ہو جاتے ہیں اور پھر سے اپنی زندگیاں مختصر کرنے میں لگ جاتے ہیں ۔" اس نے سوچتے ہوئے بات کا سلسلہ جاری
ا ۔ جیسے وہ خود سے باتیں کر رہی ہو

" ایسا کون کرتا ہے ؟"

" لوگ ! ؟" اس نے اداسی سے کہا ۔ " وہ سگریٹ پیتے ہیں ۔ رات کو کام کرتے ہیں اور دن کو سوتے ہیں ۔ دوڑتے
گتے ہوئے کھاتے ہیں ۔"

لیکن .... !

" اور تم بانہیں میں سے ایک تھے " اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا ۔ اس کی آواز میں خفگی تھی " تمہاری حالت بہت سوں
ے بدتر تھی ۔ تمہارے اندر جینے کی امنگ نہیں تھی "۔

" یہ سچ نہیں ہے "

" یاد کرو ـــ جب تم پہلی بار یہاں آئے تھے تو تم نحیف و نزار تھے ۔ سب لوگوں سے بدتر حالت میں ۔ پھر یوں ہوا
ہارے دل میں اپنے ساتھیوں کے لئے محبت نہ رہی بلکہ اپنے لئے بھی نہیں اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اگر تم تبدیل نہ ہوتے
لدی ہی مر جاتے "۔

اس گفتگو نے اسے تھکا دیا اور وہ ایک طویل وقفے کیلئے خاموش ہو گئی ۔ اس کے بازو ہمیشہ کی طرح کرسی پر آرام سے
ے تھے ۔ آخر اس نے نرم آواز میں اپنی بات کا سلسلہ پھر شروع کیا ۔

" موت ہمیشہ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہے ۔ یہ ایندھن ہے جو اسے بحال رکھتا ہے "۔ پھر اس نے مزید کہا ۔
نہ کی طرح حکم سے نہیں بلکہ درخواست کے انداز میں ۔ " اسے چھوڑ دو ۔ تم ہفتے میں دوبارہ آیا کرو اور ایسا کرو گے تو مجھے
ہوگی ۔

" ان میں خود کو کافی بہتر محسوس کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ مجھے اب تمہارا مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے "۔
" تم میرا وقت ضائع نہیں کرتے اور اگر تم نہ آسکو تو کوئی بات نہیں ۔" اس نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے
۔ پھر وہ اٹھ گئی اور اس کی چھڑی ایک زور دار آواز کے ساتھ فرش پر گر پڑی

اس کے بعد میں جتنی بار آیا گرم کافی کا برتن ڈھانپا ہوا ملتا ۔ ایک چھوٹی پلیٹ میں بسکٹ اور دوسری میں پھل ہوتے ۔ وہ
لباس میں تھوڑی سی شرمائی ہوئی سی میز کے قریب بیٹھی ہوتی وہ براہ راست میری طرف نہیں دیکھتی تھی بلکہ کافی انڈیلنے لگتی
باتیں کرتے ۔ باتیں کرنے کے لئے بہت سی چیزیں تھیں ۔ وہ ہر موضوع پر قائل کر دینے والے انداز میں دلائل دیتی لیکن ایک
ایسا تھا جس پر اس نے کبھی بات نہ کی اور وہ تھا اس کی اپنی زندگی ۔ اس کا ماضی ۔ اس کا نام نتالیہ تالوشیتی
(NATALVIA TALAISHEA) تھا ۔ نتالیہ روسی نژاد تھا ۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے پوچھا ۔ " کیا تم روسی ہو "؟

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے!" پھر اس نے میری بوریت کو محسوس کیا اور بولی۔ "کافی لو۔ بسکٹ بھی عمدہ ہیں۔ میں منگل کو تمہارا انتظار کروں گی ——— آؤ گے!"

اس سے ملنے کے لئے وقت نکالنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں اب پہلے کی نسبت توی تھا۔ میں نے اپنے سابقہ تقریباً ناقص طرز زندگی کو ختم کر دیا تھا۔ آج کل کرنے کے لئے بہت سی چیزیں تھیں۔ بہت سی دلچسپ چیزیں۔ نئے لوگ میری زندگی میں داخل ہوئے اور پرانے دوست دوبارہ نمودار ہوئے۔ رفتہ رفتہ اور مستقل طور پر ڈاکٹر سے ملنے کی ضرورت کم ہوتی گئی۔ بہت شرمندگی کے ساتھ میں نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ ایک صحت مند مریض سب سے پہلے اس ڈاکٹر کا قرض فراموش کر دیتا ہے جس نے اس کو صحت یاب کیا ہوتا ہے۔ لیکن وہ میرا انتظار کرتی رہی۔ خاموشی اور صبر کے ساتھ۔ ہمیشہ اپنے بہترین لباس میں ——— کافی کے برتن، بسکٹ اور پھلوں کی پلیٹوں کے ساتھ

"تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔" اس نے ایک بار کہا۔ "اور اب کافی دوبارہ ٹھنڈی ہو چکی ہے۔" اس روز ہم اپنی گفتگو زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکے۔ ایک ہفتہ گزر گیا ——— پھر ایک اور ——— اور پھر تیسرا۔ مگر مجھے اس خاتون کے پاس جانے کا وقت نہ ملا جس نے مجھے زندگی لوٹائی تھی ——— پھر بہار آ گئی۔ ولینیس (VILNIUS) کے تمام درختوں کو سبز پتوں نے ڈھانپ لیا۔ زمین نے جیسے سبز لباس پہن لیا۔ لینن اسکوائر پر کبوتر گٹر گوں کر رہے تھے۔ آسمان شہر سے بہت اونچا دکھائی دے رہا تھا۔ عورتوں نے بہار کے ملبوسات زیب تن کئے ہوئے تھے۔ بہار تمام تر اداسیوں اور مایوسیوں کو ختم کرتی ہوئی۔ بچوں کو ہنسنے اور بڑوں کو مسکرانے کی دعوت دیتی ہوئی۔ لوگوں کے دلوں میں کیفیت جگاتی ہوئی گلیوں اور شاہراہوں پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ ایک ایسا ہی دن تھا جب مجھے ایک عجیب سی عورت نے بلایا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

اس نے برہمی سے مجھے دیکھا اور بولی "نتالیہ نے آپ کو بلایا ہے۔ اگر آ سکیں تو۔" کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی سے ملیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی اجنبی سے مل رہے تھے ——— ایک ایسے شخص سے جس میں اس شخص والی کوئی بات نہ تھی جس کو آپ جانتے تھے اور جو آپ کا دوست تھا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ——— میں نے لکڑی کا زینہ طے کیا اور اوپر آیا جہاں ایک بوڑھی عورت کے چہرے پر موت کا تاریک سایہ لہرا رہا تھا۔ اس نے سرد اور تاریک آنکھوں سے میری طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا۔

"شکریہ!" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ڈاکٹر! پلیز مجھے معاف کر دو۔" میں اس کی حالت پر لرز کر بڑبڑایا۔ اس کی انگلیاں پھڑکیں، جیسے کہہ رہی ہو کہ کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ——— اس نے میز پر سے کاغذ کے دو ورق اٹھائے جو پورے لکھے ہوئے تھے۔

"میں نے ہر چیز لکھ دی ہے۔" اس نے کہا۔ اس کے لب بولتے ہوئے کپکپا جاتے تھے۔

"اگر تم دوبارہ بیماری میں مبتلا ہو جاؤ تو اسے پڑھ لینا۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر! مجھے ان ہدایات کی ضرورت نہیں، میں روزانہ تمہارے پاس آیا کروں گا۔ تمہیں ملنے۔ تم سے مشورہ لینے۔ اس کا

آنکھوں میں اندیشے دیکھ کر میں تیزی سے بولا۔ "نہیں میں مسکراؤں گا"

وہ خاموش تھی۔ جیسے کسی چیز کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ جیسے اندر کی کسی آواز کو سن رہی ہو۔ پھر اس نے کسی قدر شرماتے ہوئے کہا
"کیا تم مجھے پیار کر سکتے ہو؟"

میں جھکا میں نے اس کی پیشانی کو چوم لیا

"اب جاؤ۔ اس نے چہکتے ہوئے کہا ــــ اور ہر چیز کے لئے ..... تمہارا شکریہ"۔

"کیا تم میرا شکریہ ادا کر رہی ہو ـ؟"

"جاؤ!"

سو میں چلا آیا۔ برآمدے تک پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے واپس جانا چاہیے۔ نتالیہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ ایک زرد مسکراہٹ اس سرمئی سائے سے نبرد آزما تھی جو اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا

"ڈاکٹر!" میں چلایا!

"چلے جاؤ"

میں سیڑھیاں اتر آیا۔ وہی سیڑھیاں جنھیں پہلی مرتبہ میں نے مشکل سے طے کیا تھا۔ اچانک میں رک گیا۔ ایک عجیب سی کمزوری مجھ پر چھا گئی۔ میں کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گیا کہ نیچے اتروں یا لوٹ جاؤں۔

"مجھے تمہارے قدموں کی آواز نہیں آ رہی" اوپر سے ایک کمزور سی آواز آئی۔ "میں تمہیں جاتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔ چلے جاؤ"
اور میں چلا آیا۔

اگلے ہی روز ــــ جو پھولوں سے معطر تھا اور کیرولینن کی پہاڑیوں سے ہوائیں آ رہی تھیں۔ وہ عجیب سی عورت پھر میرے پاس آئی۔ اس نے پہلے کی طرح بولے بغیر برہمی سے میری طرف دیکھا۔ پھر مجھے ایک چھوٹا سا پیکٹ دیکر بولی۔ "یہ تمہارے لئے ہے"!

میں نے پیکٹ کھولا، یہ ایک شیر تھا۔ ہاتھی دانت سے بنا ہوا بالکل ویسا ہی شیر۔ تیز دانتوں اور مضبوط دم والا۔ ایک نازک سی تحریر میں ایک خط بھی تھا

"یہ ساٹھ برس پہلے ایک بوڑھے آدمی نے دیا تھا۔ وہ اس قدر بوڑھا تھا جس قدر میں اب ہوں۔ اس نے مجھے اپنی "آخری مسرت" کہا اور ہدایت کی کہ میں بھی اپنی آخری مسرت کسی کو دیدوں۔ ایسا ہی شخص جس سے میں اس عمر میں ملوں جو اس کی تھی۔ اور اب میں ایک درخواست کروں گی کہ یہ شیر لے لو۔ بڑھاپے تک خوشی سے زندہ رہو۔ پھر یہ اپنی آخری مسرت کسی کو دیدینا۔ اپنی زندگی کے اس آخری شخص کو جو تمہیں جینے، کام کرنے اور محبت کرنے کی امنگ دے۔ خدا کرے یہ خوشی سورج کی طرح، پہاڑ کی ہواؤں، دریاؤں اور پہاڑوں کی طرح نسل در نسل ہمارے ساتھ رہے۔"

میں نے آنکھیں اٹھائیں۔ وہ عورت جا چکی تھی۔ وہاں ایک پرسکون مضبوط اور طاقتور شیر کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ تب میں نے سوچا کہ میں نتالیہ کی خواہش پوری کروں گا۔ اور یہ شیر کسی کو دیدوں گا۔ کوئی ایسا شخص ہوگا جس کو یہ دیا جا سکے۔ میرے سامنے ایک زندگی پڑی ہے۔ اچھی اور بری۔ پرکیف۔ تلخ اور اداس۔ ہر شے ابھی میرے سامنے ہے۔

فٹ پاتھ کا چراغ

ستارہ جعفری

یہ تقریباً بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں روزانہ اپنے کام کے سلسلے میں صبح آٹھ بجے جاتی تھی۔ دوپہر کو کھانا کھانے گھر آتی پھر شام کو چار بجے جاکر رات کے آٹھ، نو بجے گھر واپس آتی تھی۔

میرے راستے میں جو فٹ پاتھ تھے وہ رات کو تو سب ہی آباد نظر آتے تھے لیکن دن میں خالی ہو جاتے تھے۔ اس کے رہنے والے صبح اٹھ کر ایرانی کے ہوٹل میں چائے پی کر اپنے اپنے کام پر چلے جاتے تھے۔ تھوڑی دور آگے چل کر ایک کورٹ بنا ہوا تھا۔ اس کا فٹ پاتھ بھی کافی چوڑا تھا۔ وہاں ایک خاندان رہتا تھا۔ دو میاں، بیوی اور چار بچے، مجھے ان کا طرزِ زندگی بالکل الگ نظر آتا تھا۔ صبح جاتے وقت میں دیکھتی وہ عورت چائے بناتی ہوئی، بچے ہاتھ منہ دھو کر بڑے تمیز سے برابر بیٹھے ہوتے۔ چائے بنا کر وہ عورت ردی اخبار بچھا دیتی اور اس پر فی آدمی کے حساب سے دس پیسے والی پاؤ رکھ دیتی (اس زمانے میں پاؤ دس پیسے میں ملا کرتی تھی) پھر معمولی قسم کی چائے کی پیالیوں میں چائے بنا کر بچوں اور شوہر کو دیتی اور خود بھی شریک ہو جاتی۔ اس طرح یہ خاندان صبح کا ناشتہ کرتا تھا اور لوگوں کے مقابلہ میں مجھے ان کی یہ سلیقہ مندی بے حد پسند آئی میں کسی نہ کسی بہانے رک کر اس جگہ میں اس عورت کو کام کرتے دیکھتی پھر آگے بڑھ جاتی۔

رات کو جب واپس آتی تھی تو اس وقت مجھے فٹ پاتھ پر ایک سلیقہ مند عورت کا گھر نظر آتا تھا۔ کورٹ کا جو احاطہ تھا اس کی دیوار پر کیلیں لگا کر تختے لگا دیئے تھے۔ ان پر دھلے ہوئے صاف ستھرے برتن رکھے ہوتے۔ قریب ہی ایک کلنڈر لگا ہوتا۔ اس کے نیچے کھانا پکانے کا اسٹوو ہوتا۔ اس پر اکثر وہ کھانا پکاتی نظر آتی تھی۔ قریب ہی میں لوہے کی تپائی پر کورے گھڑے میں پانی بھرا ہوا رکھا ہوتا۔ گھڑے کے منہ پر سفید کپڑا بندھا ہوا ہوتا۔ اگر گرمی کا موسم ہوتا تو گھڑے پر بیلے کے پھولوں کا گجرا پڑا ہوتا۔ اوپر دیوار پر بھگوان کی تصویر اور گھڑے کے نیچے شیشے کے پھول دار گلاس رکھے ہوئے ہوتے کھانا کھانے کی پلیٹیں بھی سستے قسم کی چینی کی ہوتی تھیں۔ جس طرح صبح چائے ناشتہ کرتی تھی اسی طرح پرانے اخبار بچھا کر وہ سب کو کھانا کھلاتی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد سب لوگ ہول ڈول کھول کر اپنے اپنے بستر بچھاتے۔ بستر بھی صاف ستھرے ہوتے تھے۔ دونوں میاں بیوی تو بستر پر لیٹ کر باتیں کرنے لگتے اور بچے بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھ کر ہوم ورک کرتے جب کہ میں دوسروں کو دیکھتی تھی کہ وہ رات کو اپنا وقت تاش کھیلنے اور لڑائی جھگڑے میں گزارتے تھے۔ یہ سب باتیں میں مختلف اوقات میں دیکھا کرتی تھی۔

کچھ دنوں تک وہ عورت مجھے نظر نہیں آئی۔ اس کی جگہ اس کے شوہر کو کام کرتے ہوئے دیکھتی۔ ایک روز جب میں وہاں سے گزر رہی تھی تو دیکھا وہ عورت کھانا پکا رہی تھی اور گود میں گول مٹول خوبصورت سا ننھا بچہ تھا۔

گرمیاں گزر گئیں تھیں اور برسات کا موسم شروع ہوگیا تھا ۔ چونکہ وہ حصہ نشیبی تھا اس لئے وہاں بڑی جلدی پانی بھر جاتا تھا اگر پوری رات بارش ہوتی تھی تو صبح گھٹنوں گھٹنوں پانی سڑک پر جمع ہوجاتا تھا ۔ جب رات کو تیز بارش ہوتی تھی تو میرے دل میں اکثر اس خاندان کا خیال آتا ۔ نہ جانے اس وقت وہ لوگ کہاں اور کس حال میں ہوں گے ۔ ؟

ایک دن میں نے دیکھا ۔ ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی اور وہ خاندان فٹ پاتھ کے سامنے والی دکان کے زیر سایہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا ۔ عورت کی گود اس پھول سے بچے سے خالی تھی ۔ نہ جانے کیوں ؟ اس روز ان کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر مجھ سے خاموش نہیں رہا گیا ۔ میں نے پوچھا ۔ "تمہارا بچہ کہاں ہے ؟"

"گزر گیا بائی ! اس نے جواب دیا ۔

"ارے وہ تو بڑا پیارا اور تندرست تھا ۔ کیا ہوا تھا ؟"

" ایک رات برسات میں بھیگ گیا ۔ پورا بدن جلنے لگا ۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا ۔ وہ بولا نمونیا ہوگیا ۔ اسپتال لے جاؤ ۔ میں اسپتال لے گئی پر اوپر والے کی مرضی کے آگے کوئی دوا کام نہ آئی "۔

بارش میں کیسے بھیگ گیا ؟

"آپ دیکھتی ہیں ۔ ہم سب فٹ پاتھ پر رہتے ہیں ۔ جب برسات گرتی تھی تو یہ سامنے والی بلڈنگ کے ماڈرن کے نیچے سر چھپانے کو جگہ مل جاتی تھی ۔ ابھی کچھ دن پہلے اوپر سیٹھ کے گھر میں چوری ہوگئی ۔ سیٹھ بولا ۔ "سالا تم سب یہاں سے بھاگ جاؤ ۔ تم سب چور ہو ۔ آپ کو معلوم ہے بائی ۔ ہم سب کو لے کر یہاں بیٹھ گیا ۔ جہاں آپ دیکھ رہی ہیں ۔ کیا کرتا ۔ برسات پڑ گئی اس میں ہم سب لوگ بھیگے پر وہ دو مہینے کا تھا نمونیا ہوگیا "

"تم کہیں اور چلی جاتیں ۔ یہ تو بڑے دکھ کی بات ہے "

" کہاں جاتا بائی ! سب سیٹھ لوگ بھگاتا ہے ۔ باپ ایک آدمی کرتا ہے دکھ سب کو جھیلنا پڑتا ہے ' ایسے ہی نمونیا ہوکر ایک لڑکا دو برس پہلے بھی خلاص ہوا تھا ۔

" تمہارا آدمی کیا کام کرتا ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

" فیکٹری میں "

" اور پگار کیا ملتا ہے ؟"

" ساڑھے تین سو !

" تم کیا کام کرتی ہو ؟

" چار ، چھے گھر میں باسن دھونا ، جھاڑو پوچھا کرنا ۔ ٹائم ملا تو کپڑے بھی دھوتی ہوں "

" تمہیں مہینے میں کتنے پیسے مل جاتے ہیں ؟ "

"سو سے اوپر مل جاتا ہے بائی!"

اس زمانے میں چار، پانچ سو روپے کافی قیمت رکھتے تھے۔ میں نے کہا "جب تم دونوں مل کر اتنا کما لیتے ہو تو پھر ایک کھولی لے لو۔ اس میں بچوں کی جان تو بچ جائے گی۔"

"تم ٹھیک بولتا ہے بائی! پر کھولی کا بھاڑا بہت ہے۔ ہم اپنے بچوں کو انگلش اسکول میں پڑھاتا ہے۔ وہ ہماری طرح فٹ پاتھ پر نہیں رہیں گے۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔ تم کھولی میں رہ کر بھی بچوں کو پڑھانا؟"

"نہیں بائی پھر اسکول کی فیس کہاں سے بھریں گے؟ انگلش اسکول کا تو ڈریس بھی الگ ہوتا ہے۔ پھر پڑھنے والے بچوں کو کھانا پینا بھی اچھا منگتا ہے۔ ہمارا سارا پیسا تو کھولی کی پگڑی اور بھاڑے میں چلا جائے گا۔ یہاں بس برسات کی تکلیف ہے۔ ویسے فٹ پاتھ پر بہت آرام ہے۔"

"تم چاروں بچوں کو انگلش اسکول میں پڑھا رہی ہو؟"

"ہاں بائی! بڑا والا چھوکرا تو ایس۔ ایس۔ سی میں ہے۔"

"یہ بڑا اچھا کام کر رہی ہو" میں نے کہا۔

میرا تو وہ راستہ ہی تھا۔ آتے جاتے ان لوگوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ اگر کبھی جلدی میں گذر جاتی تو دوسرے دن وہ عورت کچھ سے خیریت پوچھتی۔

ایک روز اس نے مجھے انگریزی کا اخبار دکھایا "دیکھو بائی! میرا بڑا چھوکرا فرسٹ آیا ہے" اخبار میں لڑکے کی تصویر بھی چھپی تھی اور تعلیم جاری رکھنے کے لئے وظیفہ بھی ملا تھا۔

"بائی سب لوگ بولتا ہے۔ گورنمنٹ کالج میں پڑھنے کے لئے چھوکرے کو کچھ پیسے بھی دے گی؟ کیا یہ بات برابر ہے؟"

"ہاں پیسا ملے گا۔ تمہارا بیٹا بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہے۔"

اس نے پیڑے کا ڈبا میرے سامنے کر دیا۔ "لو بائی! منہ میٹھا کر لو" میں نے اس کو مبارکباد دی۔

پھر میں نے وہ کام چھوڑ دیا اور میرا اس طرف جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ ہاں جب بارش کے موسم میں شدید بارش ہوتی تھی تو ذہن کے افق پر ان کی یادوں کے ستارے جگمگانے لگتے تھے۔

ابھی دو تین سال قبل کی بات ہے۔ میں جوہو سے وارڈن روڈ بس سے آ رہی تھی۔ ایک اسٹاپ پر بس رکی اور ایک کافی صحت مند عورت قیمتی ساری پہنے میرے برابر آ کر بیٹھ گئی، میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ گلے میں لمبا سا سونے کا منگل سوتر تھا۔ کانوں میں ٹوپس اور ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیوں کے ادھر ادھر چوڑی چوڑی سونے کی چوڑیاں پہنے تھی، میں پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ صورت کچھ دیکھی بھالی لگ رہی تھی۔

وہ پھر مخاطب ہوئی " باجی! نہیں پہچانا میں کون ہوں، اتنی جلدی بھول گیا؟"

مجھے اپنے بھول جانے پر شرمندگی ہو رہی تھی باوجود کوشش کے یاد نہیں آ رہی تھی کہ یہ کون عورت ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا " صورت تو نہیں بھولی ہاں آپ کا نام یاد نہیں آ رہا؟"

"یاد ہے! ہم فٹ پاتھ پر رہا کرتے تھے اور آپ وہاں سے روز جایا کرتی تھیں!"

" اچھا۔ اچھا۔ تم ہو!" میں نے اس کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا، صورت، صحت اور لباس سب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟ تم تو بالکل بدل گئیں۔ اسی لئے مجھے پہچاننے میں مشکل پڑی"۔

وہ ہنس پڑی " اندھیری سے آ رہی ہوں باجی! میرا لڑکا بہت بڑا انجینیر ہو گیا ہے"

"کہاں! میں نے تعجب سے پوچھا

" ایک کمپنی ہے اس میں انجینیر ہے"

"کون سی کمپنی؟"

وہ پھر ہنسی " نام تو میرے کو یاد نہیں رہتا۔ ہاں بہت بڑی کمپنی ہے۔ کمپنی کی طرف سے بڑا سا بنگلہ بھی ملا ہے۔ ریڈیو ہے، فون ہے اور اس میں بڑا بڑا روم ہے۔ سونے کا کمرہ ایر کنڈیشنڈ ہے۔ باجی میرے کو تو اس روم میں نیند نہیں آتی بہت ٹھنڈک رہتی ہے"

"بہت خوشی ہوئی مجھے یہ بات سن کر۔ تمہارا دوسرا لڑکا کیا کام کرتا ہے؟"

" وہ بزنس کا دھندا کرتا ہے۔ دونوں چھوکری بینک میں کام کرتی تھیں۔ ان کی شادی بنا دی۔ آپ کا ایڈریس نہیں معلوم تھا۔ اس لئے کارڈ نہیں بھیجا"

" اور اب تم دونوں کہاں رہتے ہو" میں نے پوچھا۔

" اپنے بڑے چھوکرے کے پاس۔ اس کی عورت ہمارا بہت سیوا کرتی ہے۔ دو نوکر بھی ہیں باجی۔ گاڑی بھی ہے مگوان نے سب کچھ دے دیا ہے۔ بچوں کے کھیلنے کے لئے بڑا سا گارڈن بھی ہے"

اتنے میں اگلے اسٹاپ پر بس رک گئی اور وہ عورت نمستے کر کے اتر گئی۔

اکرام فرقت

سایوں کا مسیحا

ایک ماہر مصور نے دنیا کے نقشہ پر کالی سیاہی پوت دی ۔ اور سرخ سورج کو سیاہی نے نگل لیا۔ تب بہت شور و غل، حرص و ہوس، قتل و خون کا بازار گرم ہونے لگا اور ہر انسان کے خوشنما، سرخ و سپید چہرے پر کالک کی سیاہی پھیل گئی۔

ہر چہرہ کالا تھا۔

دنیا اندھیری تھی۔

سمندر چپ چاپ سو رہا تھا۔

تب دھرتی نے اپنی کوکھ سے ایک قیمتی پتھر پرے پھینک دیا۔ وہ پتھر بہت ہی روشن تھا کہ جس سے دنیا کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں ۔ اور ہر طرف روشنی کی لکیر بکھرنے لگی ۔ یہاں تک کہ تمام کالے چہرے نمایاں ہو گئے۔

انتقام .... انتقام ....!!

تیز سنسناتی ہوئی ہوائیں .... تاریکی اور سیاہ تاریکی ۔

مہیب سناٹے ۔ ڈراؤنی آوازیں ——— ہر شخص پہ دہشت طاری ہو گئی .... اس بیش قیمت اور تیز روشنی والے پتھر پہ شب خون مارنے کا پلان بن گیا۔ تب وہ قیمتی پتھر، ظلمتوں کے بلند میناروں سے ہوتی ہوئی گہری کھائی میں جا کر پناہ گزیں ہوئی ۔

پھر بھی دھرتی پر دھیرے دھیرے روپہلی چاندنی بکھرنے لگی۔ اور بہت ہی آہستہ روی سے پھیلتی گئی ——— آسمان خاموش تماشا دیکھتا رہا۔

سرخ سورج سیاہی کے جنگل سے نکل بھاگا۔

لمحہ بہ لمحہ ٹپکتا ہوا خون ——— خون ہی خون ———!!

دریا، پہاڑ، جنگل، ریگ زار، گلزار، طوفان، بارش، موجیں، ساحل، سب کے سب روشن ہو گئیں!

لمحے، لمحوں سے ٹکرائے۔

صدیاں گذر گئیں ــــــــــ !!

تب ایک مصوّر دنیا کے سامنے۔ بہت سارے لال، پیلے، کالے، ہرے، نیلے، اجلے رنگوں کے پتھر لے کر بازار میں آیا اور بہت سارے خریداروں کا اکٹھا کیا۔ لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ نہ جانے کس جانب سے ایک برص زدہ سانپ آنکلا۔ اسے دیکھ کر سب خریدار بھاگ نکلے اور اس نے سفید پتھر کو اپنی خوراک سمجھ کر نگل لیا اور جنگل کی جانب سرکتا چلا گیا۔

پھر وہی ڈراونی کالی رات...... تیز سنسناتی ہوئی ہوائیں۔ ہر طرف بھیانک خاموشی...... اور اس طرح مختلف رنگوں کا امتیاز بھی مٹ گیا۔ سیاہ رنگ نے سفید رنگ کو دبوچ لیا۔

پیلا رنگ ہرے رنگ پر غالب آگیا۔

سرخ رنگ نے نیلے رنگ کو نگل لیا۔

شاید پھر صدیاں گذریں ....!!

اور جب مصور کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو صرف سرخ اور پیلے رنگ کے پتھروں کو اٹھا سکا۔ بقیہ تمام پتھر تو سیاہیوں میں معدوم ہو چکے تھے ــــــــــــــــــــــ تب وہ ان دو پتھروں کو اٹھا سکا۔ بقیہ تمام پتھر تو سیاہیوں میں معدوم ہو چکے تھے ــــــــ تب وہ ان دو پتھروں کو لے کر پھر سے سفید رنگ والے پتھر کی تلاش میں نکل پڑا۔

ایک جنگل سے دوسرا جنگل......!!

ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک ــــــــ!

طوفان ہو یا آندھی۔ وہ مصوّر سانپوں کا مسیحا بنا اور اس نے اپنی زندگی کا نصف حصہ برص زدہ سانپ کی تلاش میں گذار دیا۔ یوں تو راستے میں ہزاروں سانپ ملے اور ہر سانپ کے منہ میں قیمتی پتھر بھی تھے۔ مگر جب اسے پکڑ کر بازاروں میں تماشہ لگاتا اور ہر سانپ اپنی ٹوکری سے نکل کر سفید کاغذ پر ینگنے بھی لگتا تھا بہت خوب صورت...... خوشنما........ کچھ خریدار بھی ملے ــــــــ مگر وہ روشن پتھر جو دنیا کو دکھلا کر بہت سارے خریدار اکٹھا کرنا چاہتا تھا۔ نہیں دکھلا پاتا تھا۔ کیونکہ وہ تو ہی غائب تھا......... لہٰذا ہر سمت سے مارو، پیٹو اور نہایت رقیق گالیوں کا ایک ہجوم ہوتا اور وہ اپنے کنوس کو سمیٹ بھاگ کھڑا ہوتا....... اسے اپنے آپ پر بہت غصہ بھی آتا تھا۔ مگر کرتا بھی کیا ــــــــ اور ایک بار پھر اس برص زدہ سانپ کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا۔ شاید اسی طرح زندگی کے کنوس پر پھیلی ہوئی تصویر میں مناسب رنگ بھر سکے اور رنگوں کا امتزاج پھر سے زندہ ہو سکے۔

کتنی فصلیں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔

برص زدہ سانپ بھی سرخی مائل ہو چکا تھا اس لیے مصوّر کی آنکھیں بھی دھوکا کھاتی رہیں۔ تب مصور مایوس ہو گیا

اصاپناکالا برش اٹھاکر دنیا کے نقشہ پر سیاہی پوت دینا چاہتا تھا کہ اس کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا کہ وہ حیران رہ گیا۔ قیمتی پتھروں کا ڈھیر ———— اس کے چاروں طرف پھیلے سانپ خاموشی کُنڈے آسمان کی طرف لو لگائے ہوئے جیسے کسی قطرہ نیساں کے انتظار میں ہوں۔ مصوّر بہت دیر تک اس منظر سے محظوظ ہوتا رہا........ وہ اپنی خوشی پر قابو پاتا رہا..........

کہ تب ہی کسی اندیکھی چیز کی ایک ہلکی سی آہٹ محسوس ہوی اور ہر پتھر کو سانپوں نے پھر سے نگل لیا۔

مصوّر نے ماضی، حال، مستقبل کو دیکھا اصا پنے کالے رنگ لگے ہوئے برش کو ایک کونہ میں ڈال کر خاموش کھڑا ہو گیا کہ شاید پھر کبھی وہ سفید پتھر بازار میں آئے اور اس کی روشنی سے تنگ و تاریک در و دیوار پھر سے روشن ہو جائیں اور ایک بار پھر روشنی اندھیرے پر غالب آجائے ————!!

۵۵

تَب اور اَب

دیوان ارشاد بن نظام

۱۸ر اپریل ۱۹۸۵ء

ایک طویل علالت کے بعد کل حاجی مولوی کریم بخش اللہ کو پیارے ہو گئے

اِنّا للہ و اِنّا اِلیہ راجعون

۲۱ر اپریل ۱۹۸۵ء

کل حاجی جی کا سویم تھا۔ سوگواروں نے پورے دس ختم کیے، قرآن شریف کے اور ان کے لیے دعائے مغفرت بھی ہوا تھا۔

۲۸ر مئی ۱۹۸۵ء

کل حاجی جی کا چالیسواں تھا۔ ان کے بیٹے مولوی رحیم بخش نے رات ہی محلے والوں کو قرآن خوانی کی دعوت دے رکھی تھی مگر صبح محلے کے چند بزرگوں کے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آیا اور مجبوراً رحیم بخش کو اکیلے ہی قل پڑھنا پڑا۔

۱۸ر اپریل ۱۹۸۶ء

آج صبح سے ہی محلے میں ایک عجیب سی گہما گہمی دیکھنے کو مل رہی تھی۔ حلیمہ کے چھت کے منڈیر پر لگا لاؤڈ اسپیکر چیخ چیخ کر نئے اور پرانے فلمی گیت سنا رہا تھا۔ اور ہوا کے دوش پر دُور دُور تک بریانی کی بُو اٹھلاتی پھر رہی تھی۔

"کیا آج حلیمہ کی لڑکی کی سگائی ہے؟" اس نے متحقق انداز میں اپنی بیگم سے دریافت کیا۔

"نہیں بھئی! آج حاجی جی کا سالانہ ہے!" بیگم نے حاجی جی کی تقدیر پر رشک کرتے ہوئے کہا اور اُس نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

★

زباں پر تیری فرقت کا کبھی شکوہ نہیں ہوتا
تری یادوں کے صدقے میں کبھی تنہا نہیں ہوتا

بہاریں یوں تو آتی ہیں چمن میں اب بھی آنے کو
مگر پہلے جو ہوتا تھا سماں ویسا نہیں ہوتا

مبارک ہو بشر کا خوں تمہیں دیر و حرم والو
ہمارے میکدے میں یوں کوئی پیاسا نہیں ہوتا

نہ رہ بیگانہ مجھ سے اس طرح تڑپائے گی تازہ
کہ پھولوں کا اور نسیمِ صبح میں پردہ نہیں ہوتا

خدا اپنا دل ہی جس کا صورتِ صحرا ہو ویرانہ
اسے اندیشۂ ویرانیِ صحرا نہیں ہوتا

نہ لے احساں کسی کا یوں کہ تو اندر سے مٹ جائے
گھنے پیڑوں کے سائے میں کوئی پودا نہیں ہوتا

جو دریا کو سمجھتا ہے تو ساحل سے کنارہ کر
کہ ساحل سے کبھی اندازۂ دریا نہیں ہوتا

جو ہیں ناواقفِ آدابِ مے نوشی وہ رسوا ہیں
کہ مے نوشی سے کوئی بھی کبھی رسوا نہیں ہوتا

یہ جھگڑے رونقِ دیر و حرم جن سے عبارت ہیں
ذرا دیکھو کہ میخانوں میں یہ جھگڑا نہیں ہوتا

نہ پہچانا کبھی اے زندگی! امروز کو جس نے
زمانے میں کبھی وہ فاتحِ فردا نہیں ہوتا

نہ جانے ظلمتِ شب کس لیے بدنام ہے اتنی
بھلا آزاد! دن کی روشنی میں کیا نہیں ہوتا

سکونِ دل نہیں ملتا اسے آزاد! آخر میں
وہ جس کا ابتدا میں دل تہ و بالا نہیں ہوتا

جگن ناتھ آزاد

★

زمینِ فکر بدلے گی نئی ہوگی نظر پیدا
نئی شام و سحر ہوگی نئے شمس و قمر پیدا

محبت جانِ عالم ہے محبت شوقِ منزل ہے
محبت زندگی میں کرتی ہے ذوقِ نظر پیدا

ہماری زندگی میں صوت ہے الفاظ بھی لیکن
بڑی مشکل سے ہوتا ہے تکلّم میں اثر پیدا

بساطِ فکر و فن اُلٹی ہوئے الفاظ بے معنی
نہ افلاک لفظوں کے ہوئے وہ بحر و بر پیدا

مسلّم ہے بدلتا ہے تفحّص خود تفحّص کو
نئی فکروں سے ہوتی ہے نئی شام و سحر پیدا

ثقافت نے ادب نے دین و ایماں کو بدل ڈالا
نظر اب خود ہی خیرہ ہے کہاں سے ہو نظر پیدا

جو مُلّا و رند تو دیں گے بیویوں سے کچھ نہیں لیں گے
پھر ایسے ہوں گے اہلِ دل، نئے اہلِ جگر پیدا

کسی کی زندگی کو بے ثمر حاذق نہیں دیکھا
ثمر ہی سے ہوا ہے نخلِ عالم میں ثمر پیدا

حاذق ضیائی سہسوانی

○

اللہ اللہ رمزِ حسنِ یار کی گہرائیاں
اک تبسم پر ہوئیں بے سود قیاس آرائیاں

ڈر ہوا کہ بیشِ خیمہ ترکِ الفت کا نہ ہو
جب بھی حد سے بڑھ گئیں ان کی کرم فرمائیاں

میرا کیا اختر شماری میں بھی کٹ جائے گی شب
ہم نشیں! تجھ کو مبارک انجمن آرائیاں

روشنی نے اک ذرا بدلا جو اپنا زاویہ
جتنے انساں تھے نظر آنے لگے پرچھائیاں

کی ہے شاہد تم نے کیوں صحرا نوردی اختیار؟
کچھ قصور اپنا ہے کچھ ان کی کرم فرمائیاں

شاہد نجیب آبادی

○

جب شام گئے لوٹ کے آتا ہے مسافر
روداد سفر ہم کو سناتا ہے مسافر

سناٹے جس وقت گزر جاتی ہے حد سے
تب شمعِ گزر گاہ بجھاتا ہے مسافر

ظلمات کی چادر میں لپٹ جاتا ہے جب
تقدیس کی اک شمع جلاتا ہے مسافر

مظلوم کے حق کی جو ہو مقصود حفاظت
ٹوٹی ہوئی دیوار اٹھاتا ہے مسافر

رہبر کی ضرورت مجھے منصور نہیں ہے
منزل کی تو خود راہ بناتا ہے مسافر

منصور عاشر

○

میری شکستہ امیدوں کو بھی نہال کیا
تری وفا نے محبت کو لازوال کیا

مجھے ملا نہ زمانے میں ایک پل بھی سکوں
تری جفا نے مری زیست کو وبال کیا

مجھے شعور کی دولت سے متصف کر کے
میرے خیال کو اس نے ہی بے مثال کیا

سنبھل چکا ہے پگھلتا ہوا لہو عرشی
نگاہِ دوست نے ایسا ہی کچھ کمال کیا

بشیر عرشی

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

صہبائے آبگینہ گداز

اقتباسات

انتخاب : حفیظ الرحمٰن احسن

-۱-

میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ اصلی میدان مقابلہ شمالی ہندوستان ہے۔ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ وہیں ہوگا اور اسی فیصلہ کے اثرات سارے ہندوستان میں پھیلیں گے۔ لہٰذا اب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہاں سے ہجرت کروں اور شمالی ہند میں کسی جگہ قیام کروں لیکن دارالہجرت کے انتخاب میں ابھی متردد ہوں۔ محرم کے اشارات شائع ہونے کے بعد سے بکثرت خطوط آ رہے ہیں جن میں مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ کوئی راہ عمل تجویز کرو میں بے صبری کے ساتھ کام کرنے کا قائل نہیں۔ پورے غور و خوض کے ساتھ ایک نقشۂ جنگ بنا رہا ہوں۔ انشاء اللہ دو تین مہینہ میں یہ نقشہ مکمل ہو جائے گا۔ اس کو شائع کرنے کے بعد مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کی آواز بلند کروں گا اور صرف ایسے لوگوں کو دعوت دوں گا جو وقت آنے پر یہ نہ کہہ دیں کہ اِذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قَاعِدُوْنَ۔

۲ر جون ۱۹۳۷ء ۔ (حوالہ ایضاً)

-۲-

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں خود ہی شمالی ہند کی طرف منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن یہ فیصلہ کرنے کے ساتھ ہی میں ایک شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف میرا ۲۰ سال کا غور و خوض اور مطالعہ تھا جو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ بنیاد کو مضبوط کرنے کے لئے اس تعمیری کام کے سوا کوئی دوسری چیز کارگر نہیں ہو سکتی جس کا نقشہ میں بنا چکا ہوں۔ دوسری طرف مسلمانوں کے پراگندہ انبوہ پر انقلاب کی منظم فوجیں جس تیزی کے ساتھ تاخت کر رہی تھیں اسے دیکھ کر میں سمجھ رہا تھا کہ اب بلا تاخیر اپنی بچی کھچی قومی طاقت کو سنبھالنا ضروری ہے، ورنہ جتنی دیر میں ہم اپنے تعمیری کام کو اس حد تک ترقی دے سکیں گے کہ وہ قوم کو سنبھالنے کے قابل ہو، اتنی دیر میں قوم ہی ختم ہو جائے گی۔ اگر تعمیری کام کا وہ نقشہ آپ کے سامنے ہے جو ابھی میں بیان کر چکا ہوں تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ چند آدمیوں کا قرآن اور سنت اور علوم قدیمہ و جدیدہ کے عمیق مجتہدانہ مطالعہ اور خالص اسلامی تربیت سے باعتبار علم اور باعتبار مضبوطی سیرت اس قابل ہونا کہ وہ قوم کے بگڑے ہوئے نظام تعلیم و نظام تربیت اخلاق کو درست کریں اور پھر اس اصلاح شدہ نظام تعلیم و تربیت سے قوم میں ایسی طاقت پیدا ہونا کہ سیاسی، معاشی، تمدنی اور اخلاقی پستی سے وہ ابھر سکے، یہ کتنی طویل مدت چاہتا ہے۔ کم سے کم اندازہ کے مطابق اگر اس کو آج شروع کیا جائے تو یہ تیسری پشت (Generation) میں جا کر بار آور ہوگا۔ اب آپ خود ہی مجھے بتائیں کہ جو طوفان ہمارے سر پر آ گیا ہے کیا وہ ہمیں اتنی فرصت دینے کے لئے تیار

بیٹھیں ہم اس طرح اطمینان سے بیٹھے ہوئے اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو از سرِ نو تیار کریں؟ حالات آپ کے سامنے بھی ہیں اور میرے سامنے بھی۔ کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں ہے جسے میں دیکھتا ہوں اور آپ نہ دیکھتے ہوں۔ ایک طرف ایک منظم طاقت ہے جو نیشنلزم اور ڈیماکریسی کے مجموعہ کو پراونشل اٹانومی کے زبردست وسائل سے ہندوستان پر مسلط کر رہی ہے اور ہندوستان جدید کی تعمیر اس نقشہ پر شروع کر چکی ہے جس میں مسلمان قوم کے لئے "بحیثیت مسلمان قوم" ہونے کے کوئی جگہ نہیں۔ دوسری طرف مسلمان ایک ریوڑ کی طرح ہندوستان کے طول و عرض میں بھٹک رہے ہیں، اور ان کی بے شمار ٹکڑیاں بے شمار راستوں پر بھاگی چلی جا رہی ہیں۔ انتہائی رجائیت (optimism) کے ساتھ اگر اندازہ لگاؤں تو کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ دس سال یہ حالت قائم رہی تو میدان کلّی طور پر آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ قوم ہی باقی نہ رہے گی جس کو سنبھالنے کے لئے آپ بیٹھے ہوئے درسِ قرآن دیا کریں گے، بلکہ شائد وہ گوشۂ عافیت بھی آپ کو نہ ملے گا جہاں بیٹھ کر آپ ایسا درسِ قرآن دے سکیں جس میں دشمنانِ اسلام کو اسلامی طاقت کے اعادہ (Revival) کا خطرہ نظر آئے۔

یہی خیالات تھے جن میں اب سے دس مہینہ پہلے میں ڈوبا ہوا تھا۔ آخر کار شدید غور و فکر کے بعد میں اس فیصلہ پر پہنچا کہ خواہ میری مشکلات کتنی ہی بڑھ جائیں اور مجھ پر ذمہ داریوں کا بوجھ کتنا ہی ناقابلِ تحمل ہو جائے، بہرحال مجھ کو سیاسی جدوجہد اور قومی تعمیر کے دونوں کام ساتھ ساتھ کرنے چاہئیں تاکہ میدان جو تیزی کے ساتھ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، سیاسی جدوجہد سے اس کو بچایا جائے، اور پھر جتنا میدان ہاتھ آئے اس کو قابو میں رکھنے کے لئے تعمیری کام کے ذریعہ سے قوم کو تیار کیا جاتا رہے۔ میں اس فیصلہ پر اس لئے بھی مجبور تھا کہ جب میں نے اپنے سیاسی مضامین کے ذریعہ سے قوم میں ایک آگ بھڑکا دی اور اس کو کانگریس اور لیگ کے درمیان ایک دوسرا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرا دی۔ تو اس کے ساتھ ہی مجھ پر یہ اخلاقی فرض عائد ہو گیا کہ میں ہی وہ دوسرا راستہ بنا کر بھی دکھاؤں اور اس پر چلا کر عملاً ثابت کر دوں کہ یہی نجات کا راستہ ہے۔ اس موقع پر میرا پیچھے ہٹنا یہ معنی رکھتا ہے کہ میں اپنی قوم سے غداری کر رہا ہوں اور اس کو اکسانے کے بعد ایسی جگہ لے جا کر چھوڑ رہا ہوں جہاں وہ پیاس کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے مگر پانی موجود نہیں ہے۔ یہ بات صرف یہیں تک نہیں رہی ہے کہ میرا ایسا خیال ہے بلکہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے جو خطوط میرے پاس آئے ہیں ان کے بنڈل دیکھنے کی زحمت اگر آپ گوارا فرمائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ملک کے کن حلقوں تک میری آواز پہنچی ہے وہ مجھ سے کس چیز کی توقع رکھتے ہیں، کس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اگر میں نے اس کو پورا کرنے میں کوتاہی کی تو وہ مجھے کس نظر سے دیکھیں گے۔ رہی وہ جوابدہی جو مجھے خدا کے ہاں کرنی پڑے گی، اس میں تو ظاہر ہے کہ میرا کوئی شریکِ حال نہیں ہو سکتا۔ بہرحال چونکہ آپ میری پوزیشن میں نہیں ہیں، اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو اس ذمہ داری کا کہاں تک اندازہ ہے جو اس وقت مجھ پر عائد ہو گئی ہے لیکن میں آپ سے صاف کہتا ہوں اور خدا کے بھروسے پر کہتا ہوں کہ مجھ پر اس ذمہ داری کا احساس اتنا سخت ہے کہ اس کے تقاضے کو پورا کرنے میں خواہ مجھ کو کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے، خواہ میں برباد ہی کیوں نہ ہو جاؤں اور خواہ مجھے اپنے عزیز ترین

تعلقات ہی کو کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔ میں کسی خوف یا کسی لالچ، یا کسی تعلق کی خاطر اس سے ہٹ نہیں سکتا۔ نہ کسی کو مجھ سے اس کی توقع رکھنی چاہیے، اور نہ میں کسی ایسے شخص یا گروہ سے تعاون کر سکتا ہوں، جس سے تعاون کرنے کے لئے مجھے اپنے اس راستہ سے ہٹنا پڑے۔

۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء

(دارالاسلام وقف کمیٹی کے روبرو بیان۔ مطبوعہ وثائق مودودی صفحہ ۸۱)

غزلیں

رحمت اللہ رحمت رانچوی

آزما

آزمائش بے نہایت، زندگانی مختصر
خواہشوں کی یہ طوالت اور جوانی مختصر

ابتدا میں ایک قطرہ انتہا میں خاک ہے
ابتدا تا انتہا پوری کہانی مختصر

تاجدار حسن تیری سلطنت ہے بے کنار
کچھ عطا ہو خاص مجھ کو میری جانی مختصر

سر میں سودائے جنوں ہے عقل ہے آگاہ راہ
ہوش ہے بیدار لیکن سرگرانی مختصر

اہتمام عیش جہاں کیجے تو کیا کیجئے یہاں
لذت و عیش جہاں ہو جب کہ فانی مختصر

راشد احمد راشد

گر تری چشم التفات نہیں
زندگی موت ہے حیات نہیں

عشق ہے کائنات کا باعث
حسن مقصود کائنات نہیں

سب گرفتار زلف دوراں ہیں
کوئی بھی طالب نجات نہیں

تجھ سے مہر و وفا کی ہے امید
تجھ میں حالانکہ یہ صفات نہیں

غم دنیا سے کیا غرض اسکو
تیرے غم سے جسے نجات نہیں

تجھ سے منسوب تھی حیات اپنی
وجہ کچھ حسن التفات نہیں

زیست وہ زیست کیا ہے اے راشد
جس سے وابستہ حادثات نہیں

۵۰

ڈاکٹر انور سدید

ٹوٹی ہوئی بوتل کے چند چمکدار ٹکڑے

کچھ عرصہ قبل میں نے "اردو ادب" کی تحریکیں تحریر کرنا شروع کیا تو یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ علم کی شمع ستاروں کی طرح سفر کرتی ہے۔ کبھی اس کی روشنی کا ماخذ مشرق میں ظاہر ہوتا ہے اور پورا مغرب مجھے تاریک نظر آتا ہے۔ کبھی دانش مشرق نیم روشن پس منظر میں چلی جاتی ہے اور مغرب احیاء العلوم کی کرنیں بکھرنے لگتا ہے۔ ابوالخطیب کا نیا ناول 'ٹوٹی ہوئی بوتل کے چند چمکدار ٹکڑے' پڑھا تو سب سے پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ ایک زمانے میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر کو اپنی تجارت کے زرین پنجوں میں دبوچنے اور اسے لقمہ تر بنانے کی تگ و دو میں مصروف تھی تو مغربی ناول میں مشرق کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کا رواج بہت مقبول ہو چکا تھا۔ اس کے لیے نئی ترکیب سازی کی گئی، [illegible] ۱۰، اس طرح ایک ایسا ادب معرض وجود میں آگیا جسے بجا طور پر "اینگلو انڈین ادب" اختیار کیا جا سکتا ہے۔[2] ممتاز نقاد ریاض صدیقی نے درست لکھا ہے کہ

"انگلستان کے قوم پرست قلم کاروں نے فن اور فنی اظہار جیسے وسیلوں کی مدد سے دنیا کے پسماندہ علاقوں پر سخت گیر برطانوی اقتدار کے لیے ایسا فکری جواز پیدا کر دیا جس نے صدیوں تک لوٹ مار اور دھوکے کے ذریعہ قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں کو وہ قوت عطا کر دی جو ایک بڑی اور مضبوط فوج مہیا نہیں کر سکتی تھی۔ اسی اعتقاد کا کرشمہ ہے کہ بیسویں صدی کے شروع میں انگریزی راج کے خلاف برصغیر میں برپا ہونے والے ردعمل کے باوجود ایم ڈائیور (M. DIVER) اور کینڈلر (CANDLER) نے ناولوں میں انگریزی راج کو اتنا ہی تندرست و توانا محسوس کیا جتنا کہ وہ فرمانروائے برصغیر حضرت بہادر شاہ

---

[1] ابوالخطیب صاحب کا یہ ناول 'فنکار' کے گزشتہ شماروں میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] چند کتابیں یہ ہیں:

منظر پر ہاتھ صاف کرتے وقت تھا۔"

اس دور میں برصغیر کے بارے میں ایک تصور تو یہ ابھرا کہ یہ ملک "سونے کی چڑیا ہے"۔ لیکن اس ملک کے باشندے اس قابل نہیں کہ انہیں قابل عزت سمجھا جائے۔ برنیر اور منوچی کے سفرناموں اور طامس روکی یادداشتوں میں ہندوستان ایک خطۂ جنّت نظر کی صورت میں ابھرا تھا۔ لیکن کپلنگ، فاسٹر، آرول کے ناولوں میں جو حقیقت پسندی کے زاویے سامنے آئے ہیں وہ سب انگریزوں کی برتری کو ہی نمایاں کرتے ہیں۔ مشرق کو اب بھی مغربی ناول میں ایک موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر پر اقتدار کھو دینے کے بعد پہلی بار برطانوی قوم احساس شکست میں مبتلا ہے اور وہ نفسیاتی طور پر اس صدمے سے ابھی تک دوچار ہے، دوسری طرف مجھے یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ انگریزی اقتدار کی زنجیریں ٹوٹتے ہی اس قوم کی برتری کا تصور بھی پاش پاش ہو گیا اور کار... دانشوروں ادیبوں اور قلمکاروں نے جب تہذیب مغرب کا مشاہدہ قریب سے کیا تو ان پر یہ حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ یہ تہذیب اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے اور اس میں وہ قوت موجود نہیں جو افراد قوم کو مجتمع کرتی اور انہیں احساس تفاخر عطا کرتی ہے۔ مغرب میں اس کا اعتراف " THE DECLINE OF THE WEST " قسم کی کتابوں میں کیا گیا اور مشرق میں اقبال نے پیشگوئی کی کہ

"جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا"

چنانچہ اب وہ دور آگیا جب مغرب نے مشرقی تخلیق کاروں کے ناولوں میں ایک موضوع کی حیثیت اختیار کرلی۔

اس دور میں مشرق کے جن لوگوں نے مغربی تہذیب کو اپنا موضوع بنایا ان میں ایک اہم نام ابوالخطیب کا بھی ہے۔ ابوالخطیب اُردو افسانے کے اُفق پر آزادی کے بعد ابھرے۔ مجھے یاد ہے کہ نقوش کے افسانہ نمبر میں ان کے ایک افسانے کے ساتھ ان کی تصویر کو بھی نمایاں جگہ دی گئی تو اہل ادب نے ان کی طرف چونک کر دیکھا، اس نئے افسانہ نگار کے باطن میں ایک الاؤ سلگ رہا تھا اور افسانے کے وسیلے سے اس الاؤ کی گرمی نے مصنف کے دل سے قاری کے دل کی طرف پیش قدمی بھی کی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوالخطیب اردو افسانے کا ایک شعلۂ مستعجل تھا جو منظر پر ابھرا۔ ... تک غبار نور چھوڑنے میں کامیاب بھی ہوا۔ لیکن پھر اچانک غائب ہو گیا۔ اب افسانے کے اسی اجنبی کا ناول "ٹوٹی ہوئی بوتل کے چند چمکدار ٹکڑے" چھپا ہے، تو یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ ابوالخطیب کچھ عرصے کے لیے اُردو کے منظر سے ہٹ گیا تھا تو اس عرصے میں اس کا طلوع انگریزی زبان و ادب میں ہوا۔ اس کا ناول "I WAITED FOR THE DAWN"

---

1. MURDER OF AZIZ KHAN 2. THE MIDNIGHT CHILDREN 3. INDEPENDENCE AT NIGHT 4. ESMOND IN INDIA.

۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں اس نے برصغیر کی آزادی سے ابھرنے والے معاشرتی المیوں کو موضوع بنایا تھا۔ دوسرے ناول THE CITY OF STARS میں اسلامی اقدار کی بالا دستی قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس ناول کے مرکزی کردار ڈاکٹر جمال کو رجائیت کے ایک نمائندہ کردار کی حیثیت حاصل ہوئی۔ رسالہ "عرب میا" نے جولائی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں لکھا کہ:۔

"ابوالخطیب کا ادب اسلام، مسلم تہذیب و تاریخ اور اسلامی دنیا کے مسائل کو گہری دانش سے پیش کرتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی ضرورتوں اور عقائد پر ہمدردانہ نظر ڈالتا ہے۔ اور اسلامی روایات کی پیروی کرتا ہے۔"

ابوالخطیب کے ناول "ٹوٹی ہوئی بوتل کے چند چمکدار ٹکڑے" میں رد عمل کی وہ لہر بے حد نمایاں ہے جو اسلام کے گہوارے میں پلے ہوئے کسی بھی ادیب کے دل میں اس وقت بے اختیار اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ جب وہ معاشرے کو اسلامی اقدار سے منحرف دیکھتا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ابوالخطیب کا رد عمل عبدالحلیم شرر جیسا ردعمل نہیں اس نے مسز محمد سعید کے ناول "خواب ہستی" کی تکنیک میں مشرقی اقدار کو سربلند دکھانے اور بالآخر مغربی کرداروں کو حلقہ بگوش اسلام کرنے کی کوشش بھی نہیں کی، مجھے اس کا انداز شیخ صلاح الدین عادل کے ناول "مصائب و آفات کو اسلام کیا" سے بھی مختلف نظر آیا جو داخلی نوعیت کا موضوعی ناول ہے اور ایک ایسے "حیوان با اختیار" کو موضوع بناتا ہے جو داخل کی آواز کو بگوش ہوش سنتا ہے اور اپنے مسائل کا حل اپنے ہی باطن سے تلاش کر لیتا ہے۔

ابوالخطیب کے سامنے بلاشبہ مشرق کا معاشرہ بالعموم اور اسلام کا معاشرہ بالخصوص موجود ہے اور وہ اس معاشرہ کی تہذیبی، ثقافتی اور اقداری برتری پر یقین کامل بھی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اس معاشرہ کی برتری اور اپنے یقین کے اثبات کے لیے یورپ کے معاشرے کو اپنی جملہ آلائشوں کے ساتھ سطح پر ابھرنے کا موقع دیا ہے۔ اس کا موضوع وہ مغربی انسان ہے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھٹک رہا ہے، جس کی روح مردہ ہو چکی ہے اور جو خیر و شر اور نیک و بد کی تمیز سے محروم ہو چکا ہے۔ ابوالخطیب نے اس معاشرے کی صورت گری نسبتاً متوسط طبقے کے کرداروں سے کی ہے اور یہی وہ طبقہ ہے جو کسی معاشرے کی نمائندہ عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ جبرالڈ ہو یا ہنری جارلس سل ہوں یا گاڈفری سب اپنی اپنی ذہنی، اقتصادی اور جنسی الجھنوں میں پھنسے ہوئے مریض کردار ہیں۔ یہ لطف زندگی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ عیش پسند اور منافع خور ہیں، لیکن انسان کے بنیادی دکھ سے آشنا نہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار اپوا منزل منزل بھٹکنے والی ایک مثالی عورت ہے جس کے ہاں عمل اور رد عمل کی لہریں بھی اٹھتی ہیں۔ لیکن جب سفلی جذبہ غالب آجاتا ہے تو اس طغیانی ندی میں تنکے کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ حقائق کا تجزیہ کرنے کے باوجود مجھے یہ کردار بھی عمل کی قوت سے محروم نظر آتا ہے۔

ابوالخطیب ایک بامقصد اور نظریہ پسند ناول نگار ہے۔ مغرب کے اس عیش پسند معاشرے کے تہذیبی

زوال کو اس نے واقعات و حادثات سے بھی ابھارا ہے اور اس کے لیے کردار بھی ناول کی داخلی ضرورت کے مطابق تراشے یا تخلیق کیے ہیں۔ یہ کردار اس مرکزی نقطے کو بڑی خوبی سے ابھارتے ہیں جس کی عملی تعبیر ہمیں سہیل کے کردار میں ملتی ہے۔ سہیل ایک کردار ہے جو آزادی کے بعد کے مسائل سے جنم لیتا ہے اور اپنے داخل میں پرورش پانے والے جزرومد سے اکتا کر اپنے خواب سمیٹتا ہے اور لندن چلا آتا ہے اور پھر "لندن جو ایک شہر ہے عالم میں بے مثال"، اس کے باطن میں ایک نئے اضطراب، ایک نئی کشمکش کو جنم دیتا ہے۔ سہیل اس اضطراب کا شاہد بھی ہے، جو لندن کی معاشرتی سطح پر موجود ہے اور اس کشمکش کا شکار بھی جو اس تہذیب یافتہ دنیا کے ظاہر اور باطن میں بپا ہے تاہم اس کردار کا ضمیر چونکہ اسلامی اقدار سے ابھرا ہے اس لیے وہ نہ صرف ہر مشکل مقام سے کامیابی سے نکل جاتا ہے بلکہ اپنے گردو پیش کو بھی متاثر کرتا ہے۔ خاص طور پر جب ایوا کی روح کو وہ سہارا دیتا ہے تو ایک بڑی انقلابی تبدیلی اس آوارہ مزاج لڑکی میں بھی پیدا ہو جاتی ہے اور خوشی کی تلاش میں دکھ سہنے کی آرزو ایک نئی جہت اختیار کر لیتی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ابوالخطیب نے ناول واقعاتیہ مستقبل کے حوالے کر دیا ہے اور ہمیں بتایا کہ:

"یہ داستان کچھ اس طرح ختم ہو جاتی ہے جیسے کوئی ندی، پہاڑوں اور میدانوں سے گذرتے ہوئے سنگریزوں کو ساتھ بہاتے ہوئے سمندر میں ڈوب جائے۔ اس ناول کے تین کردار ہنری، ایوا اور سہیل سطح پر ابھرتے ہوئے انہی نوکیلے پتھروں کی طرح ہیں جو ندی کے ساتھ سمندر میں نہیں ڈوبے بلکہ سطح پر جم کر زندگی کی مختلف سمتوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔"

چنانچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نوکیلے پتھر جب زندگی کی نئی سمتوں کی طرف سفر کر چکے تو ایک دفعہ پھر ابوالخطیب کی توجہ کھینچیں گے تو یہ ایک نئے ناول کا موضوع بن جائیں گے۔

ابوالخطیب کا یہ ناول میں نے دو نشستوں میں پڑھا میرے ذہن میں فی الوقت اس کا تاثر تازہ ہے، لندن اور جرمنی کی معاشرتی تصویر بناتے ہوئے ابوالخطیب نے اپنے قلم کو مصور کے برش کی طرح استعمال کیا ہے اور حقیقی رنگوں سے ایک مکمل پینوراما تیار کرنے کی سعی کی ہے، چنانچہ بعض مقامات پر تو پورا یورپ ایک ایسا ڈبہ نظر آتا ہے جس میں ہر فرد پیشاب کر رہا ہے اور پوری دنیا اس پیشاب کی سڑاند میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یورپ کی جنسی زندگی کو پیش کرتے ہوئے ابوالخطیب فنکارانہ ضبط و نظم کو برقرار نہیں رکھ سکا اور عریاں الفاظ کے باطن سے نکل کر سطح کے ساتھ چپک جاتی ہے۔ ان سخت اور مشکل مقامات پر اگرچہ ابوالخطیب کا قلم ہیجان پیدا نہیں کرتا، تاہم میرا خیال ہے کہ وہ فن کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر رہا ہے۔ مقصدیت پس منظر میں چلی جاتی ہے اور پھر ایک مبرم لذت نمایاں ہو جاتی ہے۔

ابوالخطیب کا یہ ناول یورپ کی ذہنی اور جذباتی حالت کا ایک المناک اور دلدوز مرقع ہے۔ اس قسم کی چند تخلیقات سجاد ظہیر اور عزیز احمد بھی اردو ادب میں پیش کر چکے ہیں۔ ان دونوں کے ہاں بھی یورپ کی مسرتیں لاحاصل ہیں لذت کوشی

اذیت کے سوا کچھ پیدا نہیں کرتی۔ ابوالخطیب نے ربع چہارم کے یورپ کے ذہن و شعور کو آشکار کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ سجاد ظہیر اور عزیز احمد اپنے ناولوں میں اپنے دور کے شاہد نگاروں کا بھر تھے۔ لیکن ابوالخطیب کے نزدیک اس معاشرے کی نقاب کشائی ایک قومی اور مذہبی فریضہ بھی ہے۔ چنانچہ وہ اسلامی تہذیب اور مسلم معاشرے کی برتری کا زاویہ پیش کرتا ہے تو وہ مصنف سے زیادہ مبلغ نظر آتا ہے۔ اس مقام پر وہ خود بھی بیانیہ کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس قسم کے مقامات پہ مجھے ابوالخطیب کے تصورات کی رو تیز دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ناول کا بیانیہ کرداروں کا عمل اور رد عمل اور واقعات کا فطری بہاؤ رک سا جاتا ہے اور سیاق و سباق میں ایک خلیج سی پڑتی نظر آنے لگتی ہے۔ تاہم ابوالخطیب شاید اپنی اس صورتِ تخلیق سے پوری طرح آگاہ ہے اور اس نے ناول کے پیش لفظ میں یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ:

"میں مارکیٹ کے رجحانات کے مطابق مال تیار نہیں کرتا۔ میں تاجر نہیں بلکہ ایک مسلم نامہ نگار ہوں۔"

ابوالخطیب نے اس ناول میں اس عہد کو ہر وقت پیش نظر رکھا ہے جو اس نے اللہ، اس کے رسول، اس کی کتاب اور ہدایت پر ایمان لاکر اپنے آپ سے اور خدا سے کیا تھا۔ چنانچہ اس نے ناول کی تخلیق میں فن کے چند تقاضوں کی قربانی دی۔ اس کی وجہ اس ضابطہ اعلان کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے کہ ابوالخطیب نظریاتی تقاضوں کو فن کے تقاضوں پر فوقیت دینے والے ادیب ہیں اور وہ تخلیق رکھنے والی اس نسل سے مخاطب ہیں جو باطنی طور پر سوز یقین و عمل رکھتی ہے۔ ابوالخطیب کی ان معروضات کو پیش نظر رکھیے تو یہ ناول آپ کو بھی ضرور متاثر کرے گا۔

○○

محفل غائبانہ

کھری کھری ● فن کار کا نیا شمارہ نئے سائز میں نظر نواز ہوا۔ ٹائٹل ماشاء اللہ عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ سادگی میں پرکاری اسی کو کہتے ہیں۔ بلند مینارے رسالے کی معنویت کو نمایاں کر رہے ہیں۔ مقالات کے حصے میں فہیم صدیقی صاحب کا مضمون اور صہبائے آبگینہ گداز ہے بے محل معلوم ہوا۔ ان کی جگہ مزید ایک تنقیدی مقالہ بہتر تھا۔ نظمیں غزلیں ہیں۔ افسانوی حصہ باعث تقویت ہے تبصرے کے کالم میں مبصر کا نام جب ہر تبصرے کے آخر میں موجود ہے تو سرعنوان اس کی ضرورت نہیں۔ تبصرہ نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں تاہم چند باتیں عرض ہیں۔ اس بار حلیم صبا نویدی کے شعری مجموعہ "بھارت جیوتی" پر موصوف کے تبصرے کا ابتدائی حصہ ذوق پر بے حد گراں گزرا۔ یک جہتی اور سالمیت کے علمبردار مدبر اور ماہر فن سیاست" کی موت پر موصوف کے سوگوارانہ جذبات خواہ کتنے ہی شدید ہوں مگر ان کے اظہار میں احتیاط لازم ہے ورنہ شاعر اور ادیب یوں بھی شاہ پرستی اور حکومت وقت کی مدح سرائی کے باعث بدنام ہیں اور اب مزید رسوائی کا سامان چہ معنی دارد؟ بھارت جیوتی کے کارناموں کا حال ذرا پاکستان، بنگلہ دیش اور بنگلہ دیش کے ان مظلوم بھائیوں سے پوچھیے جو اب تک اپنے بنیادی حقوق کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کتاب پر ہر حیثیت سے محاکمہ ہونا چاہیے تھا۔

فنکار کی کتابت و طباعت کا معیار واقعی بلند ہوا ہے۔ اب مسئلہ صرف معیاری مضامین کی فراہمی کا ہے۔ کیا بہار کے ادباء و شعراء اپنی تازہ معیاری تخلیقات نہیں دے سکتے؟ رسالے میں مزید دو کالم بڑھا دیئے جائیں تو بہتر ہے۔ "محفل غائبانہ" یا "خیالوں کی خوشبو"۔ جس کے تحت رسالے کے مشمولات پر تنقید تبصرے اور تاثرات کے ساتھ مختلف مسائل پر مباحث شامل ہوں۔ دوسرا قافلہ تیز گام یا "منزل بہ منزل" جس میں ادبی تنظیم و تحریک کی تشکیل و توسیع کے سلسلے میں ملک بھر میں ہونے والی کوششوں کی رپورٹ دی جائے۔

شاہ رشاد عثمانی (گیا)

پسند ● بہت پسند آیا لیکن وقفۂ اشاعت کی طوالت پر شکایت ہے۔ مشمولات میں قیوم نظر کی نظمیں، ندیم

عزیز بکھروی اور آپ کی غزلیں پسند آئیں۔ ڈاکٹر سجاد نے اداریہ میں بہت اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ رحمت یوسف زئی کے تبصرے مختصر مگر جامع اور نپے تلے ہیں۔

رمضان سعید (مالیرکوٹلہ)

سوال 8 فنکار کا تازہ شمارہ ملا۔ بہت اچھا سائز اور اُوپر تصویر بھی۔ شاید ہر ماہ تصویر بدلتی رہے۔ مضامین بھی اچھے ہیں۔ اشعار کا حصہ بھی اللہ کرے فن کار خوب سے خوب تر ہوتا رہے۔ کیا فن کار کی خریداری اور مالیات کا اطمینان بخش انتظام ہو گیا ہے؟

محسن انصاری (بمبئی)

چشم بد دور 8 چشم بد دور اب فنکار بڑا خوب صورت ہو گیا ہے صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے ان ناسازگار حالات میں آپ کا دم خم واقعی قابل تعریف ہے۔

فضل اللہ قریشی (آرمور)

نقد و تبصرہ 8 زیر نظر شمارے کا اکثر حصہ آپ نے ماخوذات کی نذر کر دیا۔ وجہ؟ ڈاکٹر احمد سجاد کا اداریہ، پروفیسر عمر حیات خاں غوری کا مقالہ اور رشاد عثمانی کا مضمون پسند آیا۔ محترم نعیم صدیقی حفیظ الرحمن احسن اور پروفیسر اسرار احمد سہاروی کے مضامین کا کہنا ہی کیا ہے۔ خصوصاً محترم نعیم صاحب کے مضامین کا۔ عزیز بکھروی کی غزلیں اچھی ہیں۔ ان کا یہ شعر ؎ بدلیں گے ہم نہ اپنے مذاق سخن کا رنگ ÷ ناقد ہزار قائل حرف و نوا کہے اچھا ہے لیکن پہلا مصرعہ یوں ہوتا تب جھول بھی ہو جاتا اور روانی بھی آجاتی۔ 'بدلیں گے ہم نہ اپنا مذاقِ سخن کبھی' اسی طرح ان کا یہ شعر بھی کہ ؎ بند آنکھیں نہ کھولے زمانہ اگر ÷ خضر بھی اس کی کیا رہنمائی کرے

فنی جھول سے دامن نہ بچا سکا۔ دوسرے مصرعے میں لفظ "بھی" حشو ہے۔ ان کا یہ مصرعہ کہ "کس میں ہمت ہے ہم میں جدائی کرے" بھی بے عیب نہیں ہے۔ "جدائی کرائے" کا محل تھا۔ شاعر نے قافیہ ردیف سے مجبور ہو کر 'جدائی کرے' استعمال کر دیا۔ غزل کا مقطع ہے:

ہو سکوں دل کو حاصل تو چپ ہے عزیز ÷ چوٹ کھائے تو نغمہ سرائی کرے

پہلے مصرعہ میں لفظ "ہے" کو اگر سہو کتابت کہہ لیا جائے تب بھی یہ شعر کسی پختہ کار شاعر کے کہنے کا نہیں تھا۔ تابش مہدی (دہلی)

ابوالفاروق شعور حیدرآبادی

کٹ جائے گی حیات تو آقا فراق میں ... لیکن تمہاری دید کے ہیں اشتیاق میں
آئے ہیں انقلاب یہاں جس کتاب سے ... نازل نہیں ہوئی ہے سجا نے وہ طاق میں
بارِ گراں ہوا ہے تجاوز حدود سے ... شائستگی بھی چاہیے کچھ تو مذاق میں
عزت ملی وقار ملا انکسار سے ... ذلت و شکست ہی ملی طمطراق میں
نادان دوستوں کا ہے محبوب مشغلہ ... آتا ہے ان کو بس لطف فقط افتراق میں
لیتے ہو کیوں سہارا کسی اختلاف کا ... جب خوبیاں ہزار ملیں اتفاق میں
اتلاف جان و مال پہ دونوں کو ناز ہے ... اک خود کشی کی جنگ ہے ایران عراق میں
دشمن کی سازشوں میں کچھ ایسے الجھ گئے ... برسوں سے مبتلا ہیں یہ جنگ عراق میں
تحریر کا شعور صحیح انطباق پہ تھی ... ہوتا ہے گر پڑھو گے سباق و سیاق میں

ماہنامہ فنکار

جلد ۴ ○ نومبر و دسمبر ۱۹۸۶ء ○ شمارہ [illegible]

مجلسِ ادارت:

مدیرِ اعلیٰ:- ڈاکٹر احمد سجاد

مدیر:- مسعود جاوید ہاشمی

مجلسِ مشاورت:

○ ابوالمجاہد زاہد ○ ڈاکٹر شبنم سبحانی ○ ڈاکٹر سہیل زیدی ○ حفیظ میرٹھی ○ عزیز بگھروی

فی پرچہ: ۳/۵۰ روپے　　سالانہ ۳۰/۰ روپے

لائف ممبر ۵۰۰/۰ روپے

[illegible] سے ۱۲۰/۰ روپے　　دیگر ممالک سے ۱۵۰/۰ روپے

رابطہ:

[illegible] ○ دفتر [illegible] علی گڑھ [illegible]

نقوشِ تازہ

احمد سجاد

نقشِ اوّل

گذشتہ دنوں مختلف ادبی نقطۂ نظر کے ادبا و شعرا کی ایک اہم ادبی نشست کے دوران باتوں ہی باتوں میں یہ نکتہ زیر بحث آگیا کہ آزادی کے بعد سے اب تک پورے اردو ادب پر کون سا رجحان سب سے قوی اور غالب کہا جائے گا۔ کہنے کو تو ترقی پسند اور جدیدیت کو دو قوی ترین رجحانات اور تحریکات سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے ساتھ کچھ دوسرے ادبی رجحانات بھی اپنا کام کرتے آرہے ہیں مگر سوال یہ تھا کہ ان جملہ رجحانات پر واقعتاً کوئی خاص میلان اور رویہ نظر بھی حاوی نظر آتا ہے یا نہیں۔ بحث و گفتگو کے بعد تقریباً اتفاق رائے سے یہ افسوسناک حقیقت سامنے آئی کہ ۱۹۴۷ء سے اب تک عام طور پر ہمارے تمام ہی ادبا و شعرا پر یاس و حرماں نصیبی کا سب سے زیادہ غلبہ رہا ہے۔ یہ فنکار ترقی ہوں یا یساری، قدیم مکتبۂ فکر کے ماننے والے ہوں یا جدید [illegible] منفی میلان یا یاسیت اور اس کی مختلف شکلیں ہی رہی ہیں۔

۱۹۴۷ء سے قبل دورِ غلامی میں بعض محرومیوں کے باوجود نظم و نثر میں نہ صرف بڑی عظیم تخلیقات منظر عام پر آئیں بلکہ منفی سیاسی ماحول کے باوجود زندگی کی مثبت قدروں، ایثار، جرأت و ہمت اور کسی بڑے مشن کے لیے روشن ولولگی فراوانی نظر آتی ہے۔ مگر ۱۹۴۷ء کے داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر سے لیکر بے چہرگی، بے سمتی اور علامت و تجرید، سائنس فکشن تک کے نام پر جو ادب تخلیق کیا گیا وہ بیشتر منفی اور ماتمی ہی قسم کا کہا جائے گا۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ تنقید میں بعض سنسنی خیز عنوانات اور جدید ادبی اصطلاحات کے پردے میں تعریف و تحسین کی زوردار ہوائیاں اڑانے کے باوجود بقول شخصے برسوں سے کوئی ایسی نظم، اہم ناول یا افسانہ منظر عام پر نہیں آیا جو اردو دنیا کے لیے توجہ کش ہوا ہو جس پر مختلف انداز سے اظہار خیال کا سلسلہ جاری ہو۔ تنقیدی سطح پر کہاں وہ شور اشوری اور تخلیقی سطح پر کہاں یہ بے نمکی عجیب و غریب تضاد پیدا کرتی ہے۔

مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں درباری عہد کے زوال پذیر ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایسے عہد کے شعرا کے لیے صرف دو میدان رہ گئے تھے۔ ممدوحین کی خوشامد کے لیے مدحیہ مضامین اور نفسانی جذبات کو اشتعال دینے کے لیے عشقیہ مضامین۔ جب ان دونوں مضمونوں میں، بچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح کچھ مزہ باقی نہ رہا تو سلاطین [illegible] کرنے کے لیے اور ایندھن کی ضرورت ہوئی تو مطائبات و مضحکات وا ہیات و ہزلیات [illegible]

کہ جیسے کہا گیا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جزوی فرق کے ساتھ بنیادی طور پر آج کا ادب بھی اسی طرح تین خانوں میں بٹ کے رہ گیا ہے۔ فیض اور سردار جعفری بھی مزدور کے غم میں جب بے فیض جذباتی شاعری کرنے لگے تو ایک نئی نسل نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ کچھ دنوں تک تنہائی اور بے سمتی کا خوب غلغلہ رہا بالآخر اس ہیجان سے بھی ہوا نکل گئی تو ان دنوں مزاحیہ شاعری، انشائیہ نگاری اور ادب و تنقید میں انشا پردازی کی دھوم بھی ہوتی ہے اور جا بجا مزاحیہ ادب پر نہ صرف یہ کہ مذاکرے منعقد ہو رہے ہیں بلکہ آل انڈیا مزاحیہ مشاعروں کا بھی سلسلہ چل پڑا ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان ادبی کاوشوں کے ذریعہ کس معیار کی تخلیقات منظر عام پر آ رہی ہیں۔ یہ بھی تو معلوم ہو کہ موجودہ مزاحیہ ادبی پس منظر میں آج کا سودا اور اکبر کون ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو محض ہنسنے ہنسانے میں "ادرک کے پنجے" کیا کسی سے کم ہیں۔

ادب اگر واقعی جذبے کو مشتعل کرنے کے بجائے اس کی تہذیب کر کے جمالیاتی تسکین کا سامان بہم پہونچاتا، نیز تشنج و اشتعال کو دور کر کے عظمت و جلال بخشتا ہے تو پھر واضح لفظوں میں آج کے زوال آمادہ فیشن کے برخلاف اس حقیقت کا برملا اعتراف و اظہار کرنا پڑے گا کہ ادب بنیادی طور پر ایک واضح مقصدی اور اخلاقی فعل ہے اس بنیاد پر جدید ادب کی اصطلاحات میں الٹ پھیر بازی کر کے حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ہمارے معاصر فنکار اسلوب و ہیئت میں ہزار تجربے کریں موضوع کی عظمت کے بغیر بات بن نہیں سکتی اور موضوع کی عظمت دو باتوں پر منحصر ہے۔ اولاً ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جائے جو حق و باطل کے درمیان سواء السبیل کی حیثیت رکھتے ہوں اور دوم جو انسان کی فطری نیکی اور اخلاقی و روحانی پاکیزگی کو جلا بخشنے والے، انسانی دکھوں کا مداوا کرنے والے اور کسی آفاقی مشن کے لئے باعث تقویت ہوں۔ اس اعتراف کے بغیر آزادی، امن و آشتی، باہمی خیرسگالی اور ادب میں مسرت و بصیرت کی باتیں سیاسی طرز کی پر فریب نعرہ بازی کی طرح ہوں گی جن کو وقتی طور پر نشست و گفتند کے لئے گرمی اور حرارت تو مل جائے گی مگر ادبی استحصال کا سلسلہ جاری رہے گا

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ "موضوع کی عظمت" اور اقدار میں استحکام کے لئے کسی نہ کسی عقیدہ پر ایمان بھی ضروری ہے کیونکہ عقیدہ و اقدار لازم و ملزوم ہیں۔ کسی عقیدہ پر مخلصانہ ایمان ہی انسانی اقدار کو محفوظ اور ادبی اسپرٹ کو جلا بخشنے اور استحصال کو روکنے والا ہوتا ہے۔ سید عابد حسین عمر بھر کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد جس نتیجہ پر پہونچے وہ ادیبوں اور شاعروں کے لئے آج بھی لمحۂ فکریہ سے کم نہیں۔

> "وہی عقائد پائیدار ثابت ہوئے جنھوں نے کائنات کی توجیہہ میں کسی نہ کسی مافوق ہستی کا سہارا لیا ہے۔ غرض ادب کا مقصد یہی ہے کہ اس میں صحیح اور صالح اقدار پیدا کی جائیں اور وہ اخلاقی اقدار دراصل مذہبی ہوں گی۔"

ڈاکٹر احمد سجاد

مجلس مذاکرہ

افضل سجاد
فاروقی منزل، بریاتو ہاؤزنگ کالونی
رانچی ۸۳۴۰۰۹، بہار

ابھی چند برسوں قبل تک ترقی پسندی کی حد سے بڑھی ہوئی 'اشتہاریت'، اجتماعیت اور دہریت کے خلاف جدیدیت کی ناوابستگی، علامت اور اساطیریت کا اردو دنیا میں ہر طرف ایک غلغلہ سا سنائی دے رہا تھا۔ مگر ادھر کچھ دنوں سے ایک سناٹا سا چھایا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک انتہا سے دوسری انتہا تک جھولتے جھولتے ہمارے ناقدین اور محققین تھک سے گئے ہیں اور ادبی مسائل کچھ گھسے پٹے سے انداز میں رواں دواں ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ انسانی وجود کی حیوانی تعبیر اور انسانی عمل کی جنسی تعبیر کے بطن سے جو غیر فطری، اجتماعی اور مشینی قسم کے انسان" پیدا ہوئے! کیا ان کے مسائل حل ہو گئے؟ اگر ان کی زندگی کی ڈور سابقہ انداز میں الجھتی ہی جا رہی ہے تو کیا ادب اس کی شعوری یا غیر شعوری عکاسی سے بے نیاز ہو چکا ہے؟ حقیقتاً ایسا ہے نہیں۔ شاید یہ فکری جمود اور اعصابی شکست کی علامت ہے ورنہ پچھلے چند برسوں میں انسانی زندگی بعض جان لیوا مصائب کا مزید شکار ہوئی ہے۔ ہر طرف مایوسی، شکست خوردگی اور خود اذیتی کے بادل امڈ امڈ کر آ رہے ہیں کیونکہ روزمروں کے لفظوں میں وحشت و بربریت کامیاب ہو گئی ہے اور ہماری فطرت کے درندہ صفت عناصر نے اپنا نقطہ نظر ہم سے منوا لیا ہے"

یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب ڈارون اور مارکس سے لیکر یونگ اور سارتر تک مادی اور انسانی علوم و فنون کے بے شمار سربستہ رازوں کو کھولا جا چکا ہے۔ عالمی پیمانے پر زندگی اور ادب میں فکری و فنی جہتوں سے بکثرت تجربات ہو چکے ہیں۔ اردو میں کلاسیکی ہیئتوں سے لیکر اینٹی اسٹوری، اینٹی پوئٹری، آزاد غزل اور نثری نظموں تک کے وقفے وقفے سے ہنگاموں کے باوجود اردو ادب کے قارئین کو بالعموم ایسا لگا کہ جیسے ان لفظی درزشوں سے انہیں نہ مسرت نصیب ہوئی نہ بصیرت، ان کے حقیقی جذبات اور احساس جمال کی تسکین اور ترفع کا کوئی سامان ہو سکا اور نہ اس شور اشوری سے ادب ہی میں کوئی قابل قدر اضافہ ہو سکا۔

اس مجموعی صورتحال کے پیش نظر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اردو کے ناقدین، تخلیق کار اور دانشور حضرات مندرجہ ذیل سوالات پر کھل کے اظہار خیال کریں تاکہ کاروانِ ادب و زندگی صحیح سمتِ سفر متعین کر سکے اور فطری رفتار کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔

۱۔ کیا اس عہد کے قلمکار اور ادیب کا معاشرے اور تہذیب سے تعلق تیزی سے ٹوٹ رہا ہے؟ ۲۔ کیا عظیم ادب کی تخلیق واضح نصب العین اور اعلیٰ اخلاقی قدروں سے وابستگی کے بغیر ممکن ہے؟ ۳۔ کیا جدید ادبی و سائنسی نظریات اور مذہبی اقدار کی پیوندکاری اعلیٰ تخلیقی عمل کے لئے سودمند ہے؟ اگر ہے تو کیا اس کے طریق کار کی بھی تعیین ہو سکتی ہے؟ ۴۔ کیا جدید طرز کے ادبی تصورات و تحریکات نے ادب و تہذیب کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچایا ہے۔

نوٹ: مجھے امید ہے کہ آپ ان سوالوں کے مفصل جوابات مندرجہ بالا پتے پر ارسال فرمائیں۔

منقبت

ماہر [illegible]
[illegible] بنگلہ دیش

کیا پرتو جمال رسالت مآب ہے
ہر ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

جس پر نگاہ مرشد بو تراب ہے
ذرہ ہے خاک پا ہے مگر آفتاب ہے

خود بے مثال اور ہے محبوب بے نظیر
واللہ یہ جواب بھی کیا لا جواب ہے

بے واسطہ خدا کو کوئی دیکھے کیا مجال
اپنی نظر خود اپنے لئے جب حجاب ہے

وہ سر کائنات علیم معانیات
اُمّی اسی لئے ہے کہ اُم الکتاب ہے

میم علیم میں ہے نہاں سر احمدی
پہلے جو نام پاک علی ہے وہ باب ہے

ماہر پہ بھی نگاہ کرم رحمت تمام!
عصیاں نواز دہر میں خانہ خراب ہے

حفیظ میرٹھی

الجھنوں سے میں الجھتا ہوا دن بھر آقا
رات کو روؤں گا تنہائی میں چھپ کر آقا
راہ کا ان کو خبر ہے نہ شعور منزل
قابل رحم ہیں اس دور کے رہبر آقا

آپ کے نور سے منہ پھیر کے دنیا نہ چلے
ورنہ ہر گام پہ کھائے گی یہ ٹھوکر آقا

فاصلوں میں نہ مساوات کہیں گم ہو جائے
اس لئے بیٹھتے تھے سب کے برابر آقا

آپ کو وسعتِ کونین سے کیسے سمجھیں
وہ تو قطرہ بھی نہیں آپ سمندر آقا

حملہ آور جو تھے باہر کے وہ سب ہار گئے
اس کا کیا ہو جو چھپا ہے مرے اندر آقا

ننگ اسلام تھا لیکن یہ مری خوش بختی
مجھ کو مارا ہے مسلمان سمجھ کر آقا

نعت کی فکر میں گم ہے [illegible]
اس کی تخیل کے طائر کو [illegible] آقا

شاہ رشاد عثمانی

صلاح الدین پرویز کی ایک نعتیہ نظم

دورِ جدید کے شعراء میں نعت نگاری کا عام رجحان پیدا ہوا ہے جو ایک نئے فکری میلان کا اشاریہ ہے۔ شاید ہی آج اردو کا کوئی ایسا شاعر ہو، جس نے اس صنف میں طبع آزمائی کی سعادت نہ حاصل کی ہو۔ برصغیر ہند و پاک میں اردو کا کوئی رسالہ و اخبار ایسا نہیں ہے جس میں دو چار نعتیں نہ شائع ہوتی ہوں۔ نعت گوئی، عشقِ رسولؐ اور شوقِ مدینہ ہر دور کے شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے اور انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو اس عظیم ترین موضوع اور اس محمود و محمد و ستودہ ذات کی مدح و توصیف میں صرف کیا ہے۔ چنانچہ جدید شاعری میں بھی اپنی ذہنی خوشبو، عصری تازگی، نظریاتی توانائی اور موضوعاتی پھیلاؤ کے ساتھ یہ صنف ارتقاء کے راستے پر محوِ سفر ہے۔

نعت کے مضامین کو شعراء نے کم و بیش تمام اصنافِ سخن مثلاً قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ، مسدس، مخمس وغیرہ میں قلم بند کیا ہے۔ جو صنفِ شعر جس عہد میں زیادہ مقبول و مروج رہی، اس صنف کو نعت کیلئے بھی اسی اعتبار سے استعمال کیا گیا۔ آزاد نظم عصرِ حاضر کی مقبول ترین صنف ہے اور تمام ہی موضوعات کا اظہار اس صنفِ شعر کے وسیلے سے کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا نئی نسل نے اس ہیئت میں نعت نگاری کی طرف بالخصوص توجہ صرف کی ہے اور ان کی جمیل کوششوں سے نعت عصر کی ایک انتہائی اہم نمائندہ صنف بن کر ہماری شاعری میں ایک معنوی قدر و منزلت کی حامل ہو گئی ہے۔ جدید نعت نے قدیم کے مقابلے میں آزاد نظم کو اپنا کر اس حقیقت پر بھی مہرِ تصدیق ثبت کی ہے کہ نئے افکار کی ترسیل کے لئے بسا اوقات نئی ہیئت کا انتخاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان آزاد نعتیہ نظموں میں نئی شاعری کے اس آبدار عنصر کا بالخصوص لحاظ رکھا گیا ہے جو ایمائیت سے عبارت ہے اور جو مافی الضمیر کے اظہار کے لئے علائم و رموز کو بروئے کار لانے کا قائل ہے۔ اس علامتی طرزِ ابلاغ نے جدید نعت کو ایک ایسی تہ داری سے ہمکنار کیا ہے، جس میں عمق بھی ہے اور انفرادی کا بانکپن بھی۔

صلاح الدین پرویز جدید اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہے جن کی شاعری کے مجموعے "تناظر" "نیلگوں" "جنگل" اور پھر "دھوپ، سمندر، سایہ" دیکھ کر بہت سے ادیبوں اور ناقدوں کو حیرت بھی ہوئی اور ایک ایسے تخلیقی ذہن کا انکشاف بھی جس نے مقررہ تخلیقی ادبی رویوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی علامتوں، استعاروں اور منفرد اسلوب کے باعث، جدید ادب کی تاریخ میں اپنی بالکل الگ اور منفرد شعری کائنات کی تخلیق کی ہے۔ پرویز کی نظموں میں نئی لفظیات کے علاوہ ایک ایسے غیر مشروط ذہن کی کارفرمائی ہے، جس کا رشتہ صرف الفاظ کی چاشنی سے نہیں، بلکہ اس احساس اور آہنگ

سب سے جو نئے اسلوب و آہنگ میں اپنا اظہار انہ اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ پرویز کا ذہن لامحدود اور بیکراں ہے اور اس کا شعوری کردار کو یہ آگہی حاصل ہے کہ جدید عہد کا انسان، آج کی منطق، آج کی دانش ورانہ اصطلاحات اور فلسفوں سے آگے نکل کر نیچر کی ہمہ گیر ابدیت سے اپنا رشتہ جوڑ کر اس لافانی وژن (vision) کو حاصل کرسکتا ہے، جس میں پوری کائنات، انسان کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور جیسے نقاد کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ پرویز اپنی تجرباتی شاعری کی معنویت کی وجہ سے ادبی حلقوں میں ایک امتیازی جگہ پیدا کرچکے ہیں"۔ اس وقت پرویز کی پوری شاعری پر تبصرہ میرا مدعا نہیں، سردست میرے پیش نظر پرویز کی ایسی نظمیں ہیں، جو عشق رسولؐ کے علاوہ اسلامی فکر کے تابندہ نقوش کو پیش کرتی ہیں، اس سلسلے میں سب سے اہم اور عہد ساز نظم "محمد رسول اللہ" ہے جو بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ۔

"یہ صرف عمومی طرز کی نعت نہیں ہے، بلکہ حضور مقبولؐ کی زندگی، ان کے افکار، خدا سے برتر سے ان کا قربت، امت کے احساس سے ان کی شفقت آمیز وابستگی اور خود شاعر کے اپنے احساس کا وہ پہلو جو حضور مقبولؐ کو، ان کے حسن و جمال اور ان کی خصوصیات کو شاعر کی سوچ، افکار اور تصور سے ہم آہنگ کردیتا ہے اس نظم کا ہمہ گیر مفہوم ہے"۔

صلاح الدین پرویز نے رسولؐ کی شخصیت کے ایسے اوصاف کی پیکر تراشی کی ہے، جن اوصاف کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، دیکھا نہیں جاسکتا، جن اوصاف کی بدولت رسول کی سیرت انسان کی عظمت کا ایک symbol بن جاتا ہے، جس میں اپنی اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بدولت رسولؐ کی زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا عکس محسوس کیا جاسکتا ہے چنانچہ شاعر نے سب سے پہلے ہجرت کے واقعہ کی جانب اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے، یہ نعتیہ نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

وہ اپنے گھر سے نکل پڑا تھا
سپید شب کی مسافری سے
سیاہ سورج کا غم اٹھائے، وہ اپنے گھر سے نکل پڑا تھا

یہاں جو بھی الفاظ استعمال ہوئے ہیں یا الفاظ کی ترتیب سے جو اصطلاحیں بنائی گئی ہیں، وہ الفاظ کو اپنے لغوی معنی سے ہٹاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں نہ تو وہ کے معنی وہ ہے اور نہ گھر کے معنی گھر ہے۔ یہاں "وہ" کے مفہوم میں حضرت محمدؐ کی ذات پنہاں ہے اور گھر سے مراد مکہ معظمہ لیا جاسکتا ہے وہ بھی صرف اس لئے کہ شاعر نے اس نظم کا عنوان نعت رکھا ہے اور صرف اسی بنیاد پر قاری کا ذہن الفاظ کے معنی و مفہوم تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ ورنہ اگر یہ نظم صرف نظم کر کے چھپتی تو اس کا اطلاق کسی محبوب، کسی اعلیٰ اوصاف کے حامل رہبر یا کسی بھی عظیم شخصیت پر ہو سکتا تھا"۔ یہی اعلیٰ فنکاری ہے" جو شاعر کو غیر شاعر سے جدا کرتا ہے "سپید شب کی مسافری" کی ترکیب اپنے اندر بڑی معنویت رکھتی ہے۔ ہجرت کو شب ...

اجالے کے مسافر بن کر نکلے اس طرح "سپید شب" کی ایک نئی اصطلاح شاعر کے ذہن رسا کی غماز ہے اور مکہ جو ضلالت وجہالت کا گہوارہ تھا، اپنی تمام دنیاوی چمک دمک کے باوجود وہ ایک سیاہ سورج تھا جس کا غم اٹھائے ہوئے آپؐ نکل پڑے پھر یہ کہ عرب میں انسان ہی تھے جو گمرہی کا شکار رہتے، لہٰذا ایک طرف انسان کی عظمت کا سوال تھا، دوسری طرف انسان کے کارنامے اس کی روسیاہی کا سبب بن رہے تھے۔ ان کا عمل ان کی ایک ایسی مسافری تھی جو انہیں تخریب کی جانب لے جارہی تھی باطل کا سارا نظام ان انسانوں نے اپنا لیا تھا جسے خدا نے آدم کی شکل میں پیدا کرکے "اشرف المخلوقات" کا درجہ عطا کیا تھا اور ان انسانوں کی بے بہری لات ومنات جیسے بت کر رہے تھے جو اس دور کے "سیاہ سورج" کہے جاسکتے تھے، جو اپنی امت کو روشنی تو دینا چاہتے تھے، لیکن خود ان کی سیاہی روشنی کے درمیاں حائل ہوجاتی تھی، اس لئے شاعر نے سپید شب اور سیاہ سورج کی (PARADOXICAL) اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس باطل نظام میں جب رسولِ اکرمؐ نے اپنے کو مکمل طور پر مجبور پایا تو اپنے ہم نواؤں کو لے کر ہجرت مدینہ کے لئے نکل پڑے، اس کے بعد شاعر نے سراپائے رسولؐ کا لفظی تصویر کشی کی ہے۔

وہ شام ابرو، وہ رات گیسو
وہ جسم چھایا، وہ چاند ماتھا
وہ آنکھ شمعیں، وہ ہونٹ صبحیں
سفید [illegible]
[illegible]

کہ جس کی آنکھوں میں [illegible] کے غم
جگمگا رہے تھے

یہاں شاعر نے رسول مقبولؐ کو ایسی شخصیت کا حامل [illegible] ایسے سراپا کا پیکر بنا دیا ہے، جس میں ارضی ماحولوں کے استعارے بھی ہیں اور زمین سے بلند عالوہی کیفیات کو نمایاں کرنے والی علامتیں بھی۔ اس شبیہ کی [illegible] کے بعد وہ حضور اکرمؐ کے تمام تر اوصاف کو واضح کرتا ہے اور کہتا ہے۔

وہ رحمتوں کا عظیم والی
وہ برکتوں والا آسمانی
وہ جنتوں کا حسین مالی
دعاؤں کے راستے بناتا
زمیںؐ کی گرمی پہ چل رہا ہے

ظاہر ہے دین کے اس رہبر اوّل کو کتنی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کی شہادت تاریخ اسلام کے صفحات دیتے نظر آتے ہیں، بقول شاعر

وہ [illegible] میں گھرا ہوا تھا
تمہاری آنکھوں کے بادلوں میں
تمہارے خوابوں کے جنگلوں میں
کئی رحیم وکریم جگنو
تمہاری راتوں کے منتظر ہیں
کہ اے مرے آسمان لوگو!
تمہاری راتوں میں بارشیں ہوں
تمہاری راتوں کی بارشوں میں
تمہارے جگنو چمک رہے ہوں

یہ پورا اقتباس رسولؐ کے خلوص اور امت کے [illegible]

ان کی تمناؤں کا آئینہ ہے ۔ رسول اکرمؐ کی ذات سے شب معراج کا واقعہ منسوب ہے، اس تاریک سیارے سے اٹھ کر آسمانوں تک پہنچنے والی شخصیت کو شاعر نے صرف واقعہ معراج کے تذکرے تک ہی محسوس نہیں کیا، بلکہ فضا کی بیکراں خاموشی میں خدائے برتر کے حضور پہنچنے والے پیغمبر کے وجود کو آسمانوں کی رفعتوں میں اس طرح محسوس کیا ہے جیسے خود شاعر کا احساس بھی آسمانوں میں سفر کر رہا ہے ۔ پرویز نے اس پوری کیفیت کی کیسی خوبصورت منظر کشی کی ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

وہ اب پہاڑی پہ آگیا تھا
کہ منتہا تھی سہیلی اس کی
ہوا نے دیکھا
تھکی ہوئی سانس کی تہوں سے
اسے پکارا
سمندروں کی غلاف آنکھیں
صداؤں کی بے حساب سانسیں
سمٹ کے اس کے قریب آئیں
ہوا تھا لیکن ہوا نہیں تھا
صدا تھا لیکن صدا نہیں تھا
وہ میٹھے پانی کا ایک جھرنا
خدائے برتر کا آئینہ تھا ۔

غور کیجیے تو وہ تمام باتیں اس میں پنہاں ہیں جو معراج میں رسول کریمؐ کو پیش آئیں ۔ معراج سے واپسی کے بعد رسول کی شخصیت اس میٹھے پانی کے جھرنے کی سی تھی، جس میں خدائے برتر کا آئینہ تھا ۔ شاعر کو یہ احساس ہے کہ دورِ جدید کا باطل نظام پھر رسول کا خواہاں ہے، مگر وہ رسول تو اب

شاعر کے لفظوں میں

وہ جا چکا ہے، وہ جا چکا ہے
وہ موتیا جیسے پاؤں والا
وہ چمپئی جیسے نور والا
وہ بیلیا وہ میرا پیارا
اسے بلاؤ کہ لوٹ جاؤں میں اسکی آنکھوں میں نیند بن کے
اسے بلاؤ کہ پھوٹ جاؤں میں اسکے سینے میں بوند بن کے

مگر شاعر کو یہ بھی احساس ہے کہ رسول خاتم النبیین ہیں اب اس دنیا میں کوئی نبی نہیں آئے گا، مگر انہوں نے جو دین حق کی تعلیم دی ہے، خدا کے احکام جن سے انسان کو آشنا کیا ہے اور صداقت کا پیغام انسانیت تک پہنچایا ہے، وہ آج بھی محفوظ ہے ۔

ہمارے رسول کا وہ گھر جہاں سے آپؐ نے معراج کی منزلیں طے کیں، دین و اخلاق اور روحانیت کا ایک ایسا گہوارہ ہے، جو سدا قائم رہے گا ۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے

مگر یہ گھر کیسا گھر ہے اس کا
مہک رہا ہے
یہ کیسا بستر ہے
جل رہا ہے
یہ اسپ از حد مکان والا
ابھی تلک سامنے کھڑا ہے
عبادتوں سے بنا پرندہ
ابھی تلک آنکھ مل رہا ہے
صدا صدا بے صدا فقیر کی
ہوا کے کاندھوں پہ چل رہی ہے

میرے خیال میں رسول کی عظمت پرویز کی راہوں میں ان کی جدوجہد، ان کی قربانیوں، مصائب ومشکلات، ان کے خلوص ومحبت اور ان کی تبلیغ دین وغیرہ کے سلسلہ میں عقیدت کی احساسی تصویر اس نعت میں بڑی فنکاری سے نمایاں کی گئی ہے یہ نعتیہ نظم اپنے آغاز میں بے حد ڈرامائی تفصیل سے شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے اپنے اختتام تک پہنچتی ہے، جہاں شاعر یہ کہہ کر خموش ہو جاتا ہے۔

وہ جا چکا ہے
کواڑ کا نرم گرم دستک ابھی تلک اس کی منتظر ہے۔

صلاح الدین پرویز کی یہ نعتیہ نظم قاری کے ذہن و قلب پر ایک عجیب لذت آگیں احساس قائم کر دیتی ہے یہاں شاعر سب کچھ نامحسوس طریقے سے اپنے قاری کو رسولؐ کے متعلق محسوس کرا دیتا ہے۔ قاری اگر تاریخ اسلام سے آشنا ہے، سیرت رسول سے واقف ہے تو پھر اسے اس نظم میں معنی ومفہوم کی وسیع جہتیں ٹھاٹھیں مارتی نظر آئیں گی۔ یہ نظم جہاں ابتدا، وسط اور انجام کے درمیان زبردست سالمیت کا حامل ہے۔ وہیں اس میں عضویاتی تکمیل کی ایک صورت بھی نظر آتی ہے اور SYNTHESIS کا عمل بھی نظر آتا ہے جس کی بدولت کوئی نظم اعلیٰ شاعری کا نمونہ بنتی ہے یہاں شاعر کی زبان تخلیقی ہے، اس تخلیقی زبان میں جب وہ رسول اکرمؐ سے متعلق اپنی معلومات اور ان کے کردار کی عظمت سے متعلق اپنے محسوسات کی جانب اشارہ کرتا ہے تو پیکر الفاظ میں واضح تصویر ابھارتا چلا جاتا ہے نعت کا یہ تجربہ یقیناً قابل قدر ہے جس سے نعت کا روشن اور امکانات کا کم و بیش اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

غزل

مضطر مجاز

یہ اور بات بڑی اجنبی زبان میں ہے
یہ کائنات قصیدہ خدا کی شان میں ہے

امیر شہر کا سارا شکوہ وجاہ جلال
غریب شہر کے جلتے ہوئے مکان میں ہے

ہوائے عمر اسے مسمار کرتی جاتی ہے
مرا قیام تو گرتے ہوئے مکان میں ہے

ہم اپنا سینہ خالی لئے پھریں کب تک
ہمارے نام کا اک تیر کس کمان میں ہے

مزے مزے کی حکایات غیبتیں توصیف
مری زباں پہ سب دوستوں کا نشان میں ہے

یہ راز ہے تو ہمیں بھی کبھی بتا مضطر
کہاں کا رس تری کانوں سے بھری زبان میں ہے

تمکین آفاقی - پٹ پلی

حالات کی رفتار

اے دوست کسی لمحہ بھی ہو سکتی ہے مسمار
تہذیب نوی کیا ہے بس اک ریت کی دیوار
تہذیب و تمدن کے یہ خود ساختہ "معمار"
گمرہ نظر ان کی تو بہکے ہوئے افکار
کچھ ہم سے کبھی کہتی ہے یہ انداز اشارات
ہر لحظہ بدلتے ہوئے حالات کی رفتار
کس چیز کی قیمت یہ لگاتا ہے زمانہ
بکتا ہے کہیں بندۂ مومن کا بھی کردار
روندے گئے اس طرح کہ عبرت کا نشاں ہیں
کتنے ہی یہاں مسند و کرسی کے طلب گار
چڑھتے ہوئے سورج کا پجاری ہے زمانہ
ہر دور میں عنقا رہی بے باکی گفتار
جو وقت کی لہروں میں تموج کرے برپا
کچھ ایسی کشاکش کبھی تو کرتے یہ سبکسار
بھاتا ہے کہاں پھر کوئی نغمہ اسے تمکین
جس قوم کو خوش آتی ہے شمشیر کی جھنکار

سرمایۂ ملت

سیم و زر سے مقدر اقوام
کب سنورتا ہے کیا سنورتا ہے
کسی ملت کی عظمت و رفعت
آدمی کی رہین منت ہے
آدمی، جو جئے تو حق کے لئے
آدمی، جو مرے صداقت پر
عیش و راحت سے ہو جو بے پروا
جبکا ہر لمحہ جستجو میں کٹے
مرد میداں ہو، سر فروش بھی ہو
جو اڑے تو نہ ٹل سکے ہرگز
ایسے پر عزم لوگ ہوتے ہیں
قوم و ملت کا اصل سرمایہ

عہ : ایمرسن کی نظم A NATION'S STRENGTH کا آزاد ترجمہ

تابش مہدی

مولانا شہباز ___ شخص اور شاعر

میری اس ۳۵ سالہ عمر میں نہ جانے کتنے عزیز، رشتہ دار، دوست، ساتھی، ہمدرد، بہی خواہ، محسن، استاذ بزرگ اور مربی داغِ جدائی دیئے گئے ___ ان سب کی فہرست ہی سے کئی صفحات سیاہ ہو جائیں گے۔

ان میں سے جن دو چار کی جدائی نے مجھے بے انتہا متاثر کیا اور ان کے دنیا سے اٹھ جانے سے شدید محرومی و بے چارگی کا احساس ہوا ___ مولانا شہباز صدیقی امروہی ان میں سرِ فہرست ہیں۔

مولانا میرے استاذ ہی نہیں، سرپرست و مربی بھی تھے اور ہمدرد و بہی خواہ بھی۔ انہوں نے مجھے باپ کی محبت اور استاذ کی شفقت عطا کی، نقد و فن کی دولت اور شعر و سخن کا شعور مجھے انہیں سے ملا ہے، یہ ان کی ہی رہنمائیوں کا فیض ہے کہ میں قلم و کاغذ سے رشتہ جوڑنے کے قابل ہوا ہوں۔

مجھے اس بات کے اظہار میں کوئی عار نہیں کہ اگر مولانا عامر عثمانی کی قلمی و فکری رہنمائی اور مولانا شہباز صدیقی کی بے انتہا و بے لوث شعری و ادبی تربیت مجھے نصیب نہ آتی تو میں شاید بے خوفی اور اعتماد کے ساتھ قلم و کاغذ سے رشتہ جوڑنے کے قابل نہ ہوتا۔

مولانا شہباز صدیقی امروہی برصغیر ایشیا کے عظیم شاعر، بے بدل عروض داں، کامیاب فن شناس، ممتاز طنز نگار، منفرد مزاح گو اور لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کے ادبی جانشین تھے۔ ایک ایسے جانشین جس نے اپنے پیش رو کے اسلوب و انداز کو ترقی دے کر بام عروج پر پہنچا دیا ___ اسی وجہ سے شعر و سخن کی دنیا میں انہیں "اکبر ثانی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ___ حالانکہ فارسی کی بہت مشہور مثل ہے کہ ؎

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل

سنہ ۱۹۶۰ء کا کوئی مہینہ تھا، جونپور میں مولانا عزیز بیانی عزیز مرحوم کی لائبریری میں اخبارات و جرائد کی ورق گردانی کے دوران کسی رسالہ میں "امواجِ تبسم" کے عنوان سے کچھ قطعات نظر سے گزرے، راقم الحروف کو مزاحیہ ادب کے مطالعہ سے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی، مگر خدا جانے کیوں میں ان قطعات کو پڑھے بغیر آگے نہ بڑھ سکا ___ قطعات کو دیکھا تو پتہ چلا کہ ان کا خالق کوئی معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی شخص ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی نظر شعر کی جملہ خصوصیات پر ہے اور وہ انہیں برتنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ ان قطعات کے خالق بھی مولانا شہباز صدیقی امروہی تھے ___

مناسب ہوگا کہ ان قطعات کو آپ تک بھی پہنچا دیا جائے۔ ؎

پوچھی مرہ زبان جو مرحوم [illegible]

ہے مختلف مقام پہ نام اس کا مختلف
اسکول میں تو ہندی ہے اردو دکان پہ ہے

کل جو بہ نرگس و ریحاں سے تھا اردو کا چمن
آج وہ صرف خس و خار کا اک جنگل ہے

لیکن اس پر بھی یہ فرماتے ہیں اس کے مالی
شری بھگوان کی کرپا ہے کشل منگل ہے

بہت کم فرق ہے شہباز اردو اور جادو میں
سمجھتا ہے جو ان دونوں کو دو چیزیں وہ بدھو ہے

لیڈر کے سر پہ چڑھ کر بولتا ہے تو وہ ہے جادو
منش کے مکھ میں گھس کر بولتی ہے تو وہ اردو ہے

تسخیر جس سے کر لے وہ پبلک کے قلب کو
اعجاز ایسا کب کوئی اس کے بیاں میں ہے

دشمن کی بے بسی کا یہ منظر تو دیکھئے
اردو سے اختلاف بھی اردو زباں میں ہے

اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد انجمن خیر الاسلام بمبئی کے مشاعرے میں شرکت کا موقع ملا۔ جناب عمر قریشی اناونسر تھے مشاعرے میں بڑے بڑے "مشاعرہ باز" قسم کے شعرا ہوٹ ہو رہے تھے، حد تو یہ ہے کہ حق کانپوری جیسا خوش آواز اور ماہر غزل سرا بھی سامعین کی بے دادی کا شکار ہو گیا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے صرف خمار نظامی کو خاموشی کے ساتھ سنا گیا تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ناظم مشاعرہ نے مختصر مگر جامع تعارف کے ساتھ جناب مولانا شہباز صدیقی امروہوی کا نام پیش کیا، ___ خدا جانے اس نام میں کون سا جادو تھا کہ سنتے ہی سامعین اس طرح مؤدب اور خاموش ہو گئے جیسے پرائمری اسکولوں میں کلاس ٹیچر کو آتے دیکھ کر دوسری اور تیسری کلاس کے بچے ___ حالانکہ ابھی تک مولانا نے کلام بھی نہیں پڑھا تھا ___ اور غالباً مشاعروں کی دنیا میں وہ اس وقت تک اتنے مقبول بھی نہیں تھے۔ بقول حفیظ میرٹھی

ابھی سے ہوش اڑے مصلحت پرستوں کے
ابھی میں بزم میں آیا، ابھی کہاں بولا

مولانا اپنے ایک شاگرد کی مدد سے مائک پر آئے، اور بغیر کسی تمہید و تقریر کے شروع ہو گئے

مفلس کا جو ہمدرد ہو مزدور کا غم خوار
ایسا کوئی برلا کوئی ٹاٹا نہیں ملتا

جوتے تو بہت ملتے ہیں ہر رنگ کے شہباز
باٹا کی دکاں پر مگر آٹا نہیں ملتا

آپ کی تعریف اے کرسی مآب؟
صدر بزم اتحاد المسلمین

انتخابی عہد میں شغل جناب؟
بس یہی تفریق بین المسلمین

اسی طرح کئی قطعے پیش کرنے کے بعد، لوگوں کی فرمائش پر اپنی مشہور نظم "حکیم جی" پیش کی۔ میں نے دیکھا کہ اہل علم سامعین سراپا شوق بنے ہوئے حسن سماعت کا ثبوت فراہم کر رہے تھے اور مولانا داد و بے داد سے بے نیاز بڑے انہماک سے پڑھے جا رہے تھے۔

تھا تخت پر بچھی ہوئی ہلکی سی چاندنی
مسند تھی جس پہ ایک [illegible]

مسند کے پیچھے جو کہ تھی چھوٹی سی الماری
رکھا تھا جس پہ [illegible]

پہلو میں بیک واش تھا کرنے کو آنچ تھو

تختوں پہ تھی سجی ہوئی ہر چیز بر محل — تھیں درمیاں میں بوتلیں [illegible]
رکھا تھا نزد تختہ قریع انبیق اور کھرل — پوشیدہ ایک گوشہ میں تھا [illegible]

ترتیب سے مطب کی سلیقہ برستا تھا
تھی موسلی کھرل میں تو ہاون میں دستہ تھا

" حکیم جی " کی تعلیم کا حدود اربعہ جب اس انداز میں بیان کیا تو پورا ہال داد و ستائش سے گونج [illegible]

صرف اس قدر ہے انکی طبابت کی ہسٹری — عطار کی دکان پر کرتے تھے نوکری
جب ادویہ سے ہوگئی یک گونہ آگہی — خود بھی دوا بنانے لگے وہ کبھی کبھی

کچھ تجربہ کے بعد دوا ساز بن گئے
پھر یک بیک طبیب خدا ساز بن گئے

بھئی کی یہ ملاقات صرف علیک سلیک کی ہی حد تک رہی — مگر دل میں ان کی عظمت و رفعت جاگزیں ہوگئی [illegible] کسی رسالہ یا اخبار میں ان کی کوئی تخلیق سامنے آتی اسے ضرور پڑھا، موقع ملا تو اس کی نقل بھی محفوظ کرلی، یہی [illegible] ہیکہ ان کے کلام کا کافی ذخیرہ میرے پاس موجود ہے لیکن عجیب اتفاق ہیکہ اس کے بعد سے ملاقات کا موقع نہیں [illegible]

فروری [illegible]ء میں مولانا محمد الصادق الحق صاحب شیخ الحدیث دار العلوم امروہہ کی نوازش کے طفیل میرا تقرر دار العلوم امروہہ میں ہوگیا، مولانا اس میں فارسی کے استاذ رہ چکے ہیں۔ میرے تقرر سے کچھ ہی ماہ قبل انہوں نے وہاں سے تعلق ختم کیا تھا، ان کی جگہ ان کے ہی ایک ہونہار و لائق شاگرد جناب قاضی سید عزیز احمد عباسی صاحب کو بلایا گیا [illegible] قاضی صاحب نہایت نستعلیق، وضع دار اور علم دوست انسان تھے، انہیں اگر "امروہی تہذیب و شرافت" کا نمونہ کہا [illegible] تو شاید کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ تحریک اسلامی اور اس کے قائد سے محبت تو ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ [illegible]ء میں موصوف نے رحلت فرمائی، اس کے بعد لوگوں کی نظر ایک بار پھر مولانا شہباز پر گئی — اور آخری [illegible] تک وہ اسی مدرسہ سے وابستہ رہے۔

دار العلوم امروہہ کا ماحول کہنے کو خالص مولویانہ اور خشک تھا مگر میں نے دیکھا کہ اسٹاف کے تمام ہی لوگ [illegible] کے مدوح مداح و قدردان تھے، لوگوں کو ان کی علاحدگی کا بڑا قلق تھا، جب بھی ان کا نام لیتے بڑے ادب و احترام [illegible] لیتے، مولانا ہی کی وجہ سے ان کے شاگرد جناب قاضی عزیز احمد صاحب عباسی کی بھی بڑی قدر و منزلت ان کے دلوں میں [illegible] [illegible] محمد الوند رمانی صاحب ایم، اے انسپکٹر مدارس عربیہ برائے امتحانات عربی و فارسی [illegible]

[illegible]

[illegible] سبحانیہ الہ آباد کے فیض یافتہ وہ بھی تھے اور میں بھی اسی وجہ سے جب تک وہ [illegible]
[illegible] قریب رہا، اس موقع پر ماتی نے ایک سے زائد بار مولانا کا ذکر کیا، "آشیانہ شہباز" کو [illegible]
[illegible] اور مجھے بھی تاکیداً ان سے ملنے کو کہا، شاید انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں پہلے ہی سے ان کا [illegible]
[illegible] تقریب کو ابھی کچھ چار ہی دن ہوئے تھے۔ اس وجہ سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا، اگلے ہی [illegible]
[illegible] صاحب کے ہمراہ "آشیانہ شہباز" پہ حاضری دی، سرنگ نما کمرہ میں ہمیں بٹھایا، تقریباً دو گھنٹے تک [illegible]
[illegible] پر باتیں ہوتی رہیں، ادب، سیاست، صحافت اور شخصیات غرضیکہ تمام ہی موضوعات درمیان میں آئے
[illegible] بھی نہ خود اپنا کوئی شعر سنایا اور نہ مجھ سے ہی سنانے کی فرمائش کی، اسی سے اندازہ ہوا کہ مولانا وقت گزاری یا
[illegible] نہیں بلکہ ضرورت اور حصولِ مقصد کیلئے شعر گوئی فرماتے ہیں۔ نجی ملاقاتوں اور خانگی صحبتوں میں خواہی نخواہی
[illegible] کی رسم میرے نزدیک وقت گزاری اور تفریحِ طبع یا من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو سے زیادہ اہمیت
[illegible]ے۔

مولانا کی اسی روش نے میرے دل پر ان کی عظمت کا ایک نقش اور ثبت کر دیا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ
[illegible] ـــــ مگر محض شعری و ادبی محفلوں کی حد تک۔

ایک بار یوم فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا منقبتی مشاعرہ ختم ہوا تو رکین بھائی (مولانا کے فرزند کبیر) کے ذریعہ مولانا [illegible]
[illegible] اور فرمایا ـــــ تابش صاحب! کل کسی وقت گھر پہ آئیے گا۔ آپ سے کچھ کام ہے" میں اگلے روز تعمیلِ حکم
[illegible]شیانہ شہباز" حاضر ہوا، چند رسمی باتوں کے بعد فرمایا۔

[illegible] چاہتا ہوں کہ آپ فنِ عروض حاصل کریں، اسی لئے میں نے آپ کو بلایا ہے" ـــــ اور پھر اس کے بعد کافی دیر تک
[illegible]یت و ضرورت پر گفتگو کرتے رہے، مولانا نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ میں ان کے اندر کا اخلاص محسوس کئے
[illegible] اور کل پرسوں پر ٹالنے کے بجائے، اسی وقت بازار سے ۲۵ روپیے والی ایک کاپی لا کر نوٹ لکھنا شروع کر دیا
[illegible] کہ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ مولانا ہر کس و ناکس کو یہ فن سکھانے کی حامی نہیں بھرتے تھے، میری معلومات
[illegible] عارف حسن کاظمی، قاضی عزیز احمد عباسی مرحوم، ستیش کمار فگار، نسیم عباسی اور [illegible]
[illegible] مولانا سے اس فن میں کسی قدر استفادہ کر سکے ہیں۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ [illegible]

[illegible]

بڑھ گیا کہ جو ایسا نہ تعلق خاطر میں بدل گیا۔ میں ان کے گھر کا ایک فرد تصور کیا جانے لگا، ملک کے ان گنت اسفار میں انہوں نے مجھے ساتھ رکھا، بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی انہیں مواقع پر پتہ چلا کہ یہ جو مشاعروں میں "سکۂ رائج الوقت" قسم کے شعراء ہیں ان میں سے کئی مولانا ہی سے اصلاحِ سخن لیتے ہیں، کتنے ہی شعراء کے کلام پر اصلاحیں تو انہوں نے میرے قلم سے دلوائی ہیں۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی کسی کے سامنے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ مجھے بھی سخت تاکید کی کہ میں اس راز کو محفوظ رکھوں۔ ان اسفار میں مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کے اندر کا شہباز اس چلتے پھرتے شہباز سے کہیں زیادہ بلند پرواز ہے، وہ شاعر کے ساتھ ایک سچے پکے مومن اور مخلص و بے غرض استاد صرفِ سخن بھی ہیں۔

ان کی خورد نوازی اور بے غرضانہ تعلقِ خاطر ہی کی بات تھی کہ جس دن میں "آشیانہ شہباز" نہ جا سکتا ہے چین رہتے لوگوں سے دریافت کرتے اور آخر کار شام تک کسی کے ہمراہ ضرور میری قیام گاہ پہونچ جاتے۔ یہ شاید اس لئے بھی کہ کسی اطلاع بغیر اطلاع میری غیر حاضری کی وجہ بالعموم کوئی چھوٹی یا بڑی بیماری ہی ہوا کرتی تھی۔

ان کی خورد نوازی کا یہ انداز بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ:

ایک بار وہاں کے ایک منقبتی مشاعرے میں ایک شاعر نے ایک مولانا کے اشارے پر اپنے ایک شعر میں محض مجھے چڑھانے کیلئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نام لے کر تبرا کیا۔

مولانا سخت ناراض ہوئے اور آئندہ اس پروگرام میں عدم شرکت کا اعلان کردیا۔ فرمایا کہ "یہاں اس نظریے کا کون ہے۔؟ صرف تابش کو تکلیف پہنچانے کے لئے یہ روش اختیار کی گئی ہے۔ بعد میں ان صالح مزاج شاعر نے مولانا سے معذرت چاہی۔ اور مجھ سے بھی اس کا اظہار کیا، تب مولانا شرکت کیلئے آمادہ ہوئے۔

مولانا مزاجی طور پر بڑے خوش طبع اور پرلطف بھی واقع ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں کوئی ایسا برمحل شعر یا لطیفہ وضع کر دیتے کہ لوگ تا دیر فراموش نہ کر سکتے اس سلسلے میں ان کا ایک واقعہ نقل کروں گا۔

امروہہ کے ایک شاعر جناب منور امروہوی اپنی ایک غزل برائے اصلاح لے کر حاضر ہوئے، غزل کی زمین اجنبی سے ملے۔ آپ بھی ہنسے ملے، روشنی سے ملے تھی، مولانا نے از مطلع تا مقطع پوری غزل کی اصلاح فرمانے کے بعد فرمایا لکھ لو ؎

وہ ملے مجھ سے اس طرح جیسے دیوبندی بریلوی سے ملے۔

ایک دوسرا واقعہ بھی

ایک مجلس میں داغؔ کے مشہور شاگرد حفیظ جونپوری کا یہ مقبول ترین مطلع پڑھا گیا: ؎

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

مولانا نے برجستہ فرمایا ؎

[illegible] زلفیں گھنی ہوتی ہے یہ وہ جنگل ہے جہاں راہزنی ہوتی ہے

مولانا کی شاعری خصوصیات پر میرا کچھ کہنا بڑی جسارت ہوگی، یہ کام ارباب علم و فن کا ہے، مگر کیونکہ میں ان کے کلام کا مرتب اور ادنیٰ درجہ کا ایک شاگرد بھی — اس لئے یہ عرض کرنے کا حق تو بہرحال مجھے ہے ہی کہ مولانا شہباز اپنے طرز کے موجد تھے اور خاتم بھی — اول بھی تھے اور آخر بھی — خدائے حکیم و لطیف نے انکی آنکھوں کی ظاہری روشنی چھین کر دل و دماغ کو اس درجہ روشن اور منور کر دیا تھا کہ سماج اور معاشرے کا کوئی بھی پہلو ان کی گرفت سے نہیں نکل سکا طنز و مزاح نگاری اصناف سخن کی سخت نازک اور دشوار صنف ہے، اس میں صحیح معنوں میں وہی شاعر کامیاب ہو سکتا ہے جو زبان کا رمز شناس، مزاج داں اور اہل زبان ہو ورنہ ذرا سی چوک اور بے احتیاطی طنز و مزاح کو، ہجو، پھکڑپن اور لچر پن کی حدوں میں داخل کر دیتی ہے — حد تو یہ ہے کہ جوش جیسا منجھا ہوا پختہ کار اور اہل زبان شاعر بھی اس سے نہ بچ سکا۔

اردو شاعری میں طنز و مزاح کا آغاز کرنے والوں میں "اودھ پنچ" کے کالم نگار سر فہرست ہیں، ان میں مرزا مچھو بیگ ظریف، ترbhون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق، عبدالغفور شہباز اور اکبر الہ آبادی کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان میں لسان العصر جناب اکبر الہ آبادی منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ اس لئے کہ اکبر ہی وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کا رشتہ فن سے جوڑا۔

اکبر نے اس رنگ سخن کو محض تفریح طبع یا مزاح برائے مزاح کے طور پر نہیں بلکہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے اختیار کیا۔ مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف طویل اور کامیاب جنگ انہوں نے طنز و ظرافت ہی کے ذریعہ لڑی۔

عہد حاضر کے شعری طنز و مزاح نگاروں میں سید محمد جعفری، مجید لاہوری، شاد عارفی، ضمیر جعفری، راجہ مہدی علی خاں، شوکت تھانوی، رضا نقوی واہی اور شہباز امروہوی کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ ہلال سیوہاروی، عادل لکھنوی اور ... صابری کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ وہ طنز و مزاح نگار ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کو ہتھیار کے طور پر برتا۔ لیکن جب ہم ان سب کے سرمایۂ شعری کو دیکھتے ہیں تو مولانا شہباز صدیقی امروہوی ان میں سب سے زیادہ قد آور، بلند مقام و مرتبہ پر فائز نظر آتے ہیں۔ انہیں یہ انفرادی شان بخشنے والی ان کے کلام کی خوبیاں، شائستگی، علمی رکھ رکھاؤ، زبان و بیان کی باریکیاں اور ادبی لطافتیں ہیں۔

چونکہ مولانا شہباز کی اکثر نظمیں ڈیڑھ دو سو اشعار سے کم کی نہیں ہوتیں، نمونتہً ایک یا دو چار بند پیش کرنے میں کلام کا لطف جاتا رہتا ہے، اس وجہ سے یہاں میں چند نظموں کا تعارف کراکے ہر نظم کے کچھ بند نمونتہً پیش کروں گا۔

مولانا کی ایک نظم ہے "مناجات اہل دفتر بدرگاہ چیف سکریٹری" یہ نظم خسرو کی مشہور مناجات ... کی پیروڈی ہے۔ پیروڈی ایک تازہ صنف ہے۔ یہ انگریزی ادب سے اردو میں لائی گئی ہے اور بہت کامیاب ... اس میدان میں ... مقبولیت رکھتے ہیں۔ اس صنف کی خصوصیت ہوتی ہے کہ جس شاعر کی ...

انداز و اسلوب اس میں نمایاں ہو' بغیر اس کے کامیاب پیروڈی نہیں ہوگی ۔

اس نظم میں دفتری اہل کاروں نے چیف منسٹر کے سامنے اپنی معاشی و اقتصادی پریشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد تنخواہ میں اضافہ کی اپیل کی ہے ۔ اس کے بعد چیف منسٹر صاحب کی خاموشی اور بے توجہی پر ان اہل کاروں کی زبانی کہلوایا گیا ہے کہ :

نہیں کیا تجھے یاد الیکشن کا وقت — کہ دور آسماں تھا زمیں تجھ پہ سخت
مگر یہ ہمیں تھے کہ سج اپنا رخت — دلانے کو اٹھے تجھے تاج و تخت

بہ لیسان پیکار خود آمدیم
غضبناک چوں شیر نر آمدیم

اس کے بعد الیکشن کے موقع پر ہونے والی جعل سازیوں اور دھاندلیوں پر طنز کرتے ہوئے ان اہل کاروں کی زبانی کہلوایا گیا ہے کہ : ؎

ترے واسطے جعل ہم نے بنائے — زمین آسماں کے قلابے ملائے
کلرکی کے اپنے وہ کرتب دکھائے — کہ اپنے بنے تھے جو بیلٹ پرائے

نمودیم آں حیلۂ رنگ رنگ
کہ حیراں بماندند اہل فرنگ

تجھے ووٹ مردوں سے ہم نے دلائے — دساور سے سوڑ یہ ووٹر منگائے
مخالف کی گولک کے پرچے چرائے — ترے ووٹ گنتی میں اکثر بڑھائے

بہ ہر مکر و حیلہ بپرداختیم
ترا الغرض کونسلر ساختیم

اس نظم میں مولانا کی فن کارانہ صلاحیت اور قدرت کلام عروج پر ہے ۔ انگریزی کی نامانوس اصطلاحوں کو فارسی کا شعلہ میں کھپانا انہیں کا حصہ تھا ۔

علامہ اقبالؒ کی مشہور نظم — " شکوہ " — اور جواب شکوہ " آپ نے ضرور پڑھی یا سنی ہوگی ' یہ اپنے انداز کی ایک معرکۃ الآرا نظم ہے ' — بلاشبہ اردو ادب کی تاریخ میں اسکی مثال نہیں پیش کی جاسکتی ۔

دلاور فگار نے " شکوہ " کی پیروڈی کی ہے ۔ دلاور فگار نے اس نظم " شکوہ ٹیچر " میں ٹیچروں کی طرف سے ارباب اقتدار کے سامنے شکایت پیش کی ہے اور بڑی تفصیل سے ٹیچروں کے مسائل پیش کئے ہیں ۔

مولانا [illegible] نے ارباب اقتدار کی طرف سے دلاور فگار کی " شکوہ ٹیچر " کا جواب دیا ہے ۔ مولانا کی اس نظم [illegible] شکوہ ٹیچر [illegible] مہارت فن ' اور ذہانت و طباعی دیکھنے کے قابل ہے ۔ لطف تو یہ کہ پوری نظم پر علامہ [illegible] اسلوب [illegible] موجود ہے ۔

" جواب شکوہ ٹیچر " کا آغاز یوں ہوتا ہے ؎

شور ٹیچر بھی قیامت کا اثر رکھتا ہے — وہ تباہی جو بشر کا ہے وہ خبر رکھتا ہے
" ڈی پی آئی اسپیشل " ہے میعاد پہ نظر رکھتا ہے — روم سے اٹھتا ہے آفس میں گزر رکھتا ہے
از کے فریاد مری ہیڈ کے دفتر پہ پہونچی
در دفتر کے تھرو باب منسٹر پہونچی

اس بند میں " ڈی پی آئی اسپیشل " " باب منسٹر " جیسی بے تکلف ترکیبیں ، اور " تھرو " و " میعاد " کے برجستہ الفاظ کس درجہ مزہ دے رہے ہیں ، سماعت کیلئے بالکل نامانوس نہیں معلوم ہوتے ۔ اور دفتر کے ساتھ در اور " منسٹر " کی رعایت سے " باب " کا استعمال بھی ان کی ذہانت کی نمائندگی کر رہا ہے ۔

اگلا بند ملاحظہ فرمائیں : ؎

گیٹ کیپر نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی — تھا پیون کا یہ اشارہ کہ یہیں ہے کوئی
اردلی بولا کہ مغموم و حزیں ہے کوئی — دفتری بولا کہ مردود و لعیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو مہتر سمجھا
مجھ کو لونڈوں کا ستایا ہوا ٹیچر سمجھا

اب یہاں سے ارباب اقتدار کی طرف سے جواب ملاحظہ فرمائیے ؎

قوم کا ہم نے بنایا تھا جو تم کو معمار — اس کی تعمیر و ترقی کا کیا تھا مختار
اس کی پاداش میں تم نے کیا ہم پر وار — کر دیا وحدت ملی کی بنا کو مسمار
ڈال دی خاک رخ صلح و رواداری پر
جنگ جو بن گئے لیڈروں کی مکاری پر

تم نے اسکولوں میں نفرت کا اٹھایا طوفان — درس گاہوں کو فساد کا بنایا میدان
جذبۂ فرقہ پرستی کو چڑھا کر پروان — کر دیا قوم ملائک کو مجسم شیطان
علم کا ہاتھ سے بچوں کے علم چھین لیا
کر کے تلوار عطا ان کو قلم چھین لیا

[illegible] لیا
[illegible]
[illegible]

ہم کو تسلیم کہ تم رکھتے ہیں بیسک کا گیان ٭ ڈالٹن کا تمہیں معلوم ہے مافیٹ یا ایان
ماورائے تصور جس سے کبھی پایا ہے تم نے فیضان ٭ ہے پراجیکٹ کے پیتھڈ کا مکمل تم کو عرفان
علم رکھتے ہو مگر کوئی عمل تم میں نہیں
نخل تم سرو سہی کا ہو کہ پھل تم میں نہیں

"انٹرویو" بھی مولانا کی ایک معرکۃ الآرا نظم ہے۔

اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ ایک روز کسی محفل میں کسی بڑے عہدے کیلئے "انٹرویو" لے رہے تھے۔ امیدوار میں بڑی بڑی ڈگریوں کے مالک تھے ——— گویا مولانا ہی کی زبان میں سہ

امتحان دینے وہاں آئے تھے جو امیدوار ٭ ہو رہے تھے ڈگریوں کے بوجھ سے سب زیر بار
کالجوں میں کر کے آئے تھے ادا وہ اپنے پارٹس ٭ بیچولر آف آرٹس تھے کچھ، کچھ وہ ڈاکٹر آف آرٹس
لیکن۔

بوکھلاہٹ میں نکلتا تھا زباں سے جو سخن ٭ زعفران کا کھیت بن جاتی تھی اس سے انجمن

وہ امیدوار سوالوں کے جواب کس طرح دے رہے تھے ——— یہ مولانا کے قلم سے سوال و جواب دونوں ساتھ ساتھ ملاحظہ فرمائیں اور لطف لیں۔

ہندی کا قومی پرندہ کیا ہے؟ جی وہ کالے ہے ٭ کون ہے جو اپن لائی؟ چین کی ایک چائے ہے
ناگاساکی کس لئے مشہور ہے جاپان میں؟ ٭ میلا بیساکی کا لگتا ہے دہلی رمضان میں
کون تھا سنگر کا موجد؟ آگرہ کا تان سین ٭ بدھ کا اصلی نام کیا تھا؟ لالہ منگل داس جین
مارکو پولو کی بابت تم کو کیا معلوم ہے؟ ٭ کھیل پولو کا اسی کے نام سے موسوم ہے
ہے رواں دنیا کے کس خطے میں دریا کرے؟ ٭ ملک پاکستان میں کوہ مری سے کچھ پرے
لارڈ ملٹو کون تھا؟ اردو کا افسانہ نگار ٭ نیگرو کا ارتھ کیا ہے؟ نیاگرا کا آبشار
گوکھلے کو کس لئے حاصل ہے دنیا میں وقار؟ ٭ اوکھلے میں بند جمنا ہے انہی کا شاہکار
کون ہے جس نے بنا تھی تھی "نئی دنیا" پلید؟ ٭ نام اس ملاح کا تھا مولوی عبدالحمید
ایم سی سی کس کو کہتے ہیں وہ کیا تنظیم ہے؟ ٭ ایم سی سی کی طرح ہاکی کی [illegible]
[illegible] نقش قلم؟ ٭ نام تھا [illegible]
[illegible] ٭ [illegible]

آخر میں مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

ہے شہباز میں نے یہ سوال اور یہ جواب — کہ اٹھائے ساختہ یا ئندہ بالائے انقلاب

تعلیم کی موجودہ [illegible] اور عہدہ داروں کی نااہلی پر اس سے اچھی، متوازن، دلچسپ اور بھرپور طنزیہ شاعری کس اور نے کی ہو

مولانا کا تمام ہی کلام یکساں لطف و کیفیت رکھتا ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست ؎

کس کا انتخاب کیا جائے اور کس کا نہیں "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر یہ چند نمونے پیش کر دیے گئے

انشاء اللہ اگر زندگی نے ساتھ دیا اور حالات سازگار رہے تو جلد ہی ایک مفصل مقالہ کتابی شکل میں پیش کروں گا۔

ادب کی تاریخ کا ایک بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ایک شاعر و ادیب کسی خاص صنفِ ادب میں نام کما لیتا ہے۔ اسی صنف کو اپنی گراں بہار متاع سمجھتا ہے۔ لوگ بھی اس کو اسی صنف کا مردِ میدان تسلیم کر لیتے ہیں، حالانکہ اس کو دوسری صنف میں کمال امتیاز حاصل ہوتا ہے۔

مرزا غالب کو تمام عمر اپنی فارسی شاعری پر ناز رہا" لیکن ان کی شہرت و مقبولیت کا ذریعہ ان کی اردو شاعری بنی مولانا شہباز صدیقی امروہوی کی شخصیت اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، ان کو پوری دنیائے ادب طنز و مزاح کا امام تسلیم کرتی ہے، —— مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ دوسری اصناف کے بھی شہسوار تھے —— فرق صرف اتنا ہے کہ مرزا غالب ہمیشہ اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے اور اسے سرمایۂ زندگی تصور کرتے رہے —— اور مولانا نے اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ساتھ ساتھ اپنی سنجیدہ و نعتیہ شاعری کو بھی اپنی زندگی کا بے بہا سرمایہ اور بیش قیمت متاع سمجھا اور جانا ہے۔

جن لوگوں نے ان کی نعتیہ اور منقبتی نظمیں "خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم" "خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم" "شیخین رضی اللہ عنہما" "افضل البشر رضی اللہ عنہ" اور "خالد سیف اللہ رضی اللہ عنہ" اور شخصیاتی نظمیں "شاعرِ مشرق" "طوطیٔ ہند" "شہنشاہِ شاعراں" "ماہر القادری" "عامر عثمانی" "حفظ الرحمٰن سیوہاروی" وغیرہ پڑھی ہیں، انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا مزاح نگاری کے اگر امام و سلطان تھے تو سنجیدہ گوئی کے بھی امیر و قافلہ سالار تھے۔ افسوس کہ مولانا کا کلام پورے طور پر منظرِ عام پر نہیں آسکا۔ جس کی وجہ سے نقادانِ فن ان کا صحیح مقام و مرتبہ متعین نہیں کرسکے۔

مولانا شہباز صدیقی ۲۳ جنوری ۱۹۰۸ء کو اپنے آبائی وطن امروہہ محلہ [illegible] پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور پروان چڑھے، اردو و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد جناب [illegible] سے حاصل کی، اس کے بعد ۱۹[illegible] میں میٹرک کا امتحان [illegible] سے پاس کرکے [illegible]

لیکن ل۔ احمد اکبر آبادی کے بعد جو دو بہت بڑے نام اردو افسانے کی دنیا میں ابھرے ہیں وہ ہیں شین مظفر پوری اور ضیا عظیم آبادی۔

ش مظفر آبادی نے بنگال کے ماضی اور حال کی خوب صورت اور دل کش تصاویر اپنے افسانوں میں پیش کی ہیں اور اس حقیقت نگاری سے کام لیا ہے جس کی روایت پریم چند نے ڈالی تھی ــــــ آپ نے بظاہر بہت معمولی معمولی واقعات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا لیکن ان کے پس پردہ بڑے بڑے نتیجہ خیز جذباتی اور ذہنی حقائق کو محسوس کرلیا ہے آپ کے افسانوں میں دردمندی اور انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے" علاوہ اور دلکش رنگینی کے تمام افسانوں میں ان کا فکر نمایاں نظر آتی ہے۔

ضیا عظیم آبادی نے بنگال کی دیہاتی زندگی [illegible] اس طور پر خاص طور پر نوجوانوں اور لڑکوں کی زندگی پر افسانے لکھے اور اس زندگی کو مکمل طور پر پرکھنے کی کوشش کی جو ان کی نظروں میں سمائی ہوئی تھی اور دل پر پوری طرح سے قابض تھی۔ انھوں نے دیہاتی زندگی کے واقعات اور روایات کو اس خوب صورتی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے کہ قاری ان میں کھو سا جاتا ہے اسی لئے مولانا صلاح الدین نے انھیں "بنگال نگار" کہا ہے اور عبادت بریلوی نے انھیں "حیات نگار" کا خطاب عطا کرتے ہیں۔

الرحمن ۱۹۴۵ء تا ۱۹۵۰ء کے قریب اردو افسانہ ہر لحاظ سے اپنے شباب پر تھا جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو بنگال کے اردو افسانہ نگاروں کی ایک نوع ابھر کر سامنے آئی جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں، رسم و رواج اور روایات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور نئے نئے رجحانات سے اردو دنیا کو روشناس کرایا۔ ان میں راحت آرا بیگم، جوہر غازی پوری، قیس شمشیر روی، سالک لکھنوی، پروفیسر شاہ مقبول احمد، صالحہ بیگم مخفی، صغریٰ سبزواری، سہیل واسطی، نشاط الایمان وفا مشرقی، شائستہ اختر، مجرم محمد آبادی، یوسف آمر، ساجن پردیسی، مظفر عظیم آبادی، جاوید نہال، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، شہزاد منظر، ادیب سہیل، قطب شاہین، وہاب اشرفی، علی اکبر اور محمود ایوبی وغیرہ وغیرہ بہت اہم ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں کے تانے بانے نئے انداز سے بنے اور اپنا نیا اسلوب اختیار کیا جو ان کا اپنا انفرادی رنگ تھا [illegible] اور یہ لوگ اپنے اس انفرادی اسلوب اور فکر خیال کی بنا پر پہچانے جاتے ہیں۔ یہی بنگال کے افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی دین ہے جس نے اردو افسانے کو بہت متاثر کیا۔

تقسیم کے تین چار سال تک فسادات ہی اردو افسانے کا موضوع بنا رہا اور قریب قریب سبھی افسانہ نگاروں نے اس المیہ پر افسانے لکھے جس سے انسانیت اچانک دو چار ہوگئی تھی اس موضوع پر راحت آرا بیگم، سالک لکھنوی، قیس شمشیر روی، سہیل واسطی، صغریٰ سبزواری، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، جاوید نہال اور نشاط الایمان نے بہت ہی اچھے افسانے لکھے [illegible] کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا جن میں راحت آرا بیگم کی "ماں" اور "انقلاب" قیس شمشیر روی کا [illegible] "شانتی پیدا ہوتی" اور "رنگوں میں گھرا ہوا آدمی" جاوید نہال کا "سمندر لہریں مچھلیاں" شانتی رنجن

شہباز قہقہوں کو مرے سرسری نہ جان | درد دل ان میں ہیں نے بھرے ہیں سمیٹ کر
در اصل تلخ گولیاں کونین کی ہیں یہ | جن کو کیا ہے پیش شکر میں لپیٹ کر

لیکن ان قہقہوں کے درمیان مولانا نے ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ کسی کی خاطر شکنی نہ ہو یا کسی کی بے جا پگڑی نہ اچھالی جائے —— فرماتے ہیں ؎

شہباز دیکھ تیری سموم مزاح سے | اخلاقِ اہل قوم کی کھیتی اجڑ نہ جائے
لوگوں کو محفلوں میں ہنسانے کے واسطے | اس طرح ہنس کہ خود تری صورت بگڑ نہ جائے

پہلی جون ۱۹۸۰ء کو مولانا اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اب وہ کبھی لوٹ کر نہ آئیں، مگر ان کا چھوڑا ہوا بیش قیمت ادبی سرمایہ ہمیشہ کام آتا رہے گا۔

اقبال کو اس دنیا سے رخصت ہوئے مدتیں بیت گئیں لیکن اپنے اسلامی افکار اور مصلحانہ نگارشوں کی وجہ سے وہ اب بھی ہمارے، آپ کے اور ہر اسلام پسند کے ذہن و دل میں رہتے ہیں —— ان کے فکر و نگارش سے استفادہ کا سلسلہ تا دیر جاری رہے گا۔

مولانا شہباز بھی ایک درد مند مصلح، قوم کے سچے بہی خواہ، اور معاشرے کی تطہیر کے علمبردار تھے، انہوں نے بھی اپنے کلام کے ذریعہ اصلاح و فلاح کا قیمتی سرمایہ پیش کیا ہے۔ اپنی طنز نگاری کو انہوں نے ڈھال کے طور پر استعمال کیا ہے۔ انشاء اللہ وہ بھی تا دیر نہ بھلائے جاسکیں گے جس طرح کہ اقبال نہیں بھلائے جاسکے۔

محسن انصاری

غزل

حشر اٹھانا تھا مگر حشر اٹھایا نہ گیا | تھے جو قبروں میں پڑے ان کو جگایا نہ گیا
شہر قاتل ہے تو ہم منہ میں زباں رکھتے ہیں | چپکے رہنے کا سبق ہم کو پڑھایا نہ گیا
منتظر روزِ قیامت کی ہے دنیا لیکن | ایک دن داغ جگر ہم سے دکھایا نہ گیا
رازداری ... ہے جیسے آپ حیا آتی ہو | ہے ستم اس کا اگر راز چھپایا نہ گیا
ہوش کھونے کا تو کیا ذکر ہے سوئے بھی نہیں | عشق میں ہم سے کوئی لمحہ گنوایا نہ گیا
پاکبازانہ کوئی زندگی ہوتی ہے بسر | سچ ہے یہ بار گراں ہم سے اٹھایا نہ گیا
شمع سے تھے تو بہت دور ہم انجمن میں | دل کو پروانے کی گرمی سے بچایا نہ گیا
کچھ سمجھ کر ہی کوئی آیا ہماری جانب | ہم ہی کم حوصلہ تھے ہاتھ بڑھایا نہ گیا
ہم کو لیتے کبھی ملے اور برے بھی محسن | دل کسی کا بھی مگر ہم سے دکھایا نہ گیا

۴۵

محمد سلیم خان ہمراز

افسانہ میں مغربی بنگال کا حصہ

مغربی بنگال ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اس صوبے نے جتنی اردو زبان کی خدمت کی ہے شاید ہی کسی نے کی ہو یہاں کے لوگوں نے اردو زبان اور اس کی ترقی کے لئے دل و جان سے مدد کی اور کر رہے ہیں آج بھی ایک بہت بڑی تعداد یہاں بنگال میں اردو بولتی لکھتی اور پڑھتی ہے آزادی کے بعد صحیح اردو تعلیم کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے نوجوان ابتدائی تعلیم سے محروم ہو گئے بنگال کے لوگوں کی اردو دوستی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی زبان بنگالی دیکھنے کے ساتھ ساتھ اردو کو اپنایا اور اپنے دلی جذبات کو ترجمانی کے لئے اردو میں افسانے لکھے نظمیں اور غزلیں کہیں ۔

یہی سبب ہے کہ بنگال کی سرزمین سے لاتعداد ادیب اور شاعر ابھرے اور ساری اردو دنیا پر چھا گئے جن کا شمار نو سرف اردو کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں کیا جاتا ہے ۔

یہی کچھ اردو افسانے کے سلسلے میں بھی ہوا ہے بنگال نے جتنے اردو افسانہ نگار پیدا کئے ہیں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ اردو افسانے پر بنگال کی حکمرانی ہے ___ در حقیقت اردو افسانہ ۱۹ ویں صدی کے آخر میں مغربی افسانے کے اثر سے وجود میں آیا۔ اس کے وجود میں آتے ہی بنگال کے احباب نے اسے گلے لگایا اور اپنے جذبات کی ترجمانی کے لئے ایک بہتر ذریعہ سمجھا۔ ابتدائی دور میں جو افسانے لکھے گئے وہ زیادہ تر رومانی تھے ان میں زیادہ تر شاعرانہ جذبات کی ترجمانی کی گئی تھی ۔

لیکن جلد ہی اردو کے افسانہ نگاروں نے اس طرز کی انداز کو خیر باد کہہ دیا اور مقصدی انداز اختیار کیا ساتھ ہی ساتھ اردو افسانے نے اپنی مستقل شکل بھی اختیار کر لی اس سلسلے میں پریم چند کا نام سر فہرست ہے جنھوں نے اپنے افسانوں میں حکومت اور عوام کے سامنے کچھ اصلاحیں پیش کیں تاکہ تعلیمی اور معاشرتی نظام کو بہتر بنایا جا سکے اور اس کے لئے انھوں نے ملک اور قوم کی ابتر زندگی کی شرح اور ایسی تصویر پیش کی تاکہ لوگوں میں اس ابتر زندگی کو بہتر بنانے کا خیال اور شوق پیدا ہو سکے ۔

پریم چند کی اس روایت کو سب سے پہلے بنگال کے مشہور افسانہ نگار ل۔ احمد اکبرآبادی نے اپنایا اور اپنے افسانے پریم چند ... میں یو پی کے کسان کے بجائے بنگال کا کسان اپنے مسائل کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا بنگال کا گاؤں ... یو پی کے گاؤں سے تھوڑا سا مختلف تھا ۔

ہونے کی وجہ سے ہندو کالج میں اردو کے استاذ ہو گئے اور سولہ سال تک وہاں کام کیا۔ پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ شعر گوئی کا شوق عہد طفلی ہی سے دامن گیر رہا، دس سال کی عمر سے شاعری کا آغاز کیا۔ اس زمانہ میں گل تخلص کرتے تھے اس کے بعد جب شعور پختہ ہوا تو مسلم تخلص اختیار کیا، اور ۱۹۵۱ء تک یہی تخلص رہا۔ ملک کے موقر جرائد میں ان کی نگارشیں مسلم صدیقی کے ہی نام سے شائع ہوئی ہیں اسی زمانہ میں امروہہ کے معتبر استاذ شاعر جناب علامہ سید جمیل احمد افق کاظمی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، انگریزی کی کہانیوں اور نظموں کے اکثر اردو منظوم ترجمے ان کے اسی دور کی یادگار ہیں ——— یہ شعر بھی اسی دور کا ہے:

ٹھہر لے شمع ہستی اس قدر عجلت نہیں اچھی مجھے اک آہ کر لینے دے پھر خاموش ہو جانا

۱۹۴۳ء میں آنکھوں کی تکلیف ہوئی، کافی علاج کیا مگر کچھ بھی کارگر نہ ہوا، ——— آخرکار ۱۹۴۵ء میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محروم بینائی ہو گئے ——— اور ۱۹۵۱ء میں وہ مسلم سے شہباز ہو گئے۔

ان کے گہرے دوست جناب حکیم کلب علی شاہد امروہوی بتاتے ہیں کہ

"بھائی (مولانا شہباز صاحب) بمبئی کے طویل سفر سے لوٹ کر آئے تو ایک ادبی محفل میں ہم دونوں ساتھ گئے راستہ میں میں نے پوچھا کہ آج آپ کیا سنائیں گے ——— ؟ فرمایا "آج میں چولا بدل کر سامنے آؤں گا" ——— اور جب وہاں ان کو دعوتِ کلام دی گئی تو انہوں نے کوئی غزل یا نظم کے بجائے ایک مزاحیہ نظم سنائی، شرکاء کافی محظوظ ہوئے اور سب نے رائے دی کہ وہ اسی رنگ میں شعر گوئی کریں" اور پھر یہ بھی دیکھا گیا کہ وہی مولانا سلطان احمد جو مسلم صدیقی کی حیثیت سے درو دیوارِ امروہہ یا رسائل و جرائد کے فائلوں سے باہر نہیں نکل سکے تھے شہباز بننے کے بعد پوری دنیائے سخن کی سلطانی فرمانے لگے ——— اور بقول مولانا محمد عبادت کلیم

"وہ ایسی ایسی پروازیں دکھائیں کہ اجعل بھی ہو گئے اور ایسے ایسے گل کھلائے جو رہتی دنیا تک اپنی مہک اپنی خوش رنگی کے باعث اہل ذوق کے زبان و گوش کا زینت بنے رہیں گے" (آئینۂ شہباز مطبوعہ پاکستان ص ۳)

ملک کے بڑے بڑے مشاعروں میں ان کی شرکت ناگزیر سمجھی جانے لگی، ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں بکثرت انہیں مدعو کیا گیا، ہندو پاک کا شاید ہی کوئی رسالہ ایسا ہو جس نے ان کی تخلیقات کو اپنے صفحات میں جگہ دینے میں فخر نہ محسوس کیا ہو۔

رنگِ سخن بدلنے کی کوئی خاص وجہ مولانا نے کبھی نہیں بیان فرمائی ——— لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ اپنے قطعات میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

عیاں ہے ساز ظرافت سے سوزِ دل میرا نہاں ہے دل کی لگی دل لگی کے پردے میں

یہ قہقہے نہیں شہباز میرے نالے ہیں بہار ہے [illegible]

جیسا چاہا دیکھا، "سام سنگھ" اور "زماد کا کاشتا" اور "نشاط اور پیمان کا گاؤں" میں ایسے لازوال افسانے ہیں جن کو پڑھ کر [illegible] ہو جاتا ہے۔

دھیرے دھیرے فسادات کا اثر کم ہونا شروع ہوا تو افسانہ نگاروں کی توجہ ان مسائل کی طرف گئی جو آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ملک کی تقسیم سے پیدا ہو گئے تھے۔ اب بنگال کے افسانہ نگاروں نے انھیں اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ساتھ ہی نئے رجحانات سامنے آئے وہ بھی بنگال کے افسانہ نگاروں سے بچ نہ سکے۔

اب پرانے افسانہ نگاروں کے ساتھ کچھ اور نئے افسانہ نگار ابھرے جو پرانے لکھنے والوں کے ساتھ مل کر اپنے افسانہ کو اپنے کاروان کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ نئے افسانہ نگار ابھرے ان میں ظفر اوگانوی، انیس رفیع، فیروز عابد، عابد ضمیر، آغا رشید مرزا، عبدالمتین، اظہار الاسلام، شمس ندیم، صدیق عالم، سعید پریمی، نذیر احمد یوسفی، جاوید عالم، سیف [illegible]، روبی اعظم، شاہدہ حسن، مشتاق اعظمی، تسکین انصاری، وہاب [illegible] اور ممتاز افسانہ نگار جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے وہ آزادی سے پہلے سے لکھ رہے تھے اور اب تک لکھ رہے ہیں یہ کارواں سارے ہندوستان میں پھیل تو گیا لیکن افسانہ نگاروں کے انداز نہیں بدلے۔

مثال کے طور پر شین مظفر پوری پہلے کلکتہ اور بعد میں پٹنہ میں رہے لیکن ان کے قلم نے ہمیشہ بنگال کی ہی باتیں کی ہیں [illegible] کھیتوں کی اور [illegible] کی کہانی جو ان [illegible] کی اور اردو افسانے کے شائقین ان سے لطف اٹھاتے رہے۔ اسی طرح ضیاء عظیم آبادی کا قلم بھی [illegible] نہیں ہے وہ تجارتی مصروفیات کے باوجود جب بھی وقت ملتا ہے افسانے ضرور لکھتے ہیں جو حقیقت پسندی اور [illegible] پرستی جو ان کے افسانے کی جان ہے کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے البتہ زمانے کے ساتھ ساتھ موضوعات ضرور بدلے ہیں اور ان بدلتے ہوئے حالات پر بنگال کے افسانہ نگار برابر افسانے لکھ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کاروباری قسم کے افسانے ہیں جن میں افسانہ نگار نے اپنے کاروبار کو موضوع بنایا ہو یہ بہت دلچسپ اور بہت حقیقت پسندانہ افسانے ہیں کہ آپ جس کاروبار میں مصروف ہیں اسی پر افسانے لکھیں جائیں جہاں یہ دیکھنے میں بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن افسانے کی تکنیک کے لحاظ سے [illegible] مشکل بھی ہے لیکن کچھ اور نئے موضوعات جو پچھلے برسوں میں سامنے آئے ہیں ان پر بھی بنگال کے افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا ہے ان میں خاص بات یہ ہے کہ اب گروپ یا سوسائٹی کے بجائے خود پر زور دیا جانے لگا ہے مثلاً مزدوروں کے مسائل پر نہیں بلکہ کسی ایک مزدور جو رکشا چلاتا ہے یا ایک لڑکی جو کسی دفتر یا دوکان میں کام کرتی ہے ایک بے کار تعلیم یافتہ نوجوان کیا کچھ سوچتا ہے اور کیا کرتا ہے کیسے وہ زندگی سے جدوجہد کرتا ہے یہی آج کے افسانوں کا موضوع ہے اس پر برابر لکھا جا رہا ہے اور بنگال کے افسانہ نگار بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں یہ موضوع اتنا پھیلا کہ اس میں کال گرل اور اسمگلر تک شامل ہو گئے [illegible] کرتے ہوئے افسانہ نگار بڑھتی ہوئی آبادی جیسے مسائل کو لے کر بیٹھتا ہے اور پچھڑے طبقہ کو سہولیات کا [illegible] تاکہ وہ بھی زندگی کو بہتر طریقے سے گزار سکیں۔

[illegible] موضوعات پر پرانے اور نئے لکھنے والوں نے برابر قلم اٹھایا اور بہترین افسانے پیش کئے [illegible]

اظہار الاسلام بہت اہم ہیں کیونکہ ان کے افسانے سیدھے سادے معصوم کرداروں کے افسانے ہوتے ہیں مشتاق اعظمی نے ظلمت کے سیاہ حاشیے کی روایت پر مختصر مختصر کہانیاں لکھی ہیں "وہ مرگیا" جو بہت پسند کی گئیں ہیں ان کا فن برابر ترقی کر رہا ہے ان کا مطالعہ مطالعہ بہت وسیع اور گہرا ہے ابھی ہم کو ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

جب علامتی افسانوں کا دور آیا تو انیس رفیع نے "بوجھ" "سات وال بوڑھا" اور اب "وہ اتنے دنوں" [illegible] عابد نے "اندھی گلی میں صبح" اور "سناٹا" عابد ضمیر نے "ذہبت" "ناسور کا کرب" عبدالمتین نے "جبلت" اور "ایسا ہوا" "ظفر [illegible]" "[illegible] کا ورق" شمس ندیم نے "تخلیق" اور فہیم اشفاق نے "نصف دائرے کا نوحہ" لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ بنگال کے افسانہ نگار کسی سے پیچھے نہیں ہیں یہ ہماری نئی پود ہے خاص طور پر وہ افسانہ نگار جنہوں نے آزادی کے بعد لکھنا شروع کیا ہے علامتی افسانے میں بہت آگے ہے۔

ان اہم بنگال کے افسانہ نگاروں کے علاوہ جو اردو دنیا میں اپنا مقام بنا چکے ہیں ایک بہت بڑی تعداد ہے جو روایتی انداز کے افسانے لکھ رہی ہے جو "شاعر" "شب خون" "جواز" "الفاظ" "توازن" "امکان" "سہیل" "نیا دور" "آج کل" اور "روح ادب" جیسے معیاری ادبی رسالوں میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے ہیں اور عوام انھیں دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

لیکن افسانہ نگاروں کی ایک اور پود جو ۱۹۷۵ء کے بعد ابھری ہے برابر افسانے لکھ رہی ہے اور ادب میں اپنا مقام بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ان میں محمد سلیم خان نیراز، شمیم مسرور، محمود یسین، سید الابرار، الیاس قریشی، قیام امین ریانی، اقلی، بشیر احمد، شوکت عظیم، مشتاق انجم، جمیل اختر اسد، شبیر اختر، ساجد نواز، جمیل ارشد، مقصود دانش، نسیم اختر، نیلوفر پروین، نگار بانو ناز، یاسمین اختر، طلعت عباس روشن، کشور آرا، حاشیہ نکہت، ملکہ تبسم، زینت بیگم ناز، نسیم سلیم، شبی عرفی، ساگر چاپدانوی، امر امیری، نور بور رشید، الف انصاری، شارق انصاری، عشرت بے تاب، پروین احمد، شیخ شاداں، مختار الحق مختار، ساجد علی ساجد، شمیم شاکر، شہزاد، یوسف تبریز، شین کرنی، غلام حسین وغیرہ خاص نام ہیں۔

الغرض بنگال کی سرزمین نے اردو زبان و ادب کو لاتعداد افسانہ نگار دیئے ہیں جنہوں نے بندھے(؟) ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور افسانے کی روایت کو مستحکم کیا ہے ـــــ یہ بنگال کی بہت بڑی دین ہے کہ جس کے سپوتوں کے کارنامے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے جب اردو افسانے کا ذکر ہوگا بغیر بنگال کے ان ہونہاروں کے وہ مکمل ہی نہیں ہوگا ـــــ اور افسانے کے رجحانات ہیں جن کو سب سے پہلے بنگال کے افسانہ نگاروں نے پیش کیا ہے اور جن کی تقلید آج پورا ہندوستان کر رہا ہے۔

ایک شعر

جوانی میں بشر بھرمار[1] اک بندوق ہوتا ہے
بڑھاپے میں وہی پھر سینۂ صندوق ہوتا ہے
(غالب [illegible])

---

[1] بھرمار بندوق جو چار روپے قبل مستعمل تھی جس میں گولہ بارود بھرتے بھر کر فائر کرتے تھے یہ دونوں [illegible]

○

کل تھے سینے میں سمندر کے چٹانوں کی طرح — ڈھ گئے آج وہی کچے مکانوں کی طرح

شاید اپنی نہیں لکھتے ہیں جو پلٹنے پر بھی — دل ہمارا ہے انھیں اونچے مکانوں کی طرح

یونہی کچھ روز اگر وقت کے ہاتھوں میں رہا — میں بکھر جاؤں گا تسبیح کے دانوں کی طرح

جن کی لکھی جاتی ہے برسات کے بعد — میں دیہات کے ان کچے مکانوں کی طرح

کس کی آواز مرے ذہن کی محرابوں میں
گونجتی رہتی ہے ہر وقت اذانوں کی طرح

نعمان شوق

○

ہوتے تو راستے تو ہیں مسدود ہر جگہ — ہم ڈھونڈ لیں گے منزلِ مقصود ہر جگہ

کوشش بہت کی فاصلے کم ہو نہیں سکے — اک بات بیچ میں رہی موجود ہر جگہ

کوئی کسی سے ٹوٹ کے ملتا نہیں کبھی — دنیا میں اب خلوص ہے مفقود ہر جگہ

سر پر ہمارے موت کے شعلوں کا رقص ہے — قدموں تلے بچھی ہوئی بارود ہر جگہ

دیکھیں جو اپنی ذات سے اونچی بلندیاں
ہیں ایسے لوگ آج بھی محدود ہر جگہ

نعمان شوق

شفق ظاہری

○

کیا بگاڑے گی اب صبا میرا — چاند پر ہے نشانِ پا میرا
میں ہوا کے خلاف چلتا تھا — پتیوں نے لیا پتہ میرا
میرے زینے سمیٹنے والو — اور پھیلے گا دائرہ میرا
گھٹتے جاتے ہیں راہ کے سائے — بڑھتا جاتا ہے حوصلہ میرا
دیکھ لیتا ہوں روز لوحِ ضمیر — میرے اندر ہے آئینہ میرا

○

جنوں نواز سفر کا خیال کیوں آیا — کسی کی راہگذر کا خیال کیوں آیا
سجے تھے جب کہ لٹیروں سے کوچۂ بازار — ہر ایک کو مرے گھر کا خیال کیوں آیا
نہ جانے کون اپاہج بنا رہا ہے مجھے — سفر میں ترکِ سفر کا خیال کیوں آیا
جنوں کو تیری ضرورت کا کیوں ہوا احساس — سفر گزار کو گھر کا خیال کیوں آیا
دوائے جگر ہاتھ آ گئی تھی شفق — مگر کسی کی نظر کا خیال کیوں آیا

○

ہوا کی جسارتِ میزان دیکھنے نکلا — وہ شمعِ خانۂ ویران دیکھنے نکلا
سکوتِ مرگ ہوا جب ہر اک پہ طاری — وہ لاج دل کے بیابان دیکھنے نکلا
زجاجِ قریۂ کہسار میں کہاں ممکن — وہ کافروں میں مسلمان دیکھنے نکلا
تمام شہر پہ ردِ عمل ہوا کہ نہیں — وہ اپنی جدتِ فرمان دیکھنے نکلا
سجا کے اپنے خد و خال پہ نیا چہرہ — وہ اپنے دور کا انسان دیکھنے نکلا
شبِ سیہ [illegible] تو اک نئے [illegible] — طلوعِ چاکِ گریباں [illegible]

صابر فخرالدین ○

خوابوں کی تعبیریں تھیں
کچھ دھندلی تصویریں تھیں

شعر تھے نغمے درد کی آنچ
جذبوں کی تفسیریں تھیں

تھے وہ کتنے اچھے لوگ
ماتھے پر تقدیریں تھیں

پاؤں میں گھر سے آنگن تک
لاج بھری زنجیریں تھیں

میری ہر خاموشی کی
روشن سی تصویریں تھیں

کاٹ تو لفظوں کی صابر
دو دھاری شمشیریں تھیں

○

سڑک خموش دیئے سوچ میں، نگر سونا
اداس شب میں تری یاد کا سفر سونا

نہ ہو کوئی تو وہی ایک ساتھ رہتا ہے
وہ کر گیا ہے مرے گھر کو جان کر سونا

ہجوم شہر کی تنہائی پیس ڈالے گی
چلو رہیں کہیں اک گاؤں ڈھونڈ کر سونا

بھرے ہیں صحن بھی اور میں تنہا
مکان شور سے بازار اور گھر سونا

بس ایک گھر کے دریچے جو بند ہیں اختر
لگے ہیں میری نگاہوں کو شہر بھر سونا

سعید احمد اختر

○

○ اصغر راز ناصحی

عذاب کتنا ثواب کتنا — رکھے گا کوئی حساب کتنا
رخوں پہ ڈالے نقاب کتنا — ہے آدمی بے [illegible] کتنا
فقط بس اک خطا کی خاطر — چکایا دل نے حساب کتنا
آنکھیں، گلاب چہرہ — یہ آدمی ہے خراب کتنا

انتظار

محمود عالم

اذان کی آواز سن کر محمود کی آنکھ کھل گئی۔ رات سوتے وقت اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ فجر کی نماز مسجد میں جاکر ادا کرے گا۔ کئی دنوں فجر میں اسے غیر حاضر دیکھ کر مولوی صاحب نے کیسا مذاق کیا تھا۔ جی بھی مولوی جی بھی کیسے آدمی ہیں۔ اس نے چاہا کہ وہ بیل گائے کی ناپاکی کا بہانہ کر دے لیکن جھوٹ اس کے گلے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

محمود کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ چار ہفتے پہلے وہ رخصتی کرا کر لایا تھا۔ گرمی کی رات ایک تو ایسے ہی چھوٹی ہوتی ہے لیکن محمود کو ایسا لگتا جیسے پلک جھپکتے ہی سویرا ہو گیا ہو۔ اذان کی آواز اس کے کانوں میں ضرور جاتی تھی لیکن اس طرح جیسے وہ کوئی لوری ہو۔ صبح ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میں نیند کا خمار ٹوٹنے نہ ٹوٹتا تھا اور کوشش کے باوجود جماعت کی نماز چھوٹ جاتی۔ رات سوتے وقت اس نے اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔

"دیکھ رخسانہ مجھے اذان سنتے ہی جگا دینا۔"

لیکن رخسانہ تو خود ہی گہری نیند سو رہی تھی۔ اسکی آنکھ تو اس وقت کھلتی جب محمود ہل بیل لیکر کھیت پر جانے کیلئے تیار ہو رہا ہوتا۔

فجر کی نماز پڑھ کر جب وہ مسجد سے لوٹا تو اس وقت بھی رخسانہ گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ اس کا بھی جی چاہا کہ وہ دوبارہ سو جائے لیکن اس کے دونوں بیل اس کے منتظر تھے۔ وہ ناند میں منہ ڈالے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ محمود کو اپنے بیلوں سے بڑا پیار تھا اکثر تنہائی میں ان سے اس طرح باتیں کرتا جیسے وہ جانور نہ ہوں انسان ہوں۔

"چل میرے یار اب کام پر چلیں"

اس نے بیلوں کے بدن پر مالش کرتے ہوئے کہا۔ محمود کبھی کبھی اپنے بیلوں کو گانے بھی سنایا کرتا تھا۔ چل چل میرے ساتھی پتہ نہیں وہ دونوں اس کا مفہوم کیا سمجھتے تھے لیکن ان کی سنجیدگی بتاتی تھی جیسے وہ محمود کے جذبات کو سمجھتے ہیں۔

رخسانہ کو پلنگ پر پڑا دیکھ کر محمود کو چڑھ بھی ہوئی۔ خوش حال ماں باپ کی بیٹی ہے نا سویرے اٹھنے کی عادت نہیں۔ نہ جانے کب اٹھے گی اور کب چولہا سلگائے گی۔ اس نے رخسانہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھانا چاہا۔

"میرا بدن دکھ رہا ہے" وہ منائی

محمود بدن دکھنے کے معنی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ کہیں اسے بخار تو نہیں آگیا۔ کھاتے پیتے گھر کی بیٹی ہے کبھی کچھ کیا ہوا نہیں اور یہاں سب کچھ خود کرنا پڑتا ہے۔ اس نے اس کی پیشانی چھو کر دیکھا لیکن وہاں بخار کی کوئی علامت نہ تھی۔

"[illegible] بدن دبا دوں" اس نے بدن دبانا چاہا۔

"نہ بابا مجھے اپنی ہڈی نہیں تڑوانی، تمہارا ہاتھ تو لوہا ہے لوہا۔"

ممدو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ہاتھ لوہے کے کس طرح ہوتے۔ اس نے کندھے پر ہل رکھا بیلوں کی جوڑی کھولا اور کھیت جوتنے کیلئے روانہ ہوگیا۔ ممدو کا جی چاہا کہ ایک بیڑی پیئے۔

لیکن اس کا ہاتھ ہل سنبھالے ہوئے تھا اور ایک میں بیلوں کی ڈوری تھی۔ وہ اپنی اس معمولی سی خواہش کو پورا نہ کر سکا۔

پرندے اپنے اپنے گھونسلوں سے نکل کر فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ چرواہے اپنے جانوروں کو لیکر چراگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ ممدو کو اس سہانے منظر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو ایک ہی فکر تھی کہ اس سال اسے فی ایکڑ سب سے زیادہ دھان پیدا کر کے اول انعام لینا ہے۔ اس کے پاس مشکل سے دو چار مربعے ہوں گے لیکن ممدو اپنی محنت سے اس میں سونا اگانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ سونے اور دھان کے بھاؤ میں کیا فرق ہے اور ہندوستان کا کسان سال بھر محنت کر کے جو غلہ پیدا کرتا ہے جاپان کے الیکٹرونکس مشین تیار کرنے والے مزدور کے ایک دن کی محنت کے برابر ہے۔ ممدو کو معاشیات کے کسی اصول سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ تو صرف محنت کرنا جانتا تھا اور اس کی ساری دلچسپی دھان اپجانے میں تھی۔ اسکے ساتھی کسان تمباکو کی کھیتی سے سینکڑوں روپیے کما رہے تھے لیکن ممدو کہا کرتا۔

"تمباکو تو شوق کی چیز ہے۔ تمباکو سے پیٹ بھر جاتا ہے کیا؟ اگر سبھی کسان تمباکو اگانے لگیں تو پکے چاول اور گیہوں کہاں سے کھائیں گے؟"

ممدو کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ ماں باپ بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ رشتہ کی ایک خالہ تھی جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ دو سال پہلے وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ دودھ بھات اور شکر قند کھا کر ممدو جوان ہوا تھا اور اسے یہ چیزیں بے حد پسند تھیں۔

ہل جوتتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ اس سال دھان بیچ کر سب سے پہلے وہ مہاجن کا قرض ادا کرے گا جو اس نے شادی کے موقع پر لیا تھا۔ اس سے کچھ پیسے بچا کر وہ شہر جائے گا۔ ممدو نے شہر کی ایک دکان میں چاندی کا ایک جھمکا دیکھا تھا۔ رخسانہ کے پاس ویسے تو بہت سے زیورات تھے۔ ناک کی نتھ، گلے کا ہار، کان کے پھول، مانگ کا ٹیکہ لیکن ان کے پاس جھمکا نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ چاندی کا خوبصورت جھمکا ضرور خریدے گا۔ جھمکے کے ساتھ سرخ ساڑی میں وہ کتنی اچھی لگے گی اور وہ سوچنے لگا کہ دھان کی قیمت اگر اس سال بڑھ گئی تو وہ بنارسی ساڑی ضرور خریدے گا۔ جھمکے اور بنارسی ساڑی میں رخسانہ کیسی لگے گی اس تصور سے وہ سرشار ہو گیا اور بیلوں کو تیز تیز ہانکنے لگا۔ جانور جو اس کے اندرونی خیالات سے قطعی ناواقف تھے اپنی معمولی رفتار سے چل رہے تھے لیکن ممدو کو شاید بہت جلدی تھی۔ اس نے بیلوں کی پیٹھ پر آہستہ آہستہ دو چار ڈنڈے لگائے۔

"چل چل میرے ساتھی۔"

سورج آہستہ آہستہ بلندی پر چڑھ رہا تھا۔ اس کی تمازت اب بڑھ گئی تھی۔ محمود کے چہرے پر تھکن کے آثار اور پسینے کے قطرات ابھر آئے تھے پھر بھی وہ اپنے کام میں مشغول تھا۔ ایک نئے امنگ کے ساتھ، خوابوں کی دنیا میں کھویا ہوا وہ مسلسل ہل چلائے جا رہا تھا۔ صبح سویرے وہ کچھ کھائے پیئے بغیر گھر سے نکلا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں اس کی بھوک پیاس اور بڑھ گئی تھی اس نے پگڈنڈی پر نگاہ دوڑائی۔ رخسانہ کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ بیل تھک گئے تھے اب ڈنڈے مارنے پر بھی آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اس نے انہیں چمکارا، پیار کیا اور منہ میں لگی جالیاں کھول دیں۔ سامنے باغ سے باجرے کے پتے توڑ لایا اور ان کے سامنے رکھ دیئے۔

سورج اب کافی اوپر آ چکا تھا۔ اس نے پگڈنڈی کی طرف نگاہ دوڑائی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ بھوک اور پیاس کی شدت اور سورج کی تمازت نے اس کے غصے کو ہوا دینا شروع کر دیا۔

"نہ جانے کہاں رہ گئی۔ پڑی سو رہی ہوگی اب تک"

اس نے غصے میں دو چار مرتبہ زمین پر ڈنڈے برسائے۔

"آنے دو آج اسی سے خبر لوں گا" اس کا ہم کلامی سے اس کے دونوں بیل ہی محظوظ ہوئے ہوں گے۔ ان کے لئے تک یہ بھی کوئی گانا تھا شاید۔

ذہنی دباؤ کم کرنے کیلئے اس نے بیڑی سلگائی۔ بیڑی کے کش لیتے ہوئے اسے مولوی جی کی بات یاد آئی۔

"عورت پسلی کا ٹیڑھا ہے۔ عورت ٹیڑھی پسلی سے بنائی گئی ہے۔ اس میں کچھ نہ کچھ ٹیڑھ رہے گی ہی۔ اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو توڑ دوگے"

اس نے لاکھ کوشش کی تھی کہ رخسانہ منہ اندھیرے اٹھ جایا کرے لیکن اس کی دیر سے اٹھنے کی عادت جاتی ہی نہیں تھی۔ تمباکو کے دو چار کش لینے کے بعد اس کا غصہ کچھ کم ہوا۔ اس ڈنڈے سے مارنا ٹھیک نہیں کہیں ہڈی ٹوٹ گئی تو...... اس کام کے لیے کھجور کی پتلی چھڑی ٹھیک رہے گی۔

چوٹ بھی لگتی ہے اور......؟

اسے اپنے بچپن کا تجربہ یاد آیا جب ماسٹر صاحب اس کی ہتھیلی پر مار مار کر دس کی گنتی گنتے تھے دونوں بیل پتے چبانے میں مشغول تھے۔ انہیں محمود کے داخلی احساسات کا ذرا بھی علم ہوتا تو شاید اچھلنے میں اسے بھی شریک کرنے کی کوشش کرتے۔

دور گاؤں کی پگڈنڈی پر لال چنری لہراتی نظر آئی۔ ایک حسینہ کی مست خرامی کا یہ دل آویز منظر محمود کو ایسا اچھا لگا کہ اس کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ رخسانہ اس کا ناشتہ لیکر آ رہی تھی ناز و نعمت میں پلی بڑھی یہ لڑکی اس کے لیے کس قدر مشقت اٹھاتی ہے۔ دور کنوئیں سے پانی لانا، دھان کوٹنا اور آٹا پیسنا کتنی محنت کا کام ہے۔ محمود نے کتنی بار [illegible] کچھ وہ دکھ دے۔ شہر جاکر وہ مل سے آٹا پسوا لائے گا لیکن وہ تو ایک نہیں مانتی۔ کہا کرتی۔ مل والے کیا

صفت میں آٹا پیستے ہیں۔ محمود کو اس پر بے انتہا پیار آیا۔

سر پہ چھوٹی ٹوکری میں روٹی، سالن اور پیاز سب کچھ سلیقہ سے رکھا تھا۔ محمود نے آگے بڑھ کر رخسانہ کے سر سے ٹوکری اتار لی۔

"ارے رخسانہ اتنی دیر کیوں ہوئی" اس نے بڑے پیار سے پوچھا، کہاں سے اٹھالاتے ہو گیلی لکڑیاں! دھوئیں سے آنکھیں سرخ ہو گئیں۔"

محمود کچھ نہ کہہ سکا۔ بس مسکرا کر رہ گیا۔ آم کے پیڑ کے نیچے اس نے اپنا تولیہ بچھایا۔ رخسانہ اپنے ساتھ بالٹی میں پانی بھی لائی تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانے کیلئے بیٹھ گیا۔ رخسانہ پنکھا جھلنے لگی۔

اس نے روٹی اور سالن سے پہلا لقمہ بنایا اور بڑے پیار سے رخسانہ کے منہ کی طرف بڑھا دیا محمود کے ہاتھ سے کھاتے ہوئے رخسانہ شرما سی گئی،

سورج آسمان میں آب و تاب سے چمک رہا تھا۔۔

غزل

مسعود جاوید ہاشمی

دل اُن کے اِلتفاتِ نظر سے جو مس میں ہے
مستی و فورِ شوق کی اک ایک نس میں ہے

ہوتا ہے گر خلاف زمانہ ہوا کرے
دامانِ یار اب بھی مرے دسترس میں ہے

بھونرے بتائیں تتلیاں کچھ تجزیہ کریں
کتنی مٹھاس آج کے پھولوں کے رس میں ہے

جم غفیر اُن سے محبت کا مدعی
وارفتگی کی بات تو دو چار دس میں ہے

اہلِ جنوں تو دشت و دمن میں بھی تیز گام
رہبر کی پوچھئے ہو ابھی پیش و پس میں ہے

محدود حریت ہوئی جس کو بھی نصیب
دنیا تمام قید ہے عالم قفس میں ہے

جاوید ہو شعور کی بالیدگی اگر
قوموں کا اقتصاد تمہارے ہی بس میں ہے

انتخاب

حور انجم (عمر کھیڑ)

میں امی کی پریشانی کو سمجھ رہا تھا۔ بیچاری پریشان کیوں نہ ہوتیں۔ آخر میں نے شادی کے مسئلے کو مسئلہ کشمیر جو بنا دیا تھا۔ امی اور ابو دونوں آزاد خیال ہیں اس لیئے اس مسئلے کے حل کرنے کی تمام تر ذمہ داری مجھ پہ ہی عائد کر چکے ہیں ان کا خیال ہیکہ زندگی کا سفر مجھے طے کرنا ہے اس لیے شریک سفر کا انتخاب بھی میری مرضی کے مطابق ہی ہونا چاہیئے امی اپنے رشتہ داروں اور شناساؤں سے پچاس تصویریں حاصل کر چکی تھیں۔ لیکن ان کے سعادت مند بیٹے نے کسی ایک تصویر کو بھی کبھی دلچسپی سے نہ دیکھا۔ میں نے انھیں یقین دلایا تھا کہ انشاء اللہ عنقریب میں آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دونگا۔ ایک دن امی چند تصاویر اور خطوط لیئے میرے پاس آئیں۔ تصاویر ہمیشہ کی طرح بڑی خوبصورت تھیں لیکن میں کیکروں کہ میرے لیے ان میں کوئی کشش نہ تھی۔ امی نے تصاویر کے بعد کچھ خطوط میرے حوالے کر دیا ہے۔ خطوط کچھ تو تعریفی تھے کہ جن میں لڑکیوں کی سلیقہ مندی اور امور خانہ داری میں مہارت اور خوبصورت پہ بڑے متاثر کن انداز میں قصیدے لکھے گئے تھے اور کچھ خطوط تو ایسے تھے جن میں تاجرانہ ذہنیت کام کر رہی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ لڑکے کو کار کے علاوہ نقد اور نقد کے ساتھ اسقدر سامان دیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ میں ان تمام مرحلوں سے سرسری گزر گیا۔ ایک آخری خط میرے ہاتھ میں تھا۔ جسے پڑھنے کے بعد امی نے بادل نخواستہ میری طرف بڑھا دیا تھا۔ اور غالباً اس وقت امی کا انداز بھی کچھ تمسخرانہ تھا۔ لیکن جب میں بڑے انہماک سے خط کو پڑھنے لگا تو امی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ خط کا مضمون سادہ اور مختصر تھا لکھا تھا،

"بہن! اپنی دور افتادہ سہیلی کو تم نے یاد کیا اس کا بہت بہت شکریہ۔ تمہاری امیدوں اور تصور کے خلاف ہی میری زندگی بسر ہو رہی ہے، نہایت کسمپرسی کا عالم ہے۔ شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں اکثر بیمار رہتی ہوں بچی جوان ہو چکی ہے۔ تم نے اس کی تصویر کے لیے لکھا ہے۔ لیکن افسوس میرے پاس بچی کی کوئی تصویر نہیں ہے اور تصویر بھی کس امید پہ روانہ کروں۔ ایک مفلس گھرانے میں اور وہ بھی پوسٹ گریجویٹ لڑکے کے متعلق میں کس طرح سوچ سکتی ہوں میرے پاس بچی کے کردار اور تعلیم کے علاوہ کیا ہے جو بڑے بڑے خواب دیکھوں۔ بہن تم ایک بڑے کام کے لیئے نکلی ہو میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھو۔ خدا حافظ۔"

تمہاری سہیلی
"سلمیٰ"

خط کا ایک ایک لفظ کو میں بغور دیکھ رہا تھا۔ اس میں کیا نہ تھا۔ سادگی، سچائی، خلوص سبھی کچھ تھا اس مختصر خط میں [illegible] کو دیکھ کر امی نے سکوت توڑا۔ بیٹے بتاؤ نا آئی تمہیں کوئی تصویر پسند؟"

امی خدا کا شکر ہے کہ آپ میرے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ ۔پھر کچھ دیر بعد خاموش رہ کر بڑی جرأت فخر اور سعادت مندی سے میں نے کہا۔

"لیجئے میرا فیصلہ۔" اور میں نے امی کی ہتھیلی سلمیٰ صاحبہ کا خط ان کے آگے بڑھا دیا۔

"آپ انھیں جواب دے دیں۔ میں خوشی سے شادی کیلئے تیار ہوں۔"

غزلیں

تنویر واحدی، نظام آباد

ماضی زار پر کر دیکھ سمجھ کر یارو
جس میں چارہ گروں کے ہیں ستمگر یارو

زندگانی کے اندھیرے وقت اُبھر گئے یارو
ہم جانے کیسے بھٹکتے رہے در در یارو

ساحلِ سالکت بھی پل بھر میں مچل جائیگی
پھینک کر دیکھ لو تالاب میں کنکر یارو

کھیل تبسم کی ردا اور لٹکی ہے تم نے
کوئی سمجھے گا نہیں درد کے اندر یارو

ایک پیکر بھی تیا جس سے تراشا نہ گیا
مجھ کو کہنے پھرتے ہیں وہ آذر یارو

میری رسوائی میں کیا ان کی نہیں رسوائی
میرا چرچا نہ کرو شہر میں گھر گھر یارو

رائے کو اپنی مسلط نہیں کرتا تنویر
وہ سمجھتا ہے ہر اک شخص کو بہتر یارو

جمیل نظام آبادی۔

ستارے ساتھ ہیں میں شہرِ ماہتاب میں ہوں
جگائے مجھ کو نہ کوئی میں گہرے خواب میں ہوں

مرا ہی ذکر تھا ہر شخص کی زباں پہ کبھی
نہ جانے بات ہے کیا اب کتاب میں ہوں

ترس نہ کھائے میرے حالِ زندگی پہ کوئی
کہ میرا درد ہی کتنا میں کس حساب میں ہوں

لگاؤ مجھ پہ نہ الزام خود فراموشی
نہ مست بادہ ہوں نہ نشۂ شباب میں ہوں

کسی کی بزم میں مت ڈھونڈیئے جمیل مجھے
میں ایک درد کی صورت دلِ خراب میں ہوں

عبقری

ڈاکٹر سہیل احمد زبیری

صاحبو!

اس ذات شریف سے میری ملاقات ایک بڑے مذہبی جلسہ میں ہوئی۔ کوچۂ دعو ریلیف پنڈال سامعین سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ملت کے ایک محترم عالم تقریر فرما رہے تھے۔ مجمع ہمہ تن گوش تھا۔ مقرر کی آواز کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی لیکن میرے بالکل قریب سے "سبحان اللہ" "سچ فرما رہے ہیں" کی ہلکی سی آواز ابھر رہی تھی میں نے کنکھیوں سے دیکھا ایک صاحب تقریباً میری ہی عمر کے چشم نم کے ساتھ تقریر سن رہے تھے۔ عالم وجد میں یہ آوازیں انہیں کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ ان کی اس کیفیت سے میں بے حد متاثر ہوا۔ تقریر کے ختم پر میں نے اپنا تعارف کرایا۔ جواب میں انہوں نے گردن کو ذرا جھکاتے ہوئے انکسار کے ساتھ کہا "حقیر کو کبیر کہتے ہیں، بے رس کا رہنے والا ہوں" اس کے بعد مجھے اتنا یاد ہے کہ ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے اور میں مسحور تھا۔ ہوش جب آیا جب چائے خانے کے ملازم لڑکے نے سوال کیا "کیا لاؤں صاحب" میں نے کہا "دو چائے" ہم چائے خانے کے شامیانے میں بیٹھے تھے۔ کبیر صاحب فرما رہے تھے "تقریر کیا تھی جیسے گہرا خاموش دریا یکساں بہہ رہا ہو۔ پہاڑی ندی کی طرح اچھل کود نہیں۔ الفاظ انتہائی مناسب اور سیدھے دل میں اترتے ہوئے۔" "لیکن کیا آپ نے کبھی احرار پارٹی کے رہنما عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سنی تھی" میں نے کہا۔ میں نے تو صرف اپنے بزرگوں سے نام سنا ہے" کہنے لگے "ارے صاحب کیا شخصیت تھی پہلے میرے محلے میں چاندنی کوٹھے تھے وہیں حافظ کیا اور پھر پہلے مقرر ہوئے کہ بارہ بارہ گھنٹے تقریر کرتے تھے اور مجمع ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔ باہر پولیس والے وارنٹ لئے بیٹھے رہتے تھے۔ فجر کی اذان سے کچھ پہلے جب سب اونگھنے لگتے۔ میں نے اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا تخت کے نیچے سے ہو کر یہ جا وہ جا" میں نے ایک نگاہ ان کے چہرے پر ڈالی۔ چکنی سیاہ داڑھی یعنی کہ انہوں نے عطاء اللہ شاہ بخاری کا بچپن، نوجوانی اور جوانی سب دیکھی ہے۔ کبیر صاحب پورے اعتماد سے بول رہے تھے۔ "ایک بزرگ تھے مولانا آزاد سبحانی۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس زمانے میں یورپ گھوم کر آئے تھے۔ انگریزی بولتے تھے خوب تقریر کرتے تھے۔ کربلا کے بیٹو تھے میرے مکان پر ٹھہرے تھے۔ آم کھاتے وقت جو میٹھا ہوتا چکھ کر الگ رکھتے جاتے جب تہبند خراب ہو جاتی غسل خانے میں بدل کر آجاتے۔ میں پوچھتا "مولانا کیا رکھے ہوئے آم کھائیں گے؟" تیوری چڑھا کر کہتے "اور میں نے رکھے کیوں ہیں" چائے [illegible] ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ لڑکا ابھی تک چائے لے کر نہیں آیا تھا۔ کبیر صاحب نے ذرا گردن لمبی کر کے لڑکے کو ڈھونڈ [illegible] کہا "کمبخت چھوکرے کیا کر رہا ہے جلدی سے چائے کے ساتھ چار ابلے انڈے اور چار مکھن لگے۔"

[illegible] زبیری کی زیر طبع کتاب "صاحبو" کا ایک باب۔

بیٹ لے آئے" اور مجھے مخاطب کر کے پھر شروع ہو گئے "میں زندگی بھر حسرت موہانی کا حامی رہا۔ مولانا نے اس وقت جیل کی چکی جب رام بانس کوٹا جاتا تھا۔ اس کی ذرا سی چھینٹ اگر جسم پر پڑ جاتی تو چھالے پڑ جاتے۔ وہ شعر تو آپ نے سنا ہی ہوگا ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی ایک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

اسد صاحب اگر آپ اس وقت ہوتے تو دیکھتے حسرت کانگریس کے کھلے اجلاس میں پہلی بار مکمل آزادی کا ریزولیشن پیش کر رہے تھے۔ میں نے خود دیکھا سارے بڑے بڑے رہنما تھر تھر کانپ رہے تھے لیکن وہ شخص پہاڑ کی طرح کھڑا تھا خود آپ کے الہ آباد میں مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں حسرت نے جناح صاحب کو کھری کھری سنائی کوئی چوں نہ کر سکا۔ میں اس وقت مولانا کے پہلو میں کھڑا تھا۔ حسرت نے بی اے شادی کے بعد کیا تھا۔ امتحان دیتے وقت پاندان اور بیوی کو علیگڑھ لے گئے تھے۔ انہوں نے اپنے ابتدائی عشق کا حال اپنی اس غزل میں لکھا ہے ؎

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے

مجھ سے مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔

وہ جلسہ تین روز رہا۔ کبیر صاحب برابر چائے خانے میں علم میں اضافہ کرتے رہے۔ ابتدائی آرڈر دو چائے کا ہوتا تھا بعد کا اضافہ ان کا۔ بل ظاہر ہے یہ منتقد ادا کرتا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں معلوم ہوا کہ اپنی بچی کی موت پر ان کا یہ شعر ؎

تیری صحت مجھے منظور رہتی لیکن اسکو نہیں منظور تو پھر گلہ کو بھی منظور نہیں

جیل خانے سے اسمگل کر کے کبیر صاحب ہی لائے تھے۔ جناح گاندھی ملاقات کے وقت وہ بھی قریب ہی موجود تھے مولانا آزاد نے جب ایک احرار رہنما سے کہا تھا کہ پہلے حکومت برطانیہ ہٹاؤ پھر حکومت الٰہیہ قائم کر دو تو ہمارے کبیر صاحب مولانا کی کرسی کے پائے سے لگے بیٹھے تھے۔

کبیر صاحب سے رخصت ہوتے وقت میں نے کہا سعد دنیا کا سیر [illegible] صحبت میں میر کی۔ منکسر آواز سے بولے کہاں میر کہاں یہ فقیر۔ لیکن دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر زباں والی بات جب میر نے فرمائی تھی تو میں ... کہتے کہتے جانے کیوں چپ ہو گئے۔

صاحبو!

اس معلوماتی ملاقات کے تقریباً چھ ماہ بعد میں ایک صبح اپنے برآمدے میں بیٹھا صبح کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اچانک کبیر صاحب دونوں ہاتھ ہلاتے مسکراتے [illegible] زور دار معانقہ کے بعد کہنے لگے [illegible] ... الاٹمنٹ میں چار لاکھ کی جائداد کا مقدمہ ہے کل [illegible] پہلے سوچا کسی معقول [illegible] ... [illegible] کہاں احباب ہے تو آپ ہی کے [illegible] معقول [illegible]

اگر آپ کے یہاں نہیں ٹھہرا تو آپ برا مانیں گے۔ میں نے کہا "بے شک" بے شک' میرے ساتھ ساتھ وہ باہری کمرے میں داخل ہوگئے۔ جب میں اندر مہمان کے آنے کی اطلاع دینے جانے لگا تو بآواز بلند بولے۔" بیگم سے میرا سلام کہہ دیجئے اور کہیے کہ کسی تکلف کی ضرورت نہیں چائے کے ساتھ دو چار پراٹھے تھوڑا حلوہ بس" تھوڑی دیر میں کبیر صاحب غسل خانہ میں چلے گئے پھر جب میری صاف تہبند اور اپنی میلی بنیائن میں نمودار ہوئے تو ٹھنڈک کی شکایت کی اور زوردار آواز میں کہا "اگر زحمت نہ ہو تو چار چھ انڈے بھی ابال لیجئے گا" اس مختصر ناشتہ کے بعد کبیر صاحب وکیل کے یہاں چلے گئے اور رات اس وقت لوٹے جب میں مطلب سے واپس ہوا۔ دستر خوان پر زم چپاتی سے لیکر گرم کباب تک کی جی بھر تعریف کرتے رہے اور کھانے کے خاتمے پر ایک زوردار الحمد للہ، پھر مسکرا کر کہنے لگے "ایک مغلیہ تھا اس نے دیکھا ایک آدمی نے دال سے روٹی کھا کر الحمد للہ کہا وہ بگڑ گیا اور کہا کہ احمق غلے سے غلہ کھا کر شکریہ ادا کرتا ہے۔ اسی لئے گوشت نصیب نہیں ہوتا" سہیل صاحب کھانا ہی ایسا تھا کہ میں نے اس قدر زور سے الحمد للہ کہا ورنہ میں راجہ محمود آباد اور نظام حیدرآباد کے دستر خوان پر کھانا کھا چکا ہوں کبھی دل سے ایسی آواز نہیں نکلی۔ بیگم سے میرا شکریہ کہہ دیجئے اور کہئے کہ اگر زحمت نہ ہو تو کل یہ بدنصیب آپ کے ہاتھوں کی بریانی بھی چکھ لیتا" یہ سب کچھ اتنے زور زور سے کہا گیا تھا کہ میری پیغامبری کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

یہ سلسلہ تقریباً پندرہ دن تک چلتا رہا۔ صبح ناشتے کے مینو کا اعلان غسل کے بعد انڈوں کا اضافہ۔ رات دستر خوان پر کھانوں کی تعریف اور آنے والی شب کے لئے فرمائش۔ لیکن میرے ہاتھوں کے طوطے اس وقت اڑ گئے جب ایک صبح بیگم نے چپکے سے سارے راشن کے ہوا ہوجانے کی خبر دی۔ اس رات میں نے کبیر صاحب سے دریافت کیا کہ بھئی مقدمے کا کیا ہوا۔ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے "آپ نے اکبر الہ آبادی کا شعر تو سنا ہوگا۔

پیدا ہوئے وکیل تو ابلیس نے کہا لو آج میں بھی صاحب اولاد ہو گیا

کمبخت میرے وکیل نے کچھ کیا ہی نہیں۔ آج میں نے اس سے سارے کاغذات لے لئے۔ اب میں اپنا کیس خود فیڈ کروں گا۔" میں نے کہا "کیا آپ وکیل ہیں؟" اکبر کا شعر شاید اس وقت ان کے ذہن سے نکل گیا۔ کہنے لگے میرا ایک لڑکا ہے اس کورٹ میں وکالت کرتا ہے۔ اس طرح میں ایک چھوٹے وکیل کا باپ ہوں اور بڑے بڑے وکلا کی صحبت میں رہ چکا ہوں۔ آپ کے ہی شہر کے سر تیج بہادر سپرو جب سوئیزرلینڈ علاج کے لئے گئے تو میں کے ہمراہ تھا تو وہاں ہسپتال کا ایک ڈاکٹر حال پوچھنے لگا۔ سر تیج شروع سے اپنی کیس ہسٹری بتانے لگے۔ ڈاکٹر بار بار [illegible] تھا۔ آپ اپنی موجودہ تکلیف بتائیے۔ آخر سر تیج جھلا گئے اور کہا کہ "میری موجودہ تکلیف ہے کہ [illegible] بات کر رہا ہوں" بے رس کورٹ میں ایک بزرگ وکیل تھے۔ کرامت علی ان کا مقدمہ [illegible] موکل نے درخواست کی کہ میرے وکیل صاحب دوسرے اجلاس پر بحث کر رہے ہیں

دو با اک جائے لیکن جج نہیں مانا مجبوراً کرامت علی کے جونیئر نے بحث شروع کی۔ تھوڑی دیر میں وکیل صاحب آگئے۔ جج نے کہا کہ وکیل صاحب آپ کا جونیئر قانون سے کچھ بھی واقف نہیں کرامت علی نے جھٹ کہا "حضور بالکل احمق ہے" "کتنی بار سمجھایا کہ وکالت تیرے بس کی نہیں ہے۔ مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جا منصف ہو جائے گا مگر بے وقوف نہیں مانتا"۔ کبیر صاحب سر سلیمان۔ محمد علی جناح، راس مسعود سے اپنے تعلقات اور دلچسپ واقعات بیان کرتے رہے لیکن مجھے نیند آگئی۔

تین چار روز بعد جب میں نے ذرا کھردرے انداز میں مقدمے کے بابت دریافت کیا تو کبیر صاحب منہ لٹکا کر بولے "کیا کروں خودداری زبان کھولنے نہیں دیتی" "ایک روز میں بے رس میں اپنی ساری والی دکان پر بیٹھا تھا۔ دیکھا کہ ایک صاحب شیروانی پہنے ترکی ٹوپی لگائے ٹہل رہے ہیں۔ جب ایک گھنٹہ ہو گیا تو میں نے انہیں بلایا معلوم ہوا کہ مسافر ہیں جیب کٹ گئی ہے۔ دوسرے جیب میں جو رقم تھی وہ حیدرآباد کے ٹکٹ کی قیمت سے چار آنے کم تھی خودداری کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے روک رہی تھی یہی معاملہ اس وقت میرے ساتھ درپیش ہے۔ مقدمے کی تاریخ تو پہلے ہی دن لگ گئی تھی۔ میں صرف ایک دن کے لئے آیا تھا اب نہ تو ٹکٹ کے لئے پیسے ہیں اور نہ تو کپڑے ہی اس قابل ہیں کہ بے رس میں داخل ہوں" میں فوراً اندر گیا اور گھر کے سارے افراد کا ایمرجنسی میٹنگ طلب کیا۔ حساب لگانے پر پتہ چلا کہ روز کی مہمان داری سے بے رس کا ٹکٹ اور ایک جوڑا کپڑا سستا ہے۔ اس طرح کبیر صاحب رخصت ہوئے۔

ایک عرصہ گزر گیا۔ کبیر صاحب میرے ذہن سے نکل گئے تھے کہ ایک دن اچانک تیزی سے میرے مطلب میں داخل ہوئے اور جیپ کے پیچھے بہت سے ناپسندیدہ افراد۔ کبیر صاحب ہانپتے ہوئے بولے "دیکھو یہ لوگ زبردستی میرے پیچھے پڑے ہیں" مجمع میں سے ایک شخص بولا "بے رس سے یہ میرے نوجوان لڑکے کو بھگا لائے ہیں اس کے ساتھ کثیر رقم ہے بڑی مشکل سے یہ ملے ہیں تو لڑکے کا پتہ نہیں بتاتے" میں جب کبیر صاحب کی طرف مخاطب ہوا تو اطمینان سے وکیلانہ انداز میں بولے "ڈاکٹر صاحب لڑکا بالغ ہے" میں نے کہا بھئی یہ لڑکی کے اغوا کی بات نہیں ہے لڑکے اور اس کے ساتھ رقم کا مسئلہ ہے۔ لڑکا کہاں ہے بتا کیوں نہیں دیتے" کہنے لگے "اگر لڑکے کا پتہ بتا بھی دوں تو پھر یہ پیسوں کا پتہ پوچھیں گے۔ لڑکے کا باپ جو بہت پریشان نظر آ رہا تھا بولا "صاحب ہمارا لڑکا مل جائے پیسے گئے ایسی تیسی"۔ اس معاہدے کے بعد وہ لڑکے کا پتہ بتانے بھیڑ کے ساتھ چلے گئے اب روز رات کو مطب میں آ جاتے۔ چائے بسکٹ کے بدلے میں دلچسپ گفتگو کچھ گھاٹے کا سودا نہ تھا کہ ایک شب جب کبیر صاحب رخصت ہو گئے تو بیٹا کمپاؤنڈر مریضوں والے اسٹول پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کیا بات ہے کہنے لگا "آپ جانتے ہیں میں ہوٹل میں کھانا کھاتا ہوں آپ کے یہ دوست میرے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی چلانے لگا کہاں سے

حاضر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ دن سے میرے حساب میں ان کا کھانا چل رہا ہے۔ میں غریب آدمی بھلا کہاں سے ادا کروں گا۔ دوسرے روز جب وہ تشریف لائے تو میں نے انہیں سخت سست کہا۔ جس پر وہ بظاہر ناراض ہو کر چلے گئے

صاحبو!

میرے اس بیان کے (جو میں آپ کے سامنے دے رہا ہوں) صرف پندرہ دن قبل کبیر صاحب ہشاش بشاش پھر تشریف لائے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ لڑکے کے سسرال میں ٹھہرے ہیں اور دوسرے لڑکے کے لئے لڑکی کی تلاش ہے جو بی۔ اے پاس ہے اور جس کے نام دس لاکھ کا ایک بنگلہ ہے۔ میں نے ان کے اس قیمتی چارے کو صاف نظر انداز کر دیا۔ پھر وہ اپنے مخصوص موضوع پر آگئے۔ شاہ ولی اللہؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ کے بارے میں چشم دید واقعات بیان کرتے رہے۔ رات ہو گئی تھی۔ میں دواخانہ بند کرنے لگا لیکن وہ جاری رہے اس خاندان کا پٹنہ عظیم آباد سے تعلق بتاتے رہے پھر سہیل عظیم آبادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگے سہیل عظیم آبادی شیعوں کے سخت خلاف تھے ان کا ایک شعر ہے۔ سو

تاکہ تمام دن تیرا گزرے بہ خیر و عافیت   صبح کو ناشتے سے قبل صورت رافضی نہ دیکھ

اس وقت تک میں سڑک پر آگیا تھا۔ قریب ہوتے ہوئے بولے "میں جس جگہ مقیم ہوں چاروں طرف شیعہ رہتے ہیں کہاں تک عمل بسر کروں یقین جانئے صبح سے کھانا نہیں نصیب ہوا" میں نے کہا "صبح ہی آپ نے رافضی کا صورت دیکھی تھی رات کا دس بج رہا ہے اور آپ ایک زیدی کے سامنے کھڑے ہیں اس لئے کھانے کا کوئی سوال نہیں ہے" "آپ تو میرے بھائی ہیں، آپ تو میرے بھائی ہیں" کہتے ہوئے بے تحاشہ لپٹ گئے۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے کو ان سے الگ کیا لیکن ہاتھ انہوں نے نہیں چھوڑا اور ساتھ ساتھ رکشے پر بیٹھ گئے کھانا کھانے کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا "کبیر صاحب زندگی میں اس تضاد کو آپ کیسے سنبھالتے ہیں" گمبھیر آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے "سہیل صاحب عبقری اور تضاد لازم و ملزوم ہیں وہ عبقری نہیں جس کے اندر تضاد نہیں"

رفیع احمد
(مالیگاؤں)

کھٹمل (انشائیہ)

سے موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اگر مرزا غالب اپنے بستر اور چارپائی کا مشاہدہ کر لیتے تو انہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوتا۔ لیکن غالباً غالب مدہوشی کے عالم میں تھے اس لئے ان کی رسائی کھٹملوں تک نہ ہو سکی۔ ویسے بھی غالب ہی کا کیا ذکر رستم کا چچا ہو یا دارا کا دادا، ہلاکو کا ماموں ہو یا ہٹلر کا بیٹا مگر کھٹملوں نے کسی کو نہیں بخشا یہاں اونچی دوکان اور پھیکا پکوان والی بات ہی نہیں۔ بلکہ ضرب المثل ہے "چھوٹی دوکان بڑا پکوان" کھٹمل جتنا چھوٹا ہوتا ہے اتنا ہی تیز کاٹتا ہے۔

کھٹمل نے انسانی خون کے ساتھ کچھ انسانی خرابیاں بھی جذب کر لی ہیں۔ وہ ہمارے مکان میں رہتا ہے، ہمارے بستر پر چہل قدمی کرتا ہے۔ چادروں اور تکیے کے غلافوں میں پناہ لیتا ہے۔ الماریوں میں آرام کرتا ہے لیکن کرایہ ادا نہیں کرتا۔ کھٹمل اور ہمارے کرایہ داروں میں دو باتیں مشترک ہیں۔ دونوں کرایہ ادا نہیں کرتے اور دونوں مالک مکان کا خون چوستے ہیں۔ کرایہ دار مکان کو اس طرح اپنی جاگیر سمجھتا ہے جس طرح آج اسرائیل فلسطین کو سمجھ رہا ہے۔

کھٹمل اور کرایہ دار میں ایک نمایاں فرق بھی ہے۔ کرایہ دار کو ہم وکیل معرفت نوٹس دے سکتے ہیں لیکن کھٹمل کو ہم نوٹس نہیں دے سکتے۔ اس کرایہ دار کے آگے تو سپریم کورٹ کے جج اور وکلاء نے بھی سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

آرم اسٹرانگ جوں ہی چاند پر پہنچے ساری دنیا ان کے گن گانے لگی۔ سائنسداں بھی اس کامیابی پر بغلیں بجانے لگے ان کی تعریف تو ہم اس وقت کرتے جب وہ دنیا سے کھٹملوں کا نام و نشان مٹا دیتے۔ مہینوں کا توشہ غذا کھانا آرام دہ راکٹ پر سوار ہوتا۔ سائنسدانوں کی ایک جماعت ان کی رہنمائی کے لئے حاضر، اس طرح کیل کانٹوں سے لیس ہو کر چاند پر پہنچنا کوئی کمال کی بات نہیں۔ کمال کی بات تو تب ہوتی جب وہ کسی انڈین چارپائی پر رات گزارتے۔ رات بھر کھٹملوں سے آنکھ مچولی کھیلتے۔ کوکا کولا کی طرح اپنا خون انہیں پلاتے۔ سائنسدانوں سے ہماری مودبانہ گزارش ہے کہ وہ انسانوں کے خاتمے کی مہم ترک کر کے کھٹملوں کے خاتمے کی مہم شروع کریں۔ "کھٹمل گزیدہ" لوگ یقیناً انہیں دعا سے نوازیں گے اگر کسی سائنسداں نے ایسی دوا ایجاد کر لی جس سے کھٹمل کی نسل ہی دنیا سے ختم ہو جائے تو سائنس کے علاوہ تاریخ میں بھی اس کا نام سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ اور اسے نوبل پرائز عطا کیا جائے گا۔

ہمارے سماج میں کھٹمل بھی پائے جاتے ہیں اور کھٹمل نما انسان بھی۔ کھٹمل نما انسانوں کی آبادی میں مسلسل ہنگامی اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ کھٹمل گوریلا جنگ لڑتا ہے وہ خاموشی سے آتا ہے۔ حملہ کرتا ہے اور [illegible]

ہو جاتا ہے۔ کھٹمل نما انسان نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں ان کے ہاتھ میں جلتی مشعلیں اور ہتھیار ہوتے ہیں۔ وہ گھر جلاتے ہیں۔ انسانی خون چوستے ہیں اور فرار ہو جاتے ہیں ادھر کچھ عرصہ سے ایک نئے ٹائپ کے کھٹمل نما انسان منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ان کی پسندیدہ سواری موٹر سائیکل ہے۔ وہ موٹر سائیکل پر سوار ہوا کے جھونکے کی طرح آتے ہیں خون چوستے ہیں اور گدھے کا سینگ کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد پبلک حیران اور پولیس پریشان رہ جاتی ہے

"نسلِ کھٹملی" ہم سے ناراض نہ ہو۔ ہم نے ان پر قلم اٹھایا ہے تو ان کے ساتھ پورا انصاف کریں گے ان کی ذات سے ہونے والے فائدے بھی رقم کریں گے

اسی ذاتِ شریف کی وجہ سے بہت سے انسان اپنی روٹی کپڑے اور مکان کا انتظام کرتے ہیں۔ "بگ مار" کمپنی ہو یا "ٹک ٹو ڈی" ([illegible])، جتنا کھٹمل پاؤڈر والے ہوں یا کھٹمل مار جتنا سب ہی کھٹملوں کے احسانمند ہیں۔ "بگ مار" نے تو کتنے ہی لوگوں کو غمِ دوراں اور غمِ جاناں دونوں سے نجات دلا دی۔

کھٹملوں نے ہم کو مرنا ہی نہیں جینا بھی سکھایا ہے۔ ان کے اور ہمارے طرزِ رہائش میں کتنی یکسانیت ہے۔ میز کی دراز ہو یا ستون کا شگاف، بستر کی چادر ہو یا تکیے کا غلاف، جہاں ذرا سی بھی جگہ پائی وہیں کے ہو رہے ہم کو بھی مکان بڑا ملے یا چھوٹا، ذاتی ہو یا کرایہ کا، جھونپڑا یا جھونپڑی، غرض جہاں بھی سر چھپانے کی جگہ مل جائے رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بغیر چھت کا مکان ٹی فٹ پاتھ [illegible] لئے ہم تیار ہیں۔ ذرا سی جگہ میں بیس پچیس افراد کا کنبہ کھٹملوں کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ کھٹملوں نے کبھی رہائش کے مسئلے پر حکومت کو پریشان نہیں کیا۔ کبھی ہاؤزنگ کالونی کی مانگ نہیں کی کبھی بھوک ہڑتال کا سہارا نہیں لیا جبکہ ہم یہ سب کر گزرتے ہیں۔

کھٹمل ہمیں متحرک رکھتا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔ کھٹمل کی وجہ سے ہاتھ دائیں بائیں اوپر نیچے مصروف رہتے ہیں۔ حرکت ہی کا دوسرا نام عمل ہے اور منطق شاعرِ مشرق نے کہا ہے

"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"

جس مکان میں کھٹمل ہوتے ہیں وہاں چوری یا ڈکیتی کا ڈر نہیں ہوتا کیونکہ مکین رات بھر "کھٹمل شماری" میں مصروف رہتے ہیں اگر کسی دلیر چور نے کوشش بھی کی تو اسے کھٹملوں کی طرح مسل دیا جاتا ہے۔ گویا اس طرح کھٹمل ہمارے مال و اسباب کا محافظ بھی ہے۔

اس ننھی مخلوق کی وجہ سے ہم جیسے گنہ گاروں کو بھی صبح سویرے خدا کے حضور حاضر ہونے کا موقع مل جاتا ہے ہمیں اس بات کا مشاہدہ بھی ہو جاتا ہے کہ واقعی سورج مشرق سے نکلتا ہے۔

الغرض کھٹمل کو آپ حقیر نہ سمجھئے۔ علامہ اقبال فرما گئے ہیں ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

•••.—★—..••

صہبائے آبگینہ گداز

-۱-

ساحل کے سکون و عافیت سے نکال کر سمندر کے منجدھار میں پھینک دیا گیا ہوں۔ وہی خواب تصور والی ٹوٹی ہوئی کشتی میرے حوالے کی گئی ہے جس کا تختہ تختہ الگ اور جس کا بادبان تار تار ہے۔ سب سے بڑا مادی سہارا جس سے مدد کی توقع تھی اقبالؒ کا سہارا تھا سو وہ بھی یہاں قدم رکھتے ہی چھین لیا گیا (رَحِمَهُ اللّٰه وطَابَ ثَرَاهُ) خود اپنی طاقت کو دیکھتا ہوں تو وہ بمنزلہ صفر ہے۔ دو چار ساتھی جو ملے ہیں ان کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھ سے بھی زیادہ خستہ و ماندہ ہیں اور وہی ہر طرف وہ حال نظر آتا ہے جس کو دیکھ کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا۔

رَبَّنَآ اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ [1]

اب سوائے خدا کے اور کوئی سہارا نہیں۔ سب مادی سہارے جھوٹے اور ناقابل اعتماد ہیں، وہی اصلی اور حقیقی سہارا ہے۔ وہی طاقت کا منبع ہے وہی اسباب کا مالک اور مسبب ہے اور وہی حامی و ناصر ہے۔

عَلَی اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۙ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ [2]

(اشارات، ترجمان القرآن محرم ۱۳۵۷ھ)
(بمطابق مارچ، اپریل ۱۹۳۸ء)

-۲-

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ [3] کسی کے لئے تو ادعائی چیز ہوگی مگر میرے لئے یہ برسوں کی آزمائی ہوئی، پرکھی ہوئی اور جانچی ہوئی حقیقت ہے۔ میں تو اس کو یوں جانتا ہوں جیسے کوئی آنکھوں دیکھی چیز کو جانتا ہے۔ جیسا گمان میں نے اول روز سے اپنے رب کے ساتھ قائم کیا تھا قربان اس ذات پاک کے کہ ویسا ہی اس کو پایا اور برابر پائے جا رہا ہوں، ایک لمحہ کیلئے بھی اس نے مجھے اپنی خوشنودی کے سوا کسی کی خوشنودی کا طالب نہ بننے دیا۔ اپنے غضب کے سوا کسی کے غضب سے خوفزدہ

---

[1] ترجمہ از مرتب: "اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب! کیا اس لئے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟" (یونس - ۸۸)

[2] ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمیں ظالم لوگوں کیلئے فتنہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے (یونس ۸۵)

[3] یہ حدیث قدسی کے الفاظ ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی ہوں جیسا گمان وہ مجھ سے رکھتا ہے، میں اسکے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں

ہونے دیا اور اپنے در کے سوا کسی در کی طرف نظرِ احتیاج سے دیکھنے تک کا موقع نہ آنے دیا۔ اس نے پوچھا تھا:
اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ـــ "کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی ؟" میں نے سچے دل سے اقرار کیا تھا ــ "ہاں تو ہی میرے لئے کافی ہے" ـــ اور وہ حقیقت میں میرے لئے کافی ہو گیا، ایسا کافی ہوا کہ میرے اقرار کی لاج رکھنا بھی اس نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اس کی کفایت اور کمال درجے کی کفایت کو حیدرآباد کی گوشہ نشینی میں بھی دیکھ چکا ہوں اور پنجاب کی اس خانہ بدوشانہ زندگی میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پھر کیوں نہ میرا دل اس کے لئے شکر و احسان مندی کے جذبے سے لبریز ہو جائے؟ اور کیوں میں اپنے رب سے بدگمانی کروں کہ اس کو چھوڑ کر دوسروں کی خوشنودی کا طالب بن جاؤں

(اشارات، "ترجمان القرآن" محرم ۱۳۵۸ھ

۱ بمطابق فروری مارچ ۱۹۳۹ء)

یہ تمنائیں دل میں پال رہا ہوں اور چھ برس سے اپنے جسم کی ساری طاقتیں انہیں حاصل کرنے کے لئے خرچ کر رہا ہوں۔ مگر بدقسمتی سے اکیلا اور تنہا ہوں۔ میری طاقت محدود ہے، وسائل مفقود ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں کر سکتا۔ ساتھ دینے والوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں مگر وہ کمیاب ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کی اس بستی میں اپنے آپ کو اجنبی اور غریب پاتا ہوں۔ جس جنون میں مبتلا ہوں اس کا مجنون مجھے کہیں نہیں ملتا۔ برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچا رہا ہوں ان کے بھی جب قریب جاتا ہوں تو وہ مجھ سے دور نظر آتے ہیں۔ ان کی دھن میری دھن سے الگ، ان کی روح میری روح سے ناآشنا۔ ان کے کان میری زبان سے بیگانہ، یہ دنیا کوئی اور دنیا ہے جس سے میری فطرت مانوس نہیں۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور جن نظریات، جن جذبات، جن اغراض و مقاصد اور جن اصولوں کی بنا پر ہو رہا ہے۔ ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے پر میں مجبور ہوں۔ میں اس کے اجزا میں سے بعض کا باغی اور بعض کا حامی نہیں ہوں بلکہ کل کا باغی ہوں۔ میں ترمیم کا خواہشمند نہیں ہوں بلکہ موجودہ زندگی کی پوری عمارت کو توڑ ڈالنا چاہتا ہوں۔ اور اس کی جگہ خالص اسلامی اصولوں پر دوسری عمارت بنانے کا خواہاں ہوں۔ اس کلی و ہمہ گیر بغاوت میں کوئی مجھے اپنا ساتھی نہیں ملتا۔ ہر طرف مجھے جزوی باغی ہی ملتے ہیں جو اس بت خانے کے کسی نہ کسی بت سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔ ہر ایک کا مطالبہ یہ ہے کہ سب بتوں کو توڑ دو مگر میرے بت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھنا۔ ایسی حالت میں ناگزیر ہے کہ جزئی باغی کسی نہ کسی مرحلے پر پہنچ کر مجھ سے جدا ہو جائیں۔ میرا ساتھ صرف کلی باغی ہی دے سکتے ہیں اور وہ کمیاب ہیں۔ جب تک وہ نہ ملیں اپنے محدود وسائل اور اپنی محدود طاقت سے محدود پیمانے پر میں تنہا جو کچھ کر سکتا ہوں وہی کرتا رہوں گا
بعض اوقات اس صورتِ حالات کو دیکھ کر میری بشری کمزوریاں دل توڑنے لگتی ہیں، مگر جب وہ آواز میرے کانوں میں آتی ہے جس سے دنیا کے سب سے بڑے مسلمان نے اپنے غار کے رفیق کی ڈھارس بندھائی تھی تو میرے دل کی [illegible] پھر بھڑک اٹھتی ہے۔ "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" ـ (ترجمان القرآن، ۱۳۵۸ھ، فروری مارچ ۱۹۳۹ء)

تبصرے

"گردِ سفر - بہ یک نظر"

سید محمد عبدالقدیر عزم

شعر جذبات و احساسات کا ذریعہ اظہار ہوتے ہیں۔ چاہے جذبات و احساسات واردات قلبی کا نتیجہ ہوں یا پھر اپنے ماحول کا تاثر قبول کرنے کا۔ ایسے شعر جو خارجی تاثر کا نتیجہ ہوں حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنا تاثر کھو دیتے ہیں۔ وہی قاری ان سے متاثر ہو سکتا ہے جو ان حالات سے بخوبی واقف ہو جن کے تحت یہ شعر کہے گئے تھے۔ لیکن داخلی تاثرات کے اظہار میں جو شعر کہے جاتے ہیں ہر حساس اور دردمند دل کے انسان کو متاثر کرتے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ "گردِ سفر" جناب مغنی صاحب کا مجموعۂ کلام ہے ایک ایسا ہی مجموعہ ہے جس کے چند ایک اشعار کے سوا تمام تر شعر ایک داخلی کیفیت کا نتیجہ ہیں اور اس لئے ہر قاری کیلئے پُرکشش ہیں۔ میرے اس خیال کی تصدیق خود مغنی صاحب کے ان اشعار سے ہوتی ہے۔

- پہنایا ہے الفاظ کا ملبوس غموں کو
اور لوگ سمجھتے ہیں غزل میں نے کہی ہے

- حالات کے اور وقت کے پیمانے میں جانچو
جذبات کو تم فن کی ترازو میں نہ تولو

- گزری ہے جو دل پہ وہ بیاں کرتے ہیں ہم ورنہ
ہمارا علم و فن کتنا ہماری شاعری کتنی

اس اشعار کی مزید تائید اس مجموعے کے مرتب جناب محبوب نظام آبادی کے حرفِ آغاز کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ جناب مغنی صدیقی نے اپنے کلام کا زیادہ تر حصہ خود تلف کر دیا تھا۔ وہ اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت چاہتے ہی نہ تھے یقیناً ایک خوددار شخص اپنے ذاتی غم کو ہرگز ظاہر کرنا نہ چاہے گا پھر ایک ایسا خوددار شخص جیسے کہ جناب مغنی صدیقی تھے جو ضبط دل کی ساکھ برقرار رکھنے کیلئے اپنے دامن کو آنسوؤں سے تر کرنے سے بھی احتراز کرتے تھے جو اپنے چاک گریباں کو اس خوف سے رفو کر لیتے تھے کہ کہیں رازِ جنوں افشاں نہ ہو جائے۔ جو جی جان سے محبت تو کرتے تھے لیکن جن کے پاس اپنے محبوب کا اتنا پاس تھا کہ وہ مجنوں کی طرح گریباں چاک نہ کرتے تھے ؎

- ساکھ کیا رہے باقی ضبطِ دل کی دنیا میں
ہم جو اپنے دامن کو آنسوؤں سے تر کر لیں

- رفو کرتا ہوں مغنی اس لئے چاک گریباں کو
کہیں رازِ جنوں افشاں نہ ہو چاکِ گریباں سے

- جی جان سے ہم تم سے محبت تو کریں گے
مجنوں کی طرح چاک گریباں نہیں ہونگے

وہ اپنی اس خودداری اور ضبط کی گواہی گردشِ دوراں سے بھی دلواتے ہیں ؎

— تو ساتھ ہے برسوں سے ترا گردشِ دوراں
کیا میرے لبوں پر کبھی فریاد رہی ہے

اور گردشِ دوراں ہی نہیں ان کو قریب سے جاننے والے جن میں یہ راقم الحروف بھی شامل ہے اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ جناب مغنی صدیقی نے کبھی غم یار نہیں کی۔ اپنی زندگی اور حالات پر تبسم کے دبیز پردے ڈالے رہے حالانکہ یہ تبسم بھی حد سے بڑھے ہوئے غم کا نتیجہ تھا ؎

— میرے ہونٹوں کے تبسم کو نہ دیکھو لوگو
غم جو بڑھتے ہیں تبسم میں بدل جاتے ہیں

وہ صرف اور صرف اپنی تسکین کے لئے شعر کہتے تھے۔ شعر ان کے اپنے الم دور کرنے کا ذریعہ تھے اور شاید اسی لئے وہ ان کی تشہیر ناپسند کرتے تھے ؎

دو گھونٹ پی لئے تو سکوں مل گیا ہمیں
کچھ شعر کہہ لئے تو الم دور ہو گئے

ان کی اپنی زندگی کی محرومی اور تشنگی ان کے اکثر شعروں سے جھلکتی ہے ؎

— شراب ہو یا زہر جو بھی ہو پلا دیجئے
قسم خدا کی بڑی تشنگی لگی ہے مجھے

— اتنا پیاسا ہوں کہ جلتا بھی ہے دیکھو یارو
تم سمجھتے ہو کہ آیا ہوں میں پی کر یارو

پی رہا ہوں پیاس کے مارے میں اپنا خونِ دل
وہ سمجھتے ہیں مئے گلرنگ پیمانے میں ہے

یہ جام ہو مئے ہی نہیں میکدہ بھی میرا ہے
یہ اور بات ہے مغنی کہ میں بھی پیاسا ہوں

— نہیں رہتا کوئی محروم جب ساقی کے فیضان سے
تو میں کیوں تشنہ لب آتا ہوں اٹھ کر بزمِ رنداں سے

— اب کیا بتاؤں آپ کو انجام شوق کا
دریا کے پاس رہ کے بھی پیاسا رہا ہوں میں

— شراب غم سے بجھاتے ہیں تشنگی اپنی
ہمارے دل میں کہاں خواہشِ سبو ہوگی

— خشک ہونٹوں پہ مرے طنز نہ کرتا کوئی
وہ بھی میری طرح برسوں سے جو پیاسا ہوتا

اس تشنگی کے باوجود ان کا ساقی پر اعتماد قابلِ ملاحظہ ہے ؎

تشنہ لب نہ لوٹیں گے یہ یقین ہے ہم کو
مئے اگر نہیں ہوگی زہر وہ پلا دیں گے

ان کی خودداری ساقی کو دستے ہوئے زہر کو بھی پی لینے پر آمادہ رہتی ہے ؎

— یہ درس سکھایا ہے مجھے میری خودی نے
دے زہر بھی کوئی جو محبت سے تو پی لو

لیکن جب انہیں ساقی سے۔ میکدے سے کچھ بھی نہیں ملتا تب بھی ان کا ظرف ان کو میکدے کو رسوا کرنے سے روکتا ہے ؎

— میکدے کی نیک نامی کیلئے مغنی ہمیں
تشنہ لب رہتے ہوئے بھی لڑکھڑانا چاہیے

گردِ سفر کی تمام تر شاعری داخلی شاعری ہے اور یہ دراصل "گردِ سفر" نہیں بلکہ جناب مغنی صدیقی کی "پیاس کا سفر" ہے کہیں کہیں خارجی تاثر بھی ملتا ہے لیکن یہ بھی اپنے جلو میں داخلی پہلو لئے ہوئے ہے جیسے ؎

— پھیکے گلستاں سے اٹھ رہے ہیں کیوں شعلے
آج کیا کسی کا پھر آشیانہ جلتا ہے

— جس طرح پھول آپ نے توڑے ہیں شاخ سے
کانٹوں کو توڑنے کی جسارت تو کیجئے

— چاند پر تم کو پہونچنا ہو مبارک لیکن
بزم گیتی بھی سجاؤ تو کوئی بات بنے

— کب یہ رات ڈوبے گی کب چھٹے گی تاریکی
صبح کے بھروسے پر شمع تو بجھا دی ہے

مختصر یہ کہ گرد سفر کی شاعری ہر دردمند دل خصوصاً ٹوٹے ہوئے دلوں کو ہمیشہ متاثر کرتی رہے گی۔

کچھ اشعار فن، زبان و بیان کے اعتبار سے قابل گرفت بھی ملیں جیسے ؎

— تم سے خلوص مہر و وفا مانگتا ہوں میں
یا رب قصور معاف دیوانہ ہوا ہوں میں

کا مصرع ثانی۔ صفحہ ۶۱ کی غزل کے ایک شعر میں لفظ "پچپانا" کا استعمال کھٹکتا ہے۔ لیکن جب جذبات کو فن کی ترازو میں نہ تولنے کی بات آجائے تو ان سے صرف نظر کر لینا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ ہاں بعض اشعار کاتب کی مہربانی سے ایک ایک لفظ کے غلط لکھ جانے کی بنا پر مہمل ہو گئے ہیں اور مرتب کی بھی یہ کوتاہی ہے کہ طباعت سے قبل انہوں نے مسودہ پر نظر ثانی نہیں کی جیسے صفحہ ۳۶ "پہنایا ہے الفاظ کا ملبوس حسیں غزلوں کو" میں "کو" کی جگہ "کو" اور "کو" کی جگہ "کو" لکھا گیا ہے صفحہ ۳۹ مصرع "کہیں راز جنوں افشا نہ ہو چاک گریباں سے" میں لفظ "افشا" تبدیل کر "افشاں" ہو گیا ہے۔ صفحہ ۵۵ پر مصرع "ہم اہل حساس کے ہم ترجمان بن جائینگے" میں لفظ "حساس" "احساس" لکھا گیا ہے۔

مصرع "نہیں رہتا کوئی محروم جب ساقی کے فیضان سے" میں فیضان کے ن میں نقطہ دینے سے قافیہ غلط ہو گیا ہے صفحہ ۹۶ پر مصرعہ "جسم نازک پر تمہارے نہیں ہلکی سی شراب" میں شاید لفظ "خراش" ہوگا جو "شراب" بن گیا۔ صفحہ ۱۰۳ کی غزل کے مقطع کے مصرع ثانی میں لفظ "گے" بصورت "جانے" سے مصرع بے وزن ہو گیا ہے۔ ان چند معمولی خامیوں کے سوائے مجموعہ کی کتابت و طباعت اچھی ہے۔ ڈسٹ کور سادہ لیکن پرکار ہے۔ اہل دل سے اس کتاب کو پڑھنے کی پرزور سفارش کی جا سکتی ہے۔ کتاب کی قیمت دس روپے ہے اور دائرہ ادب عقب کیچڑ پیالس نظام آباد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

صفحہ ۵۶ سے آگے

علی احمد گمبھروی صاحب، قطب الدین مونس صاحب دہلوی، شہاب الدین صاحب ہمراز، مرشد صدیقی بنگلوری اور پروانہ ... کارروائی کے دوران ادارہ ادب اسلامی ہند کے جنرل سکریٹری جناب انتظار نعیم نے ادارہ کا مختصر تعارف کرایا۔

ادب و تہذیب کے گہواروں کا سفر

سفر کا تصور ہی مختلف مراحل اور خطرات سے لبریز ہوتا ہے اس لئے جب بھی بہار اور اتر پردیش کے سفر کی بات آئی کئی وقتی دشواریوں نے قدم روک لئے اس مرتبہ ابوالفہم وحید علی خان صاحب کے تقاضوں نے شدت اختیار کر لی۔ پھر دہلی میں ہم خیال مدیرانِ جرائد کی نشست کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ ارادہ ہوا کہ ان دونوں ہی مقاصد کو پروگرام میں شامل کر لیا جائے چنانچہ خطوط لکھے گئے اور رخصت کی درخواست دے دی گئی۔ قطعی تاریخ طے کرنے کے لئے ڈاکٹر احمد سجاد اور دیگر احباب کو اپنے مقامات پر موجودگی کی اطلاع ضروری تھی۔ ۸/ اکتوبر کو سجاد صاحب کا خط آگیا اور ۱۶/ اکتوبر کی تاریخ طے کر کے انہیں دوسرا خط لکھ دیا گیا ۱۶/ اکتوبر کی صبح وحید صاحب ناچیز اور میں سکندرآباد سے باوڑہ ایکسپریس میں سوار ہوئے۔ لذیذ کھانوں سے لبریز ہوئے توشہ دان، شمال کی سردی کا لحاظ کر کے ضروری بستر کپڑے اور ماہنامہ فنکار اور وحید صاحب کی اردو ورک بک "۱، ۲" اور "اردو سیکھیں" کے متعدد نسخے ساتھ تھے۔

راستے میں دونوں طرف پھیلے ہوئے دھان کے ہرے بھرے کھیت، اونچی نیچی پہاڑیاں، ندیاں، نالے، گاؤں اور شہر پختہ مکانات، کچی گھاس پھوس کی کٹیاں اور کارخانوں کی بلند و بالا [illegible] چمنیاں دیکھنے کے بعد دیگر دلچسپ نظارہ [illegible] پر گفتگو ہوئی۔ ایسا تاریخی سیاسی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوا۔ سفر کے ساتھیوں سے تعارف اور باہمی دلچسپی کے معاملات پر بات چیت ہوئی اس وقت ٹرین کی رفتار سے زیادہ دوڑتا رہا۔ منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے رہے اور رات آرام سے گزار کر دوسرے دن دوپہر ۱½ بجے ہم کھڑگپور پہنچے۔ توشہ دان خالی ہو چکے تھے لہٰذا اسٹیشن کی کینٹین میں دوپہر کا لنچ لینا پڑا۔ جلد ہی ٹاٹا ایکسپریس جمشید پور کیلئے مل گئی اور ہم شام ۵ بجے وہاں اتر گئے۔ سامان کلاک روم میں رکھ کر بستی کا رخ کیا۔ بس سے ساکچی گئے جامع مسجد میں عصر اور مغرب ادا کی رات ساڑھے سات بجے ہم جناب شمیم احمد مدنی صاحب کے ہاں پہنچے اور ان کے مہمان ہوئے۔

مدنی صاحب، سماجی اور فلاحی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اپنی خدمات کے سبب بڑی اچھی شہرت رکھتے ہیں جوان اور فعال کارکن ہیں۔ باتوں سے زیادہ کام کے قائل ہیں۔ کئی مدارس کے قیام اور انتظام میں حصہ لیا ہے اور ان کے انتظامیہ سے متعلق ہیں ان کی رہنمائی میں شہر کے کئی اردو مدارس کو دیکھنے اور صدر صاحبان، مدرسین اور انتظامیہ کے ذمہ داروں سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔

یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ فسادات کے بعد کوئی پچاس ہزار مسلمانوں پر مشتمل ایک الگ بستی آباد ہو گئی ہے اور اس میں شاندار مساجد اور مدارس کا قیام عمل میں آگیا ہے۔

یہ [illegible] بڑی مسرت ہوئی کہ یہاں مسلمان نوکریوں کے خبط میں مبتلا نہیں ہیں آزاد پیشوں کو ترجیح دیتے ہیں بچے اور بچیاں بہترین اردو اسکولوں میں بڑے ذوق و شوق سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ آندھرا پردیش کے برخلاف مسلمان بچوں کے سرپرستوں میں انگریزی میڈیم یا ہندی میڈیم میں تعلیم دلوانے کا رجحان یہاں نہیں پایا جاتا۔ اور اردو مدارس کو حکومت کی طرف سے منظورہ بھی قرار دیا گیا ہے اور امداد بھی دی جاتی ہے۔ مگر رہ رہ کر اس گنگا جمنی تہذیب کی یاد آتی ہے جہاں ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کے پڑوس میں پرامن زندگی گزارتے تھے کبھی محبت کی یہ فضا مکدر نہ ہوتی تھی۔ سب ایک دوسرے کے غمخوار مونس و ہمدم تھے جمشید پور کے علاقے آزاد نگر و مانگو میں ایک ادبی نشست کا اہتمام بھی کیا گیا۔ نوجوان اور بزرگ افسانہ نگار اور شاعر شریک ہوئے اور اپنی تخلیقات سے سامعین کو محظوظ کیا۔

۲۰ اکتوبر کو بذریعہ بس رانچی پہنچے۔ تاج بکڈپو میں احباب کو منتظر پایا۔ ڈاکٹر احمد سجاد بھی وہیں تشریف لے آئے۔ پروگرام بنا کر متعدد مدرسوں میں صدور مدرسہ اور معلمین اور پھر مشاہیر قلمکاروں سے ملاقاتیں کی گئیں۔ طارق ندیم لکچرر اردو، ڈاکٹر وہاب اشرفی صدر شعبہ اردو، پروفیسر صدیقی مجیبی، ڈاکٹر الجد عثمانی اور حسن رضا لکچرر اردو سے نیاز حاصل ہوا۔ خلوص اور محبت کی فضا میں اردو اور اردو کے مسائل پر تبادلہ خیال ہوا۔ ڈورنڈہ میں نور الحسن صاحب کے دولت کدے پر ادبی نشست ہوئی جس میں پر مغز مقالے اور شاعروں کی غزلیں اور نظمیں سننے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر احمد سجاد صاحب کی پرخلوص میزبانی اور طارق ندیم صاحب کی پرلطف دعوت یاد رہے گی فنکار کی توسیع اشاعت کا سب سے بہتر کام یہیں انجام پایا۔

۲۳ اکتوبر کی صبح گیا بذریعہ ٹرین پہنچے۔ طیب عثمانی صاحب جو ادارہ ادب اسلامی کے جانے پہچانے قلمکار ہیں شرف ملاقات حاصل ہوا اور ان ہی کے مہمان ہوئے طیب صاحب اور ان کے صاحبزادے رشاد عثمانی بڑے لطف و عنایت سے پیش آئے۔ دن بھر متعدد مدارس میں اردو کے چلن کا جائزہ لیا صدور مدرسہ سے تبادلہ خیال ہوا فنکار کی توسیع اشاعت کا کام ہوا اور رات پٹنہ پہنچ گئے یہاں ڈاکٹر عبدالمغنی، عبدالمعز منظر، ابو نصر فاروقی، محمد عالم، احمد یوسف سے ملاقات ہوئی، گنگا پار حاجی پور میں ممتاز احمد خاں اور ثوبان فاروقی سے ملے۔ پٹنہ میں ایک ادبی نشست بھی منعقد ہوئی جس کی صدارت جناب ظہیر صدیقی نے کی۔ ہم ۲۶ اکتوبر کو شام الٰہ آباد آئے۔ اسی رات ڈاکٹر سہیل زیدی کے دولت کدے پر مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا شہر کے متعدد اہل علم سے نیاز حاصل ہوا دوسرے دن پریاگ دیکھا جمنا کا سنگم دیکھا۔ اصغر فنی صاحب کی دعوت میں شریک ہوئے خسرو باغ اور اکبر الٰہ آبادی کا مکان جو اب ایک مدرسہ میں تبدیل ہو چکا ہے دیکھا اور ۲۹ اکتوبر کی صبح دہلی پہنچے۔ ۲۹ اور ۳۰ کو ہندوستان بھر کے اسلامی فکر کے حامل متعدد زبانوں میں نکلنے والے جرائد کے مدیران کی نشستیں ہوئیں۔ باہمی تعاون کی راہوں پر غور ہوا اور تجویزیں مرتب کی گئیں۔ رات مشاعرہ ہوا جس میں حفیظ میرٹھی، وقار مانوی، مائل خیرآبادی، عزیز بگھروی اور دیگر شعرا کو سننے کا موقع ملا [illegible] ۳۱ اکتوبر کو علی گڑھ روانگی ہوئی مسلم یونیورسٹی [illegible] جامع مسجد آزاد لائبریری اور متعدد [illegible] رات ایک مشاعرہ میں شرکت کی [illegible]

قافلۂ تیز گام

جمشید پور

ادارہ ادب اسلامی (ہند)

جمشید پور کی جانب سے حیدرآباد سے تشریف لائے ہوئے شاعر ماہنامہ "فنکار" کے مدیر جناب مسعود جاوید ہاشمی کے اعزاز میں مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۶ء کی شب کو جماعت اسلامی (ہند) آزاد نگر کے دفتر میں ایک ادبی نشست کا انعقاد ہوا جس میں شہر کے شعراء و افسانہ نگار شریک ہوئے۔ یہ خوشی کی بات رہی کہ سامعین کی معتدبہ تعداد نے حظ اٹھایا۔

اس نشست کی صدارت مہمان شاعر مسعود جاوید ہاشمی نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض جناب جوہر بلیاوی نے ادا کئے۔ نشست کا پہلا حصہ (شعری) رات نو بجے شروع ہوا۔ اس میں جن شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان کے نام اور نمونۂ کلام اس طرح ہیں۔

تنویر اختر رومانی :

مشینوں، قتل، فساد، نفرتیں
محبت، جنگ، دشنام زندگی
اختر، یہ خورشید، آسمان
رات سویرا، شام زندگی

جی۔ ڈی۔ احمر :

ہم اپنی دھن میں سارے زمانے سے بے نیاز
ایسے چلے کہ وقت کی رفتار ہو گئے

رضوان واسطی :

[illegible] وقت نے ترتیب بدل دی
[illegible] نگاہوں میں چلے ہم

۴ : جوہر بلیاوی

انا کی لاج بچالی مری غریبی نے
کوئی سہارا نہ ہونا بھی اک سہارا ہے

شمیم مدنی

پہلے کرتی تھیں لیڈیاں میک اپ
جس سے ہوتا تھا زیدہ بھی شیک اپ
کیا زمانہ ہے آج کرتی ہیں
لیٹ ہو کر کے گاڑیاں میک اپ

سلام نشتر

انفعال اور ہے اصرار گنہ ہے کچھ اور
کفر کچھ اور ہے کچھ اور ہے کافر ہونا

کیف پرتاب گڑھی

یہاں ہر ایک کو ہے بس غرض ترے اجالے سے
ترا سوزِ نہاں، شمع فروزاں کون دیکھے گا

مسعود جاوید ہاشمی

ہوتا ہے گر خلاف زمانہ ہوا کرے
دامانِ یار اب بھی مری دسترس میں ہے

دو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے سنائے

اسلم جمشید پوری ۔ "شکریہ"
تنویر اختر رومانی ۔ "بند مٹھی کا کرب"

آخر میں صدر محترم نے اپنی صدارتی تقریر میں ادب، سماج، فرد اور مذہب کے تعلق سے بہت سی مفید باتیں کہیں محظوظ ہی نہیں مالا مال بھی کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ادب

اور سماج کا رشتہ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ کسی سماج کو بدلنے کے لئے اس سماج کا ادب بڑا اہم رول ادا کرتا ہے ایسا سمجھنا غلط ہے کہ ادب کا رشتہ مذہب سے نہیں ہوتا دنیا کی ہر زبان میں ادب عالیہ کا بیشتر حصہ مذہبی ہے۔ بڑا ادب وہی ہے جس میں بڑا مقصد پیش کیا گیا ہے۔ اگر مقصد بڑا نہیں ہے تو ادب بڑا نہیں ہو سکتا۔ خواہ شعری ادب ہو یا افسانوی۔ بہترین افسانے، غزلیں اور نظمیں وہ ہوتی ہیں جو دل کی گہرائیوں سے لکھی جاتی ہیں اور قاری کے دل کی گہرائیوں کو چھوتی ہیں۔

صدر محترم کے ان جملوں کے ساتھ، شب پونے گیارہ بجے شکریہ پر نشست کا اختتام ہوا۔

رانچی میں ایک یادگار ادبی نشست

"زندگی کی پاکی، تغیر، حسن کی حیوانی تعبیر اور مغرب کی اندھی تقلید نے انسانی فکر و ذہن اور ادب و تخلیق کو بھی خاصا گمراہ کیا ہے۔ تہذیبی سوتوں سے کٹ کر آج ہمارے درمیان ہونے فنکاروں کی تو بہتات ہے مگر میر و غالب اور اقبال جیسے قد آور تخلیق کار منظر عام سے غائب ہیں"

ان الفاظ کے ساتھ ڈاکٹر احمد سجاد صاحب نے حیدرآباد سے آئے ہوئے دو اہم ادیب اور شاعر جناب مسعود جاوید ہاشمی صاحب مدیر ماہنامہ "فنکار" اور جناب ابوالفہیم وحید گیلانی خاں حیدرآبادی کو خوش آمدید کہا اور اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ یہ دونوں مہمان شخصیتیں اپنی تنقید و تخلیق میں تہذیبی اور اخلاقی قدروں کو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔

رحمت کالونی رانچی میں ۱۴ر اکتوبر کو ۲ بجے شام کے وقت جناب انوارالحق صاحب انجینیر کے دولت کدے پر ادارہ ادب کے زیر اہتمام حیدرآباد سے آئے مذکورہ مہمانوں کے اعزاز میں ایک یادگار ادبی نشست منعقد کی گئی جس کے نثری دور کی صدارت جناب ڈاکٹر عبدالوہاب اشرفی صاحب صدر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی رانچی نے کی اور شعری دور کی صدارت رانچی کے بزرگ شاعر مولانا مظہر الحق وارثی صاحب نے کی۔

پروفیسر ابوذر عثمانی صاحب، پروفیسر حسن رضا صاحب، حبیب اللہ صاحب ریٹائرڈ آئی اے ایس، کلیم اللہ حبیب صاحب ایڈوکیٹ ہائی کورٹ کے علاوہ شہر کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی ایک قابل لحاظ تعداد موجود تھی۔ شعرائے کرام میں ڈاکٹر صدیق مجیبی، بانکے بہاری ہمدم، قمر حمید، مجیب الرحمٰن بزمی، اختر آزاد، حسن جعفری، پرویز رحمانی، افضل الرحمٰن افضل، قمر الزماں قمر، شمس جاوید، عبدالمعبود آمر وغیرہ بھی موجود تھے جن کے تازہ دم کلام سے حاضرین محظوظ ہوئے حیدرآباد سے آئے ہوئے معزز مہمان مسعود جاوید ہاشمی صاحب نے بھی اپنی غزلیں پیش کیں، موصوف کا یہ شعر بالخصوص بہت پسند کیا گیا ؎

سیلاب رنگ و نور ہو تربیت بھی تو ہو
پودوں کے جھنڈ ہی کو چمن مت کہا کرو

اور نثری نشست میں مہمان محترم ابوالفہیم وحید گیلانی خاں نے اپنا ایک جامع مضمون بابائے اردو عبدالحق پر پیش کیا جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ نثری دور میں محمد شفیق عالم نے اپنا ایک خوبصورت افسانہ "مجرم کون" پیش کیا۔

ڈاکٹر عبدالوہاب اشرفی صاحب اور پروفیسر ابوذر عثمانی صاحب نے نہایت خیال انگیز تقریریں کیں۔ ڈاکٹر اشرفی صاحب کے خیال میں تہذیبی قدروں کی اہمیت کے باوجود مغربی اثرات کو قبول کرنا ضروری ہے کیونکہ مغربی فکر نے علم و ادب کو نئی بلندیاں عطا کی ہیں۔ جناب پروفیسر ابوذر عثمانی صاحب نے اپنی مدلل اور جامع تقریر میں اس بات کی وضاحت فرمائی کہ مغربی علوم بے شک مسلم ہیں مگر ان سے اخذ و استفادے میں ہمیں ضمیر کی پاکی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ضمیر کی پاکی کے بغیر کوئی عظیم ادب پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ادب کو بہر حال ادب کے پیرایہ ہی میں پیش ہونا چاہیے اسے خشک وعظ اور نصیحت نہ بننا چاہیے لیکن محض فیشن کے طور پر مارکسزم کی سیاست اور فرائڈ کی جنسیت ہمیں فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ ان سے متاثر ہو کر جن ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ ان کے یہاں اعلیٰ فنکاری کے ساتھ ہی ساتھ ابتذال اور گندگی بھی آگئی ہے مطالعہ کے دوران ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آخر میں پروفیسر حسن رضا صاحب کے اظہار تشکر پر یہ یادگار ادبی جلسہ ختم ہوا اور ڈاکٹر احمد سجاد نے ڈاکٹر صدیق مجیبی کی فرمائش پر آئندہ مجوزہ ادبی نشست میں "تہذیب، ثقافت اور ادب کے باہمی رشتے" پر ایک مجلس مذاکرہ کے انعقاد کا اعلان فرمایا۔

ایک خوشگوار شام

پتھر کی مسجد پٹنہ میں ۲۴ اکتوبر کو شام میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔ اس نشست میں دیگر شرکا کے علاوہ شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کے سابق صدر جناب پروفیسر سید حسن صاحب [illegible] کے [illegible] ، جناب احمد رضا صاحب شعبہ معاشیات کالج آف کامرس کے ریڈر ڈاکٹر عبدالمعز منظر صاحب، ماہنامہ رفیق کے مدیر جناب محمود عالم صاحب، مشہور شاعر ظہیر صدیقی صاحب اور جناب کیف عظیم آبادی کی قابل ذکر شخصیتیں تھیں۔ پروفیسر سید حسن صاحب کی صدارت میں مجلس گرم رہی۔ ابتدا میں ادب کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ اس کے بعد موجود شعرا نے سامعین کو اپنے کلام سے نوازا۔

سب سے پہلے مہمان شاعر مسعود جاوید ہاشمی صاحب نے اپنی غزل سنائی اور داد و تحسین وصول کی۔ اس کے بعد ظہیر صدیقی، کیف عظیم آبادی، ابوالنصر فاروقی صادم اور پروفیسر سید حسن صاحب صدر نے اپنی غزلیں پیش کیں۔

نشست کے اختتام پر اتفاق رائے سے طے پایا کہ پٹنہ میں ادارہ ادب اسلامی کی شاخ قائم کی جائے۔ اتفاق رائے سے اس کے صدر پروفیسر سید حسن صاحب کو اور سکریٹری کی حیثیت سے ظہیر صدیقی صاحب کو منتخب کیا گیا۔

ماہنامہ فنکار حیدرآباد جو ادارہ ادب اسلامی ہند کا ترجمان ہے اس کی توسیع و اشاعت کے لیے ایک مہم چلانے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ نظامت کے فرائض ابوالنصر فاروقی صادم عظیم آبادی نے ادا کیے۔ صدر مجلس کے اظہار تشکر پر مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

الٰہ آباد

۲۶ اکتوبر رات ۹ بجے ڈاکٹر اسمٰعیل احمد زیدی کے دولت کدے پر مشاعرہ منعقد ہوا۔

شعرا کے نام اور نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

فرخ جنیدی

جو سرسری اسے دیکھا تو وہ تو کچھ نہ لگا
پڑھا جو غور سے اسکو کتاب لگنے لگا

اعجاز

دل کھنچا جاتا ہے پھر کوچۂ قاتل کی طرف
پھر غم عشق کوئی زخم نیا مانگے ہے

واشک

آنکھوں میں کس نے جھونک دی محرومیوں کی دھول
دیدار کو کسی کے ترسنا پڑا مجھے

ملا حسین شرا

درحقیقت مجھے اپنا سا لگا تھا وہ بھی
شاید اندر سے بہت ٹوٹ چکا تھا وہ بھی

حسیب زبیر

بار غم کو تھکے جو کاندھوں پہ اٹھا لیتے ہیں
اپنی قسمت کی نئی راہ بنا لیتے ہیں

مسعود جاوید ہاشمی

جذبوں کی آگ فکر کی ٹھنڈک ہے جان قوم
لفظوں کے پیرہن میں تو فن حت کہا کرو

انتظار غازی پوری

کیا کیا نہ ستم آخر ایجاد نہیں کرتے
یہ ہم ہیں کہ اس پر بھی فریاد نہیں کرتے

نسیم

حسن کی سحر آفرینی چند روزہ ہے ندیم
تو نہ بن جانا ہدف اس کی نگاہِ ناز کا

ڈاکٹر طفیل

تو ایک ہے اور تیرا نہیں ہے کوئی شریک
لائی جہاں میں تیرا یہ پیغام روشنی

حمید قیصر

جلتی چٹان کو کچھ سرد کیا ہے ہم نے
دھوپ کو چھاؤں کا احساس دیا ہے ہم نے

محمود رمز

معصوم پودے کی تعمیر نشیمن کی
احسان کا بدلہ کیا اب جود و جفا مانگو

ڈاکٹر سہیل زیدی

ہمیں تو دل کو بہلانا پڑا جیلے حوالے سے
تمہیں کیسا لگا بستی کا بے صوت و صدا ہونا

ایم اے قدیر

مگر پھر زندگی بھر بندگی دنیا کی ہے ورنہ
کسے اچھا نہیں لگتا ہے تھوڑا سا خدا ہونا

شکریہ پر مشاعرہ اختتام کو پہونچا۔

دہلی میں ادب اسلامی کی شعری نشست

دہلی۔ ۱۹، اکتوبر کو مرکز جماعت اسلامی میں ادارہ ادب اسلامی ہند کی ایک شعری نشست ہوئی جس کی صدارت قیم جماعت جناب افضل حسین صاحب نے فرمائی۔ جناب حفیظ میرٹھی مہمان خصوصی تھے۔ مہمان شعرا کے علاوہ کچھ مقامی شعرا نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ تقریباً تمام شعرا کا کلام پسند کیا گیا۔ نشست کی نظامت جناب انتظار نعیم صاحب نے فرمائی۔ نشست کا آغاز حفیظ میرٹھی صاحب کی نعت رسول سے ہوا جس کے بعد شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ جناب محمد شفیع مونس صاحب، حفیظ میرٹھی صاحب، سید غلام ہمدانی صاحب، امان خیرآبادی صاحب، وقار مانوی صاحب، اظہر فردائی صاحب، عزیز بگھروی صاحب، [illegible] صاحب، محمد فاروق خاں صاحب، [illegible]

Islam for Peace, Progress and Salvation

Theme of

FIRST ALL INDIA CONFERENCE

Students Islamic Organisation of India
(S. I O)

AT BANGALORE

26, 27, 28 DECEMBER 1986

Participating Scholars includa

Moulana Abul Lais Nadvi
Chief Patron (S I O)

Khurram Murad
Ex-Director
The Islamic Foundation, Leceister (U. K)

Yusuf Aslam
Former Cat Stevens (London)

You are cordially invited in the conference

P. C. HAMZA
Chief Organiser